خردنامہ جلالپوری

علی عباس جلالپوری

پیش لفظ

آج سے کم و بیش بیس برس پہلے مجلّہ ادبی دُنیا میں میرا ایک مضمون " دنیائے اسلام میں خِرد افروزی کی ضرورت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو میری کتاب " اقبال کا علمِ کلام " کا آخری باب ہے۔

مغربی ممالک میں اٹھارویں صدی میں ENLIGHTENMENT کی تحریک برپا ہوئی تھی۔ راقم السطور نے اس کا ترجمہ تحریکِ خِرد افروزی سے کیا۔ خِرد افروزی کی یہ تحریک ہالینڈ اور فرانس سے شروع ہوئی اور تمام مغربی ممالک میں پھیل گئی۔ اس کے ترجمانوں میں بیل، دیدرو، والٹیر، کندورسے، دولباخ، دی مابلی، کباٹے، دالمبر اور مالتسکو مشہور ہوئے۔ سائنس کے فروغ کے ساتھ اہلِ علم نے محسوس کیا کہ علومِ جدیدہ کی روشنی میں ضروری ہے کہ انسانی معاشرے کی از سرِ نو تشکیل کی جائے اور تحقیقی علوم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ اس مقصد کے لئے دیدرو اور اس کے ساتھیوں نے ایک جامع قاموس العلوم مرتب کی قدرتاً اہلِ کلیسا نے اس کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا لیکن اس کی اشاعت کو نہ روک سکے۔ اہلِ فکر نے محسوس کیا کہ روحانیت، باطنیت اور نام نہاد رُوحانیت و مذہبی جُنون سے ہٹ کر سائنسی علوم کی روشنی میں معاشرۂ انسانی کو مدون کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی ممالک میں عقلیت پسندی اور خِرد افروزی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور علمِ کلام کے نام پر تقلیدِ جامد کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سائنس کے انکشافات کو ذہنی طور پر قبول

نہ کر سکے۔ دُنیائے اِسلام میں خِرد افروزی کی تحریک مامون الرشید کے زمانے میں "اعتزال" کے نام سے شروع ہوئی تھی لیکن تنگ نظر فقہاء کی مخالفت کے باعث دم توڑ گئی۔ کوتاہ بیں اور تاریک دماغ فقہاء نے معتزلہ کی کتابوں کو چُن چُن کر نذرِ آتش کیا اور ان کو مذہبی جنون کا نشانہ بنایا۔ اہلِ مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی تحریکِ احیا العلوم کا چرچا ہوا لیکن اسے علم کلام او تقلیدِ بے جا کی نذر کر دیا گیا۔ فقہا کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ عقلی علوم کو فروغ ہوا تو ان کی دین فروشی اور دکان آرائی کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ یہ صُورتِ حال آج بھی موجود ہے۔ ہر سال اسلامی ممالک میں سینکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان کے موضوعات ہر اسلامی میں نقلی علوم تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کو لا مذہبیت اور الحاد کا سرچشمہ کہہ کر انہیں رد کر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں سائنسی علوم اور جدید مکاتیبِ فلسفہ کی اشاعت کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لئے راقم نے اپنی تصانیف میں خِرد افروزی اور روشن خیالی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک عقلیت پسندی کو تحکمات کی گرفت سے آزاد نہیں کیا جاتا، دُنیائے اسلام میں سائنس کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ خِرد افروزی کی اشاعت ہی سائنسی علوم کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے۔ خِرد افروزی کے ترکیبی عناصر درجِ ذیل ہیں

(۱)۔۔۔۔ عقلیّت پسندی کی ترویج۔

(۲)۔۔۔۔ سائنس اور فلسفے کو مذہبی تحکّم سے نجات دلانے کی کوشش۔

(۳)۔۔۔۔ انقلابیت، عقلیت پسندی یا سائنسی علوم کی روشنی میں معاشرے کو از سرِ نو مُرتّب کرنے کی کوشش۔

(۴)۔۔۔۔ مذہبی منافرت اور جُنون کا انسداد۔

(۵)۔۔۔۔ انسان دوستی کا فروغ۔

ہمارے ہاں احیا العلوم کے نام پر باطنیّت، تصوّف اور نام نہاد رُوحانیت کو ہر کہیں بڑھا

چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے اور احیا کے نام پر عوام کا ذہن گدلا کیا جا رہا ہے۔ احیا کا معنیٰ ہے مُردے کو زندہ کرنا۔ جب ہمارے اصحابِ فکر مذہب کے احیا کی بات کرتے ہیں تو گویا وہ یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ مذہب مر چکا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ریاست کا SECULAR ہونا اشد ضروری ہے۔

راقم نے BAYLE کی طرح علمی و تحقیقی نُقطۂ نظر سے اس لغات کی تدوین کی ہے اس کتاب کا ایک مقصد یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن و دماغ کو روشن کیا جائے اور انہیں تنگ دلی اور تنگ نظری سے نجات دِلا کر ایسے معلومات بہم پہنچائیں جائیں جن سے قاری کی نگاہ میں وُسعت اور ذہن و قلب میں کُشادگی پیدا ہو اور وہ انفرادی اور اجتماعی مسائل کا جدید سائنس اور جدید فلسفے کی روشنی میں سامنا کر سکیں۔

علی عباس جلالپوری

یکم جولائی ۱۹۸۹ء
جہلم

ا

الف

یُونانی زبان کا الفا۔ ا بیل (کے سینگ) کی علامت تھی جو فنیقیوں نے حروفِ تہجّی مُرتّب کرتے وقت مصری ہیروغلیفی سے اخذ کی تھی۔ بعد میں یہی حروفِ تہجّی صورتیں بدل بدل کر ایشیا اور یورپ کی بڑی بڑی زبانوں عبرانی، ارامی، حبشی، عربی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت میں رواج پا گئے۔ اہلِ مصر دیوتا اوزیرس کے مُقدّس سانڈ ایپس کی پُوجا کرتے تھے جسے یونانی سیراپس کہتے تھے۔ ممفس کے شہر میں اُس کا مشہور معبد تھا۔ یہی تقدّس اُس کی علامت ا کے ساتھ بھی وابستہ ہو گیا۔ باطنّیہ کے ایک فرقے حُروفی نے ا کو وجودِ مطلق کی علامت قرار دیا کیوں کہ اُن کے خیال میں جس طرح کائنات کا صُدُور بتدریج وجودِ مطلق سے ہوا ہے اسی طرح ا سے دوسرے حروفِ تہجّی ب، پ وغیرہ نکلے ہیں۔ حُروفی الفبا کے حرُوف کو کائنات کے مختلف مظاہر کے رموز مانتے تھے۔ اس فرقے کے پیشوا فضل اللہ کو تیمور لنگ نے زندقہ کے الزام میں قتل کرا دیا تھا۔ صُوفیہ وجودّیہ نے ا کو ذاتِ مطلق اور محبوبِ ازلی کی علامت بنا دیا۔ پنجابی کے صُوفی شعرا کہتے ہیں کہ ہمیں صرف ایک وجودِ مُطلق سے غرض ہے، کثرت غیر حقیقی ہے اور بے معنی ہے۔ ا کے علاوہ ب، ت، وغیرہ جتنے حُروف ہیں وہ کثرت و تعدّد کو ظاہر کرتے ہیں جو صُوفیہ کے یہاں محض نظر کا فریب ہے۔ بلّھے شاہ ؎

مُلّاں مینوں سبق پڑھایا — الفوں اگے کجھ نہ آیا
اُوہ ب ای پ پکار دا ای — مُلّاں مینوں مار دا ای

خواجہ غُلام فرید ؎

ہِکّو الف میٹوں بر ما نوُم ڑی   تِتّی ب ت مُوں نہ بھانوُم ڑی

الف شاہی ملنگ اپنی پیشانی پر الف کا نشان بناتے ہیں اور گلے میں بغیر آستین کی الفی پہنتے ہیں۔ فارسی کے ایک شاعر ازرقی نے امیر طغان شاہ والیٔ نیشاپور کی قوّتِ رجولیت کو بحال کرنے کے لئے مثنوی الفیہ شلفیہ لکھی تھی جس میں لنگ کی علامت بن گیا ہے۔ عربی زبان میں سرو قد لڑکی کو الفیہ کہا جاتا ہے۔

آبِ حیات

آبِ حیات ، آبِ حیواں ، چشمۂ حیواں کی دیو مالائی روایت بابل سے یادگار ہے۔ سنسکرت میں آبِ حیات کو اَمرِت اور یونانی زبان میں امبروسیا کہتے ہیں۔ دونوں الفاظ کا معنیٰ ہے "غیر فانی"۔ اِنسان قدیم زمانے سے موت اور فنا پر قابو پانے کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ آبِ حیات یا امرت انہی خوابوں اور حسرتوں میں سے ایک ہے۔

اَبرِ نیساں

یہ بادل بہار کے موسم میں برستا ہے۔ کہتے ہیں کہ اِس کے قطرے سیپیوں میں جن کے مُنہ اِس موسم میں کھُل جاتے ہیں، گرتے ہیں اور موتی بن جاتے ہیں لیکن اِس روایت کی حقیقت شاعرانہ تلمیح سے زیادہ نہیں ہے۔

اِبلیس

یونانی زبان کے لفظ DIABOLOS سے نکلا ہے۔ انگریزی کا لفظ DEVIL اور فرانسیسی زبان کا DIABLE اس ترکیب کے پہلے حصّے سے اور ابلیس دوسرے حصّے سے ماخوذ ہے۔

اَبا سین

اٹک کے اوپر دریائے سندھ کو اَبا سین کہتے ہیں یعنی دریاؤں کا باپ۔ اِسے مہران اور نیلاب کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔ اِس کی پوُجا اَندرولال کے نام پر کی جاتی تھی۔ آج بھی سندھی اِسے ولی مانتے ہیں اور اِسے دریا شاہ کہتے ہیں۔

اَپیقوریّت

اپیقورس کا فلسفۂ لذتیت : وہ کہتا ہے کہ لذت کا حصول ہی خیر ہے اور یہی انسان کا مقصدِ حیات ہونا چاہیئے لیکن وہ لذات میں فرق کرتا ہے۔ اُس کے خیال میں نفسانی لذات گُریز پا ہوتی ہیں۔ اِن میں مداومت کرنے سے اِنسان اُکتاہٹ اور بے زاری کا شکار ہو جاتا ہے اس لئے دانشمند ذوقی و فکری لذاتّ کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں جو ہمیں فنونِ لطیفہ اور تدبّر و تفکّر سے میسّر آتی ہیں۔ یہ لذاتّ دیر پا ہوتی ہیں اور سادہ زندگی گذارنے سے مُیسّر آتی ہیں۔ اپیقورس کہتا ہے کہ مستقبل غیر یقینی ہے کیا معلوم آئے یا نہ آئے اِس لئے حال کو بامسرّت طریقے سے گذارنا ہی قرینِ دانش ہے۔ اپیقورس دیماقریطس کی مادیّت پسندی سے متاثر ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں ایٹموں کی حرکت جن سے اِس دنیا کی اشیا بنی ہیں آزادانہ ہے لہذا اِنسان بھی فاعلِ مختار ہے اور حصولِ مسرت پر قادر ہے۔ اِنسان کی رُوح بھی دوسری اشیا کی طرح اپنی ماہیت میں مادی ہے اور موت کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے چنانچہ وہ حیات بعد ممات کا مُنکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے جسمانی اذیت اور درد سے پہلو بچانا مناسب ہو گا۔ اُس کی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ مسرّت ذہنی سکون ہی کا دوسرا نام ہے۔

اپیقورس کے مخالفین نے اُس سے انصاف نہیں کیا جب اُنہوں نے کہا کہ وہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے جسمانی لذاتّ پر ذہنی و ذوقی آسودگی اور مسرّت کو ترجیح دی ہے۔ زندگی کے اواخر میں اپیقورس گُوناگُوں امراض میں مُبتلا ہو گیا لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ اُس نے سو کے قریب رسائل لکھے تھے جو دست بُردِ زمانہ کا شکار ہو گئے۔ اپیقورس مذہب کا مخالف تھا اور کہتا تھا کہ مذہب دہشت کی تخلیق ہے۔ اِنسان قدیم زمانے سے موت اور فنا سے خائف رہا ہے۔ اِس دہشت سے نجات پانے کے لئے اُس نے رُوح کی بقا اور حیات بعد موت کے تصورات کا سہارا لیا۔ اُس کے خیال میں موت سے ڈرنا شیوۂ خردمندی نہیں ہے کیوں کہ اُس کے الفاظ میں "جب تم ہو گے موت نہیں ہو گی، جب موت ہو گی تم نہیں ہو گے" اپنی موت کے دن اُس نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا۔

" میری موت کا یہ دن میری زندگی کا ایک بامسرت دن ہے۔ میرے معدے اور مثانے کے امراض شدت اختیار کر گئے ہیں اس کے باوجود میری تم سے جو باتیں ہوا کرتی تھیں اُن کی یاد میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔ مجھے توقع ہے کہ تم جو میرے لڑکپن کے دوست ہو اور چھوٹی عمر سے فلسفے کے شیدائی رہے ہو مٹرو ڈورس کے بچوں کا خیال رکھو گے۔"

مٹرو ڈورس اُس کا ایک عزیز شاگرد تھا جو دو ننھے بچے چھوڑ کر مر گیا تھا۔ ابیقورس نے اُن کی پرورش کی تھی۔ ابیقورس کے پیروؤں میں لاطینی شاعر لکریشیس قابلِ ذکر ہے۔ اُس نے اپنی مشہور طویل نظم میں مذہب کو انسان کے جملہ آلام و مصائب کا ذمّے دار ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ مذہب کے نام پر انسان بے دریغ ایک دوسرے کا خون بہاتا رہا ہے اور مذہبی جنون نے مدنیۂ انسانی میں صدیوں سے نفرت کا زہر گھول رکھا ہے۔

ابن رُشدیّت

ازمنۂ وُسطیٰ میں اندلس کے فلسفی ابن رُشد کے افکار مغربی ممالک میں عام طور سے شائع ہو گئے تھے۔ اُس کے مسلکِ فکر کو ابن رُشدیّت اور اُس کے پیروؤں کو ابن رُشدی کہتے تھے۔ ابن رُشد کے اِس نظریّے نے خاص طور سے اہلِ مغرب کو متاثر کیا تھا کہ صداقت دوگونہ ہے: فلسفے کی صداقت اور مذہب کی صداقت۔ ابن رُشدی صدیوں تک پیرس اور اطالیہ کی دانش گاہوں میں اِس بات کا درس دیتے رہے کہ مذہب اور فلسفے کے حقائق یکساں طور پر اہم ہیں۔ نیتجتہً فلسفے کو مذہب کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔ فرانسس بیکن نے قطعی طور پر فلسفے کو مذہب سے جُدا کر دیا اور فلسفے کا مطالعہ بحیثیت ایک مُستقل شعبۂ علم کے ہونے لگا جس سے اہلِ مغرب آزادیٔ فکر و نظر سے رُوشناس ہوئے اور سائنس کی ترقی کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ دُنیائے اِسلام میں مُلاّؤں نے صداقت کے اِس دوگونہ نظریّے کو رد کر دیا تھا اِس لئے ابن رُشد کے خیالات مشرق میں نفوذ نہ کر سکے نہ اہلِ مشرق جدید فلسفے اور جدید سائنس کے برکات سے آشنا ہو سکے۔

اپسرا

دیوتا اِندر کے بہشت کی حسین وجمیل پریاں ___ اوسنا کی پریکا ___ جو سمندر کے بلونے سے نکلی تھیں۔ اِن کے دو طائفے ہیں دیولیکا (آسمانی) اور لوکیکا (دُنیوی)۔ دیولیکا تعداد میں دس ہیں اور لوکیکا کی تعداد چونتیس ہے۔ اُپسرائیں اِندر کو رجھانے کے لئے گندھروں (آسمانی گویّے) کے سازوں کی گت پر ترغیب آور اور ہوس پرور انداز میں بھاؤ بتا بتا کر کولہے مٹکا مٹکا کر چشم و ابرو سے ذومعنی اشارے کرتی ہوئی ناچتی ہیں۔ ہندو دیو مالا کے قصّوں میں رمبھا، مینکا، پرم لوچا، اُروسی، گھرتا چی وغیرہ اُپسراؤں کا ذکر آیا ہے۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا کہ کسی رشی کے تپ جپ سے دیوتا اِندر کا سنگھاسن ڈولنے لگتا تو اِندر اُس رشی کو بہکانے کے لئے کوئی اُپسرا اُس کے پاس بھیج دیتا تھا چنانچہ اِسی مقصد کے لئے مینکا کو رشی وشوامتر کے پاس بھیجا گیا تھا رشی اُس پر فریفتہ ہوگیا۔ کالی داس کے ناٹک شکنتلا کی ہیروئین انہی کی بیٹی تھی۔ اِس کے پیدا ہوتے ہی مینکا واپس اِندر لوک چلی گئی تو پرندوں نے جوگا دے کر ننھی کو پالا جس سے اُس کا نام شکنتلا پڑ گیا کہ سنسکرت میں شکنت پرندے کو کہتے ہیں۔ بعد میں رشی کنو نے اُس کی پرورش کی جوان ہوئی تو راجہ دشینت نے اُس سے گندھرو بیاہ کر لیا۔ اُس کے بطن سے بھرت پیدا ہوا جس کے نام پر ہندوستان کا نام بھارت رکھا گیا۔

اُپنشد

اُپنشد کا معنیٰ ہے قریب بیٹھنا یا خفیہ تعلیم دینا۔ قدیم زمانے کے گورو اپنے خاص خاص چیلوں کو اپنے قریب بٹھا کر انہیں خفیہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ اُپنشدوں کی تعداد ایک سَو کے لگ بھگ ہے۔ ان میں شوتیا شوتیر، برہا دارنیاکا، کٹھ اور چھاندوگیہ مشہور ہیں۔ ان میں برہمن (آفاقی رُوح) اور آتما (انفرادی رُوح) کی ایکتا کی تعلیم دی گئی ہے یعنی دونوں اصلاً ایک ہی ہیں۔ تت ایکم (وہ ایک) حقیقی ہے، باقی جو کثرت دکھائی دیتی ہے وہ مایا ہے، نظر کا فریب ہے۔ جب کسی آدمی پر اِس حقیقت کا اِنکشاف ہو جائے کہ تتوم اسی (تو وُہ ہے) تو اُسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور اُسے سنسار چکر سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ شنکر نے اُپنشدوں کے پریشان مباحث کو ایک محکم

منطقی نظام کی صورت میں مُرتب کیا جو ویدانت کے نام سے مشہور ہوا۔ شہزادہ داراشکوہ نے پچاس کے قریب اُپنشد سرِاکبر کے نام سے فارسی میں ترجمہ کروائے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن میں جس کتاب مکنون کا ذکر آیا ہے اُس سے یہی اُپنشد مراد ہیں۔ داراشکوہ کے علاوہ البیرونی، شاہ غوث گوالیاری، شاہ عنایت قادری، مظہر جانجاناں اور مُلا محسن فانی صاحب دبستان المذاہب نے اُپنشدوں اور صوفیہ وجودیہ کی وحدت الوجود میں مشترک عناصر کا ذکر کیا ہے۔

اَتاترک

ترکی زبان میں اَتا باپ کو کہتے ہیں۔ اتا ترک یعنی ترکوں کا باپ مصطفیٰ کمال پاشا کو کہا جاتا ہے جس نے یونانیوں کو شکست دے کر ترکیہ کو تباہی سے بچایا تھا اور دوُر رس معاشرتی، قانونی، علمی اور لسانی اصطلاحات نافذ کرکے ترکوں کو ایک نئی قوم کی صورت میں منظم کیا تھا۔

آتن

فرعون امن ہوتپ چہارم ـــ بعد میں اِس نے اپنا نام اِخناتن رکھ لیا ـــ ۱۳۸۰ ق م میں مصر کے تخت پر بیٹھا۔ اُس نے خداوند خدا آمن کی پوُجا کو منسوخ کرکے اُس کے پروہتوں کو کارنک کے بڑے معبد سے نکال دیا۔ کارنک میں سیکڑوں دیوداسیاں رہتی تھیں جو دیوتا آمن کی زوجیت میں دی جاتی تھیں لیکن فی الواقع پروہتوں کی ہوسناکی کی تسکین کرتی تھیں۔ اِخناتن نے معبدوں میں جانوروں کی قربانیاں دینے سے منع کر دیا اور بُت تراشی و بُت پرستی کو ممنوع قرار دیا۔ اُس نے پروہتوں کی عیاری اور ریاکاری کا پردہ چاک کیا جو تعویذ گنڈوں اور جادو کے ٹونوں ٹوٹکوں کے کاروبار سے عوام کو لوٹ رہے تھے۔ اُس نے مندروں سے وقف کی ہوئی لاکھوں ایکڑ اراضی کو ضبط کر لیا جس سے پروہتوں کا ٹھاٹ باٹ ختم ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ معبدوں کی رسومِ عبادت پروہتوں نے ذاتی منفعت کے لیے وضع کر رکھی ہیں۔ اُس نے کہا کہ خدا ایک ہے اور وہ آتن ہے جس کی علامت سُورج ہے۔ آتن خالق ہے، پروردگار ہے، رحیم ہے کریم ہے۔ اِخناتن نے تاریخِ عالم میں پہلی بار واحدانیت کا تصور پیش کیا اور مذہب کو بُت پرستی اور رُسومِ عبادت

سے پاک کر دیا۔ بنی اسرائیل سے سات سو برس پہلے اُس نے کہا کہ خداوند آتن تمام اقوامِ عالم کا خدا ہے، سب انسانوں پر مہربان ہے۔ اُس کی جھلک پیڑوں اور پھولوں میں دکھائی دیتی ہے اور زندگی کی تپش اور ہر قسم کی نشو ونما اُسی کے دم سے ہے، اُسی کے اثر سے "ننھے میمنے اُچھلتے کودتے ہیں اور پرندے سرکنڈوں میں پَر پھڑ پھڑاتے ہیں۔" اِخناتن نے آتن کے مجسّمے تراشنے سے منع کر دیا اور کہا کہ سچّے خدا کی کوئی خاص شکل وصورت نہیں ہوتی۔ اخناتن کی اپنی زندگی مثالی تھی۔ اُس کی ایک ہی زوجہ تھی۔ ملکہ نوفرے تیت جس سے وہ دلی محبت کرتا تھا اور اپنی سات بیٹیوں کا مہربان باپ تھا۔ اُس نے آتن کے نام سے ایک شہر بھی بسایا لیکن اُس کی موت کے بعد پروہت دوبارہ حاوی ہو گئے اور اِخناتن کا نیا مذہب منسوخ کر دیا گیا۔

اٹک

اٹکا سے ہے یعنی رُک گیا۔ آریا وادی گنگ وجمن میں جا کر آباد ہو گئے تو اُنہوں نے دریائے سندھ کو عبور کرنے پر قدغن لگا دی جس سے اس کا نام اٹک پڑ گیا۔ برہمنوں نے کہا کہ جو کوئی اِس دریا کو عبور کرے گا سیدھا دوزخ میں جائے گا۔

احدیّت

کائنات کی اصل ایک ہے، کثرتِ محض اعتباری ہے۔ سپینوزا، فلاطینوس، شنکر اور برگساں کے نظریات احدیّت کی مختلف صورتیں ہیں۔ احدیّت میں دُوئی یا کثرت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ احدیّت سامی مذاہب: موسویّت، عیسائیت اور اسلام کے الٰہیاتی تصوّر کے منافی ہے کیوں کہ اِن مذاہب میں خدا اور مادے یا خالق اور مخلوق کی دُوئی بنیادی حیثیّت رکھتی ہے۔

اِحرام

اِحرام کا معنیٰ ہے حرام کر لینا یعنی بعض جائز باتوں کو مقرّرہ جگہوں سے حج کے تمام ہونے تک اپنے آپ پر حرام کر لینا۔ اِحرام باندھنا: بغیر سِلی ہوئی چادریں اوڑھ لینا۔ اِسلام سے پہلے عورتیں مرد برہنگی کی حالت میں سیٹیاں بجاتے ہوئے کعبہ کے سات چکّر لگایا کرتے تھے۔ بنو ہاشم نے اِحرام باندھنے کا طریقہ رائج کیا۔

اِحیاء العلوم

عُلوم کو زندہ کرنا۔ اِسے نشاۃ الثانیہ (نیا جنم) بھی کہا جاتا ہے۔ اِس تحریک کا آغاز چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں اطالیہ کے شہروں میں یونانی عُلوم کی تدریس سے ہوا۔ تُرکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو وہاں کے کچھ پڑھے لکھے لوگ ارسطو، دیماستھینیز، یوری پیڈیز وغیرہ کے مسودات لے کر فلورنس چلے گئے اور یہ شہر کلاسیکی علوم کی تدریس کا مرکز بن گیا۔ یہاں کا مشہور دیمچی خاندان اساتذہ کی سرپرستی کرنے لگا۔ کوسیمو دیمچی نے فلورنس میں اکادمی افلاطون قائم کی جس میں افلاطون کا فلسفہ پڑھانے لگے۔ لوگ تحصیلِ عُلوم کے شوق میں دور دراز کے ممالک سے سفر کر کے فلورنس، پیڈوا اور روم کی درس گاہوں میں ہجوم کر آئے۔ اطالیہ میں یہ تحریک زیادہ تر فلسفہ، ادبیات اور فنونِ لطیفہ تک محدود رہی۔ پٹرارک اِس تحریک کا سب سے بڑا عَلم بردار تھا۔ شمالی اور مغربی یورپ کے شہروں میں اِس کے سائنسی پہلو کو فروغ ہوا۔ کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن اور کیپلر نے ہیئت اور طبیعیات میں اِنکشافات کئے اور فرانسس بیکن، دے کارت اور ہابس نے نئے فلسفے کی بنیاد رکھی، تحقیقی عُلوم کو چھاپہ خانے نے فروغ بخشا۔ اہلِ فکر کا ذہن کلیسائے رُوم کی صدیوں سے عائد کی ہوئی پابندیوں سے آزاد ہو گیا اور مذہبی توہمات و تعصبات کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ بیکن نے ارسطو کی منطقِ قیاسی پر پُرمغز نقد لکھا اور ثابت کیا کہ یہ منطق تحقیقِ علمی کے راستے میں صدیوں سے حائل رہی ہے۔ دُنیائے اَدب میں ایراسمس، مُور، مونتین اور شیکسپیئر جیسے عقلا نے نئے نئے اسالیب وضع کئے۔ میکائیل آنجلو، رافیل، طلیان، داونچی وغیرہ نے مصوّری کے شاہ کار پیش کئے۔ سٹریڈی وبریلس نے نئی موسیقی کی بُنیاد رکھی۔ اِس تحریک کے بارے میں مورّخ دین لون لکھتا ہے۔

"لوگوں کو ایک بار پھر محسوس ہوا کہ زندگی بڑی نعمت ہے اور محض زندہ رہنا ہی بہت بڑی مسرّت کا باعث ہے۔ یہ نتیجہ تھا یُونانی فلسفے کے اِحیاء کا جس نے ذہنوں پر صدیوں سے جمی ہوئی رہبانیت کی پھپھوندی کو دُور کر دیا۔"

آزادیِ فکر و نظر کے ولولے سے سرشار ہو کر کولمبس، میجی لان اور واسکو ڈا گاما نے دُور دراز کے

پُرخطر بحری سفر کئے۔ یہی وَلولۂ حیات اور یہی جوششِ زندگی نشاۃُ الثانیہ کی رُوح ہے۔ اربابِ نظر حُجروں اور خانقاہوں میں زاویہ نشین ہو کر طلبِ نجات کرنے کے بجائے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے دلچسپی لینے لگے اور اِس کے مسائل اور عُقدوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کا آغاز ہوا۔ وہ نگاہیں جو ایک ہزار برس سے فلاح و بہبود کی جستجو میں آسمان کی طرف لگ رہی تھیں پھر زمین کی طرف لوٹ آئیں اور اِسی زمین پر فردوسِ گُم گشتہ کی تلاش شروع ہو گئی۔

اِختلالِ ذہن

تحلیلِ نفسی کی رُو سے آدمی اُس وقت خللِ ذہن میں مُبتلا ہوتا ہے جب اُس کی شعوری رَو کے تسلسل میں فرق آجاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ذہن ہر وقت حرکت اور سیلان میں رہتا ہے حتیٰ کہ سوتے جاگتے میں بھی اُس کا عمل جاری رہتا ہے جس کے باعث ہم خواب دیکھتے ہیں۔ ابھی ہم آج کی کوئی بات سوچ رہے ہوتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے میں ہمارا خیال اپنے بچپن کے کسی واقعے کی طرف مُنتقل ہو جاتا ہے اور پھر معاً ہم مستقبل کے اِرادے باندھنے لگتے ہیں۔ یہی ذہن کی سیلانی حرکت ہے جو ہماری نفسیاتی صحت مندی کو بحال رکھتی ہے۔ جب کبھی ہماری ذہنی اُلجھنیں جنھیں ہماری اَنا یا ہمارا شعور ہمارے لاشعور میں دبائے رکھتا ہے، بے اختیار ہمارے شعور کی سطح پر اُبھر آتی ہیں تو شعور کی رَو مُتاثر ہو جاتی ہے، اُس کی سیلانی حرکت میں فرق آجاتا ہے اور ہمارا ذہن کسی ایک ہی سطح پر اِس طرح جامد ہو جاتا ہے کہ اُس کے بغیر کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتا۔ یہی خللِ ذہن کی علامت ہے۔ ہماری خوش قسمتی سے یہ حالت شاذ و نادر ہی برقرار رہتی ہے اور ہمارے ذہن کی سیلانی حرکت بحال ہو جاتی ہے۔ یہ حرکت مستقلاً منقطع ہو جائے تو خللِ ذہن کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جس کی کئی صورتیں ہیں۔ (۱)۔۔۔ ہسٹریا (۲)۔۔۔ عصبی المزاجی، پژمُردگی، منقسم شخصیت اور جسم کے مختلف اعضاء میں درد کی شکایت اِس کی علامتیں ہیں۔ (۳)۔۔۔ فتورِ ذہن: جس میں نامعلوم اندیشے اور خوف شامل ہیں منجملہ یہ کہ ساری دُنیا میری دشمن ہے اور سب لوگ میرے درپئے آزار ہیں۔ (۴)۔۔۔ تشویش: آدمی بلا کسی معقول وجہ کے ہر وقت تشویش میں مُبتلا رہتا ہے مثلاً یہ کہ کمرے کی چھت مجھ

پر گر پڑے گی یا ٹرین جس میں ہیں سفر کر رہا ہوں حادثے کا شکار ہو جائے گی اور ان اندیشوں کے ساتھ آدمی اپنی موت کے مناظر کے بارے میں سوچنے لگتا ہے ۔ (۵) ــــ ہر وقت اپنی بیماری کا رونا روتے رہنا۔ اس کی تہ میں رحم طلبی ہوتی ہے جو دماغی کمزوری کی علامت ہے۔ خللِ ذہن کا علاج تحلیلِ نفسی سے کیا جاتا ہے لیکن اب ایسی مسکّن دوائیں تیار کر لی گئی ہیں جو اکثر حالتوں میں مؤثر ثابت ہوتی ہیں ۔

اَخلاطِ اربعہ

چار اَخلاط کا یہ تصوّر طبِ یونانی کے بانی بقراط (ہپوقراطیس) سے یادگار ہے۔ انہی کی بنا پر چار مزاج متعیّن کئے گئے ہیں ۔ دَموی ، بلغمی ، صَفراوی اور سوداوی ۔ دَم عربی میں خون کو کہتے ہیں۔ دَموی مزاج والے کے جسم میں خونِ صالح بافراط ہوتا ہے اِس لئے وہ تندرست اور توانا ہوتا ہے ۔ اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور آنکھوں میں گلابی ڈورے ہوتے ہیں۔ نہایت چاق و چوبند، خطر پسند اور بلند نظر ہوتا ہے۔ زندگی کے بارے میں اُس کا نقطۂ نظر رجائی ہوتا ہے اور وہ زندگی سے پوری طرح تمتّع کرتا ہے ۔ اکثر اصحابِ عزم و عزیمت اِس مزاج کے ہوتے ہیں۔ بلغمی مزاج والا سفید فام اور فربہ اندام ہوتا ہے۔ خوش مزاج لیکن کاہل اور آرام طلب ہوتا ہے ، زیادہ تگ و دَو اور بھاگ دوڑ سے گریز کرتا ہے ، ہر ایک سے مُسکرا کر بات کرتا ہے اور خوش رہو اور خوش رہنے دو کا قائل ہوتا ہے۔ صَفراوی مزاج والے کا رنگ زرد ہوتا ہے ، اُس کا جسم دُبلا پتلا ہوتا ہے ، نہایت حساس اور زود رنج ہوتا ہے۔ بات بے بات جھگڑے اور اختلاف کا کوئی نہ کوئی عنوان پیدا کر لیتا ہے جسمانی لحاظ سے توانا نہیں ہوتا اور سرکہ جبینی کے باعث اچھا دوست نہیں بن سکتا۔ جفاکشی اور ہمت کوشی اِس میں نہیں ہوتی اور طبعاً حاسد ہوتا ہے۔ سوادی مزاج والے کے چہرے کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت جھلکتی ہے اور میل جول سے گھبراتا ہے۔ تنہائی پسند ہوتا ہے اور اکثر گُم سُم اور کھویا کھویا رہتا ہے، گہری نیند سے محروم ہوتا ہے ، اُس کی طبیعت پر افسردگی کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ زندگی کے تاریک پہلو کو دیکھتا ہے ۔ روس کے مشہور عالمِ عضویات پاولوف نے ایک مدت تک کتوں پر تجربے کئے اور ہپوقراطیس کے چار مزاجوں کے اِس نظریئے پر صاد کیا تھا۔

اِخلال

لغوی معنیٰ ہیں نقصان پہنچانا، محتاج کرنا۔ انتقاد کی اِصطلاح میں اِس کا مطلب ہے کسی شعر میں الفاظ کو یوں بے ترتیب اور مضمون کی کڑیوں کو یوں غیر مربوط کر دینا کہ شعر کا مفہوم خبط ہو جائے۔ یہ خامی متشاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جو قادر الکلام نہ ہونے کے باعث اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار صاف سیدھے پیرائے میں نہیں کر سکتے ہیں اور اپنے اہمال و ابہام پر فکر کی گہرائی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِخلاقیات

اِخلاقیات یا اِخلاق کا فلسفہ شروع سے فلسفے کا ایک اہم شعبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اخلاقیات انسانی اعمال کے مقاصد کی قدر و قیمت کو جانچنے کے لئے اُصولوں کے تعیّن کا علم ہے۔ اِس میں خَیر کی ماہیت سے بحث کی جاتی ہے اور اُس کے حصول کے وسائل کا تجزیہ کر کے بتایا جاتا ہے کہ وہ کس حد تک خیر کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ قدمائے یونان کے خیال میں مَسرّت کا حصول ہی اِنسانی زندگی کا واحد مقصد ہے البتہ مَسرّت کے معانی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سُوفسطائی اور اُن کے ہم نوا کہتے تھے کہ مَسرّت جذبات اور حواس کی تسکین سے میسّر آتی ہے جب کہ سقراط اور اُس کے پیرو عقلِ استدلالی کو مَسرّت کے حصول کا وسیلہ مانتے تھے۔ سُوفسطائیوں کے ہم خیالوں کو لبعد میں لذّت پسند کہا گیا جس کی بہترین مثال ابیقورس تھا۔ افلاطون نے حُسن اور صداقت کی طرح خَیر کو بھی قدرِ اعلیٰ قرار دیا اور کہا کہ حُسن اور صداقت کی طرح خَیر کا حصول بھی عقلِ استدلالی ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ افلاطون نے لذّت کو مَسرّت کا عُنصرِ ترکیبی ماننے سے انکار کیا۔ اِس کے مکالمات میں سقراط کہتا ہے کہ علم ہی خَیر ہے یعنی جو شخص خَیر کا علم رکھتا ہو وہ کوئی غیر اخلاقی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اِس پر گرفت کرتے ہوئے ارسطو نے کہا کہ سقراط نے جذبات و احساسات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اُس کے بقول یہ بات عین ممکن ہے کہ آدمی خَیر کی حقیقت کو جانتے ہوئے بھی جذبات کے جوش میں آ کر غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب کر بیٹھے۔ ارسطو نے حفظِ نفس کی اہمیّت سے انکار

نہیں کیا۔ اُس کے خیال میں ایک فعل کو اِس لئے نیکی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حظِ نفس کا باعث ہوتا ہے بلکہ نیکی ہونے کے سبب ہی اُس میں حظِ نفس کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ اِس طرح حظِ نفس محض ضمنی اور ذیلی شے ہے۔ نیکی کی زندگی گذارنے والا شخص از خود حظ و مسرّت سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے جیسے ایک صحت مند نوجوان کے رخساروں پر خود بخود لالی دمکنے لگتی ہے۔ ارسطو کے یہاں بھی انسانی اعمال کا عقلِ استدلالی پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پُرجوش جذبات پر اچھی عادتوں سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اُس نے اچھی عادات کو تہذیبِ اخلاق کے لئے لازم قرار دیا ہے۔ قدمائے یونان دو انتہاؤں کے مابین صداقت کی تلاش کیا کرتے تھے یعنی اعتدال اور توافق کو فکر و عمل میں اہمیت دیتے تھے۔ اِسی اصول کی بنا پر ارسطو نے کہا ہے کہ نیکی دو انتہاؤں کے درمیان ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اعتدال ہی نیکی ہے۔ سُقراط کے پیروؤں میں ارسطائی پس نے حصولِ مسرّت کے لئے لذت اندوزی کو اہمیت دی اور کلبیوں نے ترکِ لذات کو مؤثر قرار دیا۔ بعد میں ابیقورس اور زینو رواقی کے پیروؤں نے اُن کی تقلید کی۔ ابیقورس کے خیال میں لذت مسرّت کا لازمی حصّہ ہے جب کہ رواقیئن کے یہاں وہی عمل نیکی کہلاتا ہے جو عقلِ استدلالی پر مبنی ہو۔

جدید فلسفے کے آغاز پر ہابس نے کہا کہ خیر اور شر کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ اِن کی حیثیت اضافی ہے۔ لاک نے اُس کی پیروی میں کہا کہ ذاتی مفاد و مسرّت کا تحفظ کرنا ہی اخلاقی عمل کا معقول مقصد ہو سکتا ہے۔ لارڈ شیفٹسبری نے ذاتی مفاد کے ساتھ اجتماعی مفاد کی پاسبانی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ افادیت پسند جیسے، ایس مِل کے خیال میں ہر شخص حظِ نفس کے حصول کا آرزومند ہوتا ہے اِس لئے حظِ نفس ہی کو انسانی اعمال کا مقصد بنانا ضروری ہے۔ افادیت پسندوں نے فرض کر لیا کہ اگر وہ ذاتی حظِ نفس کے حصول میں کوشاں رہے تو اِس سے دوسرے افراد بھی خود بخود حظِ نفس سے بہرہ ور ہو جائیں گے لیکن عملی دُنیا میں یہ بات ممکن نہیں ہے۔ ذاتی حظِ نفس کے حصول کی کوشش کرنے والا شخص لازماً خود غرضی کا شکار ہو جائے گا اور دوسروں کی فلاح و بہبود کو پس پشت ڈال دے گا۔ خود غرضی اور عمومی فلاح باہم متضاد ہیں دوسری طرف کانٹ

نے "فرض برائے فرض" پر زور دیا۔ وہ کہتا ہے کہ جو شخص عقلاً یا اخلاقاً کوئی فعل کرتا ہے تو اُسے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میرے اس فعل کے نتائج کیا ہوں گے۔ اِسے کانٹ کا حکمِ قاطع کہتے ہیں اور اِس میں رواقیئین ہی کے اخلاقی نصب العین کو نئی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

ہمارے زمانے میں اخلاقیات کے دو مکاتیب سامنے آئے ہیں (۱) فطرت پسندی کا مکتب اور (۲) وجدانیت کا مکتب۔ پہلا مکتب سائنس کے انکشافات پر مبنی ہے جس میں اخلاقی قدروں کے ازلی و ابدی یا معروضی ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔ اِس کی رُو سے اخلاقی قدریں سراسر موضوعی ہیں اور بچہ ماحول کے اثرات جذب کر کے اعمال کے حُسن و قبح یا نیک و بد کے تصوّر سے آشنا ہوتا ہے۔ وجدانیت مذہب پر مبنی ہے اِس کی رُو سے ضمیر خیر و شر کی تمیز بچے کے ذہن و قلب میں وہبی طور پر موجود ہوتی ہے۔ وہ اِن کا کسب نہیں کرتا بلکہ شعور کی بیداری کے ساتھ از خود اِن میں تفریق کرنے لگتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں خیر و شر معروضی ہیں۔ جدید طبیعیات کے انکشافات سے اخلاقی قدروں کے موضوعی اور اضافی ہونے کا تصوّر پیدا ہوا ہے اور نئے عمرانی نظریات کے پیشِ نظر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ فردِ معاشرے کا ایک رُکن ہونے کی حیثیت سے اجتماعی فلاح کے لئے جدّ و جہد کئے بغیر ذاتی و انفرادی حیثیت میں مسرت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ قُدمائے یونان بھی سیاسیات اور اخلاقیات کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ فرد معاشرے کا رکن ہو کر ہی انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور سیاسی وسائل سے منصفانہ معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے جو معاشرہ عدل و انصاف پر مبنی نہ ہو اُس میں مثبت اور تعمیری اخلاقی قدریں پنپ نہیں سکتیں نہ افراد کو محض زبانی کلامی نیکی کی تلقین کر کے نیک بنایا جا سکتا ہے۔ انسان اُسی معاشرے میں با اخلاق اور با مسرّت زندگی گذار سکتا ہے جس کے افراد اپنی اپنی وہبی صلاحیتوں کے مطابق ذاتی مفاد کے لئے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لئے کام کر رہے ہوں اور اُنہیں اِس بات کا شعور ہو کہ وہ دوسروں کو مسرّت کا سامان بہم پہنچا کر ہی خود بھی مسرّت سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔

اِخوان الصفا و خُلّان الوفا

عباسی دور میں ایرانی عالموں کی ایک خفیہ انجمن کے ارکان تھے۔ اِن کا تعلق فرقہ باطنیہ سے تھا۔ انہوں نے مِل کر دسویں صدی کے اواخر میں ۵۱ رسائل تصنیف کئے گویا اُس زمانے کے مُروجہ عُلوم کی انسائیکلوپیڈیا مُرتّب کی۔ اِن میں سب سے مشہور رسالہ شرف الانسان ہے جو اِس مجموعے کے دوسرے حصّے کا آٹھواں رسالہ ہے۔ اِن رسائل میں نَو فلاطونی فلسفے کے گہرے اثرات مِلتے ہیں۔ اِخوان الصفا کا اِلٰہیاتی نظریّہ یہ تھا کہ وجُودِ احد سے سب سے پہلے عقلِ اوّل کا صدور ہوا جس سے نفسِ کُل نکلا اور نفسِ کُل سے مادہ صادر ہوا جس سے کائنات بنائی گئی۔ نفسِ کُل کائنات میں ہر کہیں جاری و ساری ہے اور اِسی کے باعث یہ کائنات قائم ہے۔ افراد کی رُوحیں موت کے بعد دوبارہ نفسِ کُل کو لوٹ جاتی ہیں۔ اِخوان الصفا، قرآنی آیات کی تاویل کر کے اِن کے مطالب کو مُروجہ عُلوم پر ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ رسائل میں اِلٰہیات، سائنس، فلسفہ، اخلاقیات، علم نجوم، فلکیات، طِب، موسیقی، فقہ، تفسیر اور تصوّف پر بحثیں مِلتی ہیں۔ یہ رسائل اکثر اِبنِ سینا کے مطالعے میں رہتے تھے۔ غزالی نے اِن کی تکفیر بھی کی اور اِن سے اِستفادہ بھی کیا۔ اِن رسائل کو ۱۱۵۰ء میں بغداد میں برسرِعام نذرِ آتش کیا گیا۔ اِخوان کا رئیس زید بن رفاع تھا۔ دوسرے مُصنفین میں ابو سلیمان محمد بن نصر البسطی المقدسی، ابوالحسن علی بن ہارون الزنجانی، ابو احمد النہر جوری اور العوفی کے نام ہم تک پہنچے ہیں، باقی کے احوال پر گُمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اَدب

اَدبی تحریر وہ ہوتی ہے جس میں لکھنے والا اِظہارِ ذات کرتے ہوئے جو حظ و مسرّت محسوس کرتا ہے وہی پڑھنے والے کو بھی محسوس ہو۔ ذوق یا حظ و مسرّت واحد معیار ہے جس سے ہم ادبی اور غیر ادبی تحریروں میں فرق کر سکتے ہیں۔ ادب کی اِصناف میں لوک بت کہاؤ، لوک کہانیاں، جاتک کہانیاں، داستان، ناول، تمثیل، مختصر افسانہ، دیو مالائی قصّے، اِنشائیہ، خود نوشت سوانح حیات، مُراسلات، طنزیہ و مزاحیہ تحریریں، سفر نامے، رپورتاژ، خاکے وغیرہ شامل ہیں۔

اِدراک

جب ذہن کسی حِس کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ اِدراک بن جاتی ہے۔ مثلاً کسی آدمی کی اُنگلی آگ سے چھُو جائے تو یہ حِس ہو گی لیکن پلک جھپکنے میں ذہن اِس حِس کی ترجمانی کر کے ہاتھ کھینچ لینے کا حکم دے گا اِسے اِدراک کہیں گے۔ یہ وقفہ اتنا کم ہوتا ہے کہ بعض علمائے نفسیات حِس اور اِدراک میں فرق ہی نہیں کرتے۔

آدم

آدم کا لفظ ADAMAS سے ہے جس کا معنیٰ ہے سخت، جیسا کہ انگریزی کے لفظ ADAMENT میں ہے۔

اَدونِس

کنعانی بابل کے دیوتا تموز کو آذون (آقا) کہتے تھے جسے یونانیوں نے اَدونِس بنا لیا۔ فریگیا میں اِس کا نام اتیس تھا۔ اَدونِس بار آوری کے مُتوں میں زرعی نشو و نما کا علامتی مظہر تھا۔ جے، جی فریزر نے اَدونِس کے قِصّے پر ایک کتاب اَدونِس نام کی لکھی تھی جس میں کہتا ہے کہ اَدونِس ایک جوان رعنا تھا جس پر حُسن و عشق کی دیوی افرودائتی اور موت کی دیوی پرسی فونی فریفتہ ہو گئیں۔ مریخ دیوتا بھی افرودائتی سے عشق کرتا تھا۔ اُس نے حسد سے جل کر خنزیر کا روپ دھار لیا اور اَدونِس کو مار ڈالا۔ خداوند خدا زیوس نے افرودائتی اور پرسی فونی میں اِس شرط پر صلح کرا دی کہ اَدونِس چھ ماہ تک پرسی فونی کے یہاں اُس کے زیر زمین دوزخ محل میں قیام کرے گا اور بہار کی آمد کے چھ ماہ بعد تک افرودائتی کے آغوشِ شوق کی زینت بنے گا۔ اَدونِس کا سالانہ تہوار مِصر میں اوزیرس اور عزّا، بابل میں تموز اور عشتار، شام میں اَدونِس اور عشترتی اور فریگیا میں اتیس اور سائی بیلی کے ناموں سے منایا جاتا تھا۔ فنیقیہ، قبرص اور ایتھنز میں اَدونِس کی المناک موت کی یاد میں عورتیں ماتمی جلوس نکالتی تھیں اور زور شور سے سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کرتی ہوئی بازاروں کا چکر لگاتی تھیں۔ بعض تماشائی اَدونِس کے غم میں از خود رفتہ ہو کر اپنے آپ کو چھُریوں سے زخمی کر لیتے تھے۔ جلوس کے

خاتمے پر بڑا پرجوش ساتھیوں کو بشارت دیتا تھا کہ مبارک ہو اُدونِس دوبارہ زندہ ہوگیا ہے۔ اس پرجوش کے شادیانے بجائے جاتے۔ عورتیں مرد مِل کر دیوانہ وار ناچتے اور جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کئے جاتے تھے۔ جے۔ جی فریزر کے خیال میں جناب عیسیٰ کی حیاتِ نو، مسیحا اور فارقلیط کے تصورات اِسی دیو مالائی روایت سے لئے گئے ہیں۔ عربوں نے آدونِ کا نام نعمان رکھ لیا جس کا معنیٰ ہے محبوب۔ کہتے ہیں کہ جس جگہ اُدونِس کا خون گرا تھا وہاں لالے کے پھول اُگ آئے تھے چنانچہ عرب لالے کے پھول کو شقائق النعمان (نعمان کے زخم) کہتے ہیں۔

آدی واسی

ہندوستان کے اصل قدیم باشندے۔ اِن میں لواریا، بھنوٹو، ہبورا، بھیڈگھٹ، ڈوم، ہری، کنجر، نٹ، کرول، مینا، سانسی، بکھیّ وارا، چڑی مار، پاسی، گگڑے، گلوبے، بھیل اور مُنڈا شامل ہیں۔

اِرادیّت

کانٹ نے کہا تھا کہ حقیقت کا اِدراک ناممکن ہے۔ شوپنہائر نے کہا ارادہ ہی حقیقت ہے۔ اِس سے اِرادیّت کی تحریک کا آغاز ہوا جس نے نیٹشے، برگساں، جیمز وارڈ اور ڈیوی کے افکار کو متاثر کیا۔ شوپنہائر کے خیال میں آفاقی اندھا اِرادہ ہر شے کا سبب ہے اور کائنات کا تخلیقی اصول ہے۔ یہ نظریہ مثالیت ہی کی ایک صورت ہے۔ شوپنہائر اِرادے کے مقابلے میں عقل و خِرد کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے۔ گوتم بدھ کے بعد شوپنہائر قنوطیوں کا سب سے بڑا اِمام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندہ رہنے کی خواہش ہی انسان کے آلام و مصائب کا سبب ہے اگر اِنسان تجرّد کی حالت میں زندگی گذارے اور بچے پیدا نہ کرے تو ارادۂ حیات کو شکست دی جا سکتی ہے۔

اَرارات

آرمینیا کا ایک پہاڑ جس کی چوٹی پر روایت کے مطابق کشتیٔ نوح رُکی تھی۔

اِرتقاء

نظریۂ اِرتقاء انگریز سائنس دان ڈارون سے منسوب ہے۔ لیمارک نے کہا تھا کہ جب کبھی کوئی

حیوان کسی نئے عضو کی ضرورت محسوس کرتا ہے یا اِس کی خواہش کرتا ہے تو اُس کے بدن میں اِس عضو کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈارون نے اِس داخلی اصول ارتقاء کو غیر علمی قرار دیا۔ وہ صرف خارجی ماحول سے بحث کرتا ہے۔ فلاسفۂ یونان اصولِ ارتقاء کے قائل نہیں تھے۔ عہدِ سُقراط سے پہلے کے ایک فلسفی اناکسی مینڈر کے یہاں البتّہ ارتقاء کے مبادیات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ۱۹ ویں صدی میں طبیعی عُلوم کو ترقی ہوئی تو ذی حیات پر طبیعی قوانین اور تاریخ پر حیاتیات کے اُصولوں کا اطلاق کیا گیا تو ڈارون نے ارتقاء کا نظریّہ پیش کیا۔ اُس کا نظریّہ مالتھس کے آبادی کے نظریّے پر مبنی ہے جس کی رُو سے ذی حیات اِس تیز رفتاری سے بچّے پیدا کرتے ہیں کہ سب کو خوراک میسّر نہیں آسکتی اِس لئے زندہ رہنے کے لئے انواع میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اِس کشمکش کے تصوّر سے ڈارون کے نظریّے کا آغاز ہوتا ہے۔ انسان کے اصل کی جستجو کرتے ہوئے ڈارون نے کہا کہ انواع میں زبردست جہد للبقا جاری ہے۔ جو جانور خارجی ماحول سے موافقت پیدا کر لیتے ہیں وہ باقی رہتے ہیں دوسرے مِٹ جاتے ہیں۔ زندہ بچنے والوں کو لبقائے اصلح کا نام دیا گیا۔ طبیعی ماحول بدلتا رہتا ہے۔ اِن تغیرات کے دوران میں انواع دوسرے انواع میں بدل جاتے ہیں تاکہ نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں۔ اِس عمل کو اِنتخابِ طبیعی کہا جاتا ہے یعنی نیچر اُن خاصیتوں کا اِنتخاب کر لیتی ہے جن کی مدد سے انواع نئے ماحول میں زندہ رہ سکتی ہیں اور اُن خامیوں کو مٹا دیتی ہے جو زندہ رہنے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ اِس نظریّے کی رُو سے برف کے طویل زمانوں میں نامساعد ماحول کے خلاف کشمکش کرتے ہوئے بنی نوع اِنسان کا ذہنی جوہر ترقی کر گیا جس کے طفیل وہ ماحول سے موافقت کرنے کے قابل ہو گئے جب کہ ڈِنوسار جیسے کوہ پیکر جانور ماحول کے ساتھ موافقت نہ کر سکے اور فنا کے گھاٹ اُتر گئے۔ اِس تحقیق سے ڈارون نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اِنسان کا ترقی یافتہ ذہنی جوہر ہی اُسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتا ہے ورنہ اصلاً وہ چمپانزی، گوریلا اور اورنگ اوٹنگ ہی کے کنبے کا ایک حیوان ہے۔ انسان اور چمپانزی کے درمیان جو حیوان ضروری واسطہ تھا اُس کا کھوج ڈارون نہ لگا سکا اِس لئے اُسے "زنجیر کی کھوئی ہوئی کڑی" کا نام دیا۔ آج کل کے عُلماء کے خیال میں جاوا اور پیکین سے جو نیم حیوانی نیم انسانی

کھوپڑیاں ملی ہیں اُن سے اِس کھوئی ہوئی کڑی کا سراغ مِل گیا ہے۔

ڈارون کی معرکہ آرا کتاب 'اصلِ انواع' کی اشاعت سے مذہبی حلقوں میں کُہرام مچ گیا۔ پیدائش کے بارے میں کلیسیا کے بنیادی عقائد متزلزل ہو گئے۔ عہد نامۂ قدیم کی رُو سے خدا نے انسان کا پُتلا بنا کر اُس میں رُوح پھونکی تھی اور اِس پُتلے کی پسلی سے حوّا کو پیدا کیا تھا۔ ہکسلے اور دوسرے سائنس دانوں نے ڈارون کی حمایت میں اہلِ کلیسیا سے بحث و مجادلہ کا بازار گرم کیا۔ اب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ انسان آسمان سے پستی میں گرا ہوا کوئی فرشتہ نہیں ہے بلکہ زمین کی پستیوں سے بلندیوں کی طرف اُٹھتا ہوا حیوان ہے۔

آرتی

آرتی کا لغوی معنیٰ ہے 'تکلیف'۔ آرتی پانچ یا سات بتیوں والا پیتل کا چراغ ہوتا ہے جسے روشن کر کے دیوتا یا راجہ کے چہرے کے سامنے گھما یا پھرایا جاتا ہے تاکہ وہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ آرتی صرف سُہاگن، نرتکی یا دیوداسی ہی اُتار سکتی ہے۔ جب راجہ دربار سے اُٹھ کر آتا تو اُس کی آرتی اُتاری جاتی تھی۔ خیال یہ تھا کہ راجہ کے چہرے پر سینکڑوں لوگوں کی نظریں پڑتی ہیں ممکن ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والوں میں کوئی نظرِ بد رکھنے والا بھی ہو جس کے چشم زخم سے راجہ کو گزند پہنچے۔ دیوتاؤں کی آرتی بھی اِسی مقصد کے لئے اُتارتے ہیں۔

ارجان

جَین فرقے کی تارک عورتیں۔

ارغواں

سُرخ رنگ کا نہایت خوبصورت پھُول جو کابل کے نواح میں ہوتا ہے۔ اِس کی جھاڑی پیڑ جتنی اُونچی ہوتی ہے بابر نے تزکِ بابری میں اِس کا ذکر کیا ہے۔ بابر کے مزار کے نواح میں آج بھی ارغواں کے پھُول کھِلتے ہیں۔

ارغوانی رنگ

یہ لال چھپا رنگ قدیم زمانے کے کنعانی صدفِ ماہی کے سیال مادے سے نکالتے تھے۔ اِس میں

رنگے ہوئے ریشمی کپڑے نہایت بیش قیمت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ہیلن اور کلیوپیٹرا کا مرغوب رنگ تھا۔ ارغوانی کے علاوہ قرمزی رنگ بھی کنعانیوں ہی نے دریافت کیا تھا۔ یہ رنگ اُن کیڑوں سے بنایا جاتا تھا جو شاہ بلوط کی ایک خاص قسم سے حاصل کیے جاتے تھے۔

اَرواح کا مت

جیسا کہ آج کل کے آسٹریلیا اور افریقہ کے جنگلی قبائل کے مشاہدے سے انکشاف ہوا ہے کہ ما قبل تاریخ کا انسان بھی رُوح کو ہوا کا جھونکا یا سانس ہی سمجھتا تھا۔ وہ دیکھتا کہ جب اُس کا کوئی عزیز بیمار پڑ جاتا اور اُس کی سانس رُک جاتی تو وہ مر جاتا تھا۔ اِس سے اُس نے اندازہ لگایا کہ سانس یا ہوا کا جھونکا ہی زندگی یا رُوح ہے۔ اِس کا رشتہ ٹوٹ جانے سے زندگی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آج بھی دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں رُوح کے لئے جو الفاظ ملتے ہیں اُن کا لغوی معنیٰ ہوا کا جھونکا ہی ہے مثلاً قبطی میں کنف، عبرانی میں رواح، عربی میں رُوح، یونانی میں سائکی، لاطینی میں انیما، سنسکرت میں آتما کا معنیٰ ہوا کا جھونکا ہے۔ اِنسان کے شعور کی بیداری کے ساتھ اُس کا رُوح کا تصور بھی بدل گیا۔ وہ دیکھتا کہ رات کو جب وہ اپنے غار میں سو جاتا ہے تو حالتِ خواب میں اِدھر اُدھر جنگلوں میں گھومتا پھرتا ہے، شکار کھیلتا ہے، اپنے مرے ہوئے عزیزوں سے مُلاقاتیں کرتا ہے لیکن صبح سویرے جاگنے پر وہ اپنے غار ہی میں موجود ہوتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا کہ میرے اندر کوئی ہستی ایسی بھی ہے جو سوتے میں جسم سے نکل کر اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی ہے۔ ہمزاد کا خیال اِسی قیاس آرائی سے یادگار ہے۔ بہر حال اب رُوح ہوا کا جھونکا نہ رہی بلکہ ایک پورے قد و قامت، ڈیل ڈول اور چہرے مہرے والی ہستی بن گئی جو سوتے میں اور مرنے کے بعد ـــــ قدیم انسان موت کو لمبی نیند ہی سمجھتا تھا ـــــ ادھر اُدھر آ جا سکتی ہے۔ کئی توہمات اِس خدشے سے یادگار ہیں کہ کہیں یہ ہستی یا رُوح جسم سے نکل نہ بھاگے چنانچہ ہندو جمائی لینے پر آج بھی جسے نارائن کہتے ہیں۔ چھینک آنے پر عیسائی کہتے ہیں "خدا تمہیں برکت دے" اور مسلمان یرحمک اللہ کہتے ہیں۔ اپنی طفلانہ تخئیل آرائی کے باعث ـــــ بچے کھلونوں کو اپنی ہی طرح زندہ سمجھ کر اُن سے باتیں کرتے ہیں ـــــ قدیم اِنسان نے جانوروں،

پرندوں، درختوں، پہاڑوں، ندی نالوں، سورج، چاند کو بھی اپنی ہی طرح کی ذی حیات اور ذی رُوح ہستیاں قرار دیا۔ یہی اَرواح کا مت تھا جس کے اثرات آج بھی مذہب، تصوف، فلسفہ، نفسیات اور علمِ الانسان میں مطالعہ کیئے جا سکتے ہیں۔ مذہب کی ابتدا اِسی سے ہوئی۔ اِنسان نے آسمان، زمین، سورج وغیرہ کو اپنے آپ پر قیاس کرتے ہوئے اُنہیں زندہ قرار دیا۔ اِن میں آسمان سورج اور چاند مہربان دیوتا بن گئے جو بادل برساتے تھے یا روشنی بخشتے تھے۔ دھرتی کی کوکھ سے فصلیں اُگتی تھیں اِس لئے اُسے ماں کہنا شروع کیا، آسمان باپ بن گیا۔ اُنہیں خوش کرنے کے لئے قربانیاں دینے کا رواج ہوا۔ گرج چمک، طوفان کے دیوتا خوفناک تھے اِس لئے اُنہیں راضی رکھنا بھی ضروری تھا۔ اِس مقصد کے لئے وہ اُن پر چڑھاوے چڑھانے لگا۔ مرے ہوئے لوگوں میں بعض اُس کے دوست اور عزیز تھے اور بعض خطرناک دشمن تھے اِس سے روحوں کو نیک اور بد یا شقی اور سعید میں تقسیم کیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ بد روحیں اِنسان کے اندر گھُس کر اُسے امراض میں مُبتلا کر دیتی ہیں، راتوں کو آ کر اُسے ڈراتی ہیں، راستے سے بھٹکا دیتی ہیں۔ بھُوت، عفریت، غول وغیرہ کے تصورات اِنہی بد اَرواح سے یادگار ہیں۔ مرورِ زمانہ سے دیوتاؤں کی پُوجا میں بد اَرواح اور نیک اَرواح کی استرضا بھی شامل ہو گئی۔ اِس دَور کے اِنسان کی سوچ یہ تھی کہ نیند کی حالت میں رُوح جسم سے الگ ہو کر اِدھر اُدھر کے چکر لگا کر واپس آ جاتی ہے لیکن لمبی نیند یا موت کے بعد وہ کسی اور عالم میں جا کر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لیتی ہے البتہ دعوت کرنے پر یہ اَرواح پھر اُس کے یہاں آ جاتی ہیں۔ موت کے بعد رُوح کی بقا کا یہ تصوّر مذہب کا سنگِ بنیاد بن گیا۔ مصریوں، سُمیریوں، بابلیوں، چینیوں وغیرہ میں شروع سے حیات بعد موت کا تصوّر باقی رہا ہے۔ مصری اپنے مُردوں کے جسم کی ممی بنا کر اُنہیں محفوظ کر لیتے تھے تاکہ با (رُوح) تین ہزار برسوں کا چکر لگا کر واپس اپنے جسم میں آئے تو اُسے ثابت و سالم پائے۔ چینیوں اور تاتاریوں کے یہاں بادشاہ کے مرنے پر اُس کی کنیزیں، گھوڑے اور دوسرا ساز و سامان اُس کی میت کے ساتھ دفن کر دیتے تھے کہ اگلی زندگی میں اُسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہندوؤں میں عورت شوہر کی چِتا پر جل کر ستی ہو جاتی تھی تاکہ اگلے جہان میں وہ

اُس کی جُدائی سے پریشان نہ ہو۔ ہندوؤں کا آواگون یا سنسار چکر کا نظریہ بھی اِسی مفروضے پر مبنی ہے کہ اِنسانی رُوح نیک یا بد اعمال کی رعائیت سے نیا قالب اختیار کرلیتی ہے۔ سائنٹیفک نفسیات کی رُو سے رُوح کا انسانی ذہن و شعور سے علاحدہ اپنا کوئی مُستقل وجود نہیں ہے۔ مغزِ سر کا فعل مُعطّل ہو جانے پر ذہن و شعور بھی مِٹ مٹا کر رہ جاتے ہیں۔

اُزبک

مشہور تاتاری قبیلہ جس کے خان شاہی بیگ نے بابر کو فرغانہ اور سمرقند سے نکال دیا تھا۔ بعد میں کئی اُزبک شہسوار ہندوستان میں آکر مغلوں کی فوج میں بھرتی ہوتے رہے۔ یہ لوگ بڑے سرکش اور شوریدہ پُشت تھے۔ پنجابی میں اُجبک احمق کو کہتے ہیں۔

اَزلی گناہ

اَزلی گناہ کا تصوّر کلیسیائے رُوم کے اہم عقائد میں سے ہے اور ولی آگسٹائن سے منسوب ہے۔ اس کی رُو سے آدم اور حوّا نے حُکمِ خُداوندی سے سرتابی کر کے جو گُناہ کیا تھا وہ ہر بچّے کو ورثے میں ملتا ہے یعنی ہر شخص پیدائشی گُناہ گار ہوتا ہے۔ جناب مسیح پر ایمان لانے ہی سے اِس سے نجات حاصل ہوسکتی ہے کیوں کہ وہ منجّی ہیں۔ کلیسیائے رُوم کے آباء نے آدم اور حوّا کے سیب کھانے کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ سیب بکارت کی علامت ہے جو حوّا نے شیطان کے بہکانے پر آدم کو پیش کی تھی گویا جنسی ملاپ ہی وہ اَزلی گُناہ ہے جو آدم اور حوّا سے سرزد ہوا تھا۔ اِس لئے اِس سے اِجتناب ضروری ہے چنانچہ رومن کیتھولک پادری اور راہبات تجرّد کی زندگی گذارنے کا عہد کرتے ہیں۔ جنسی ملاپ کے ساتھ گُناہ کا تصوّر وابستہ کرنے سے عیسائی شدید اِحساسِ گُناہ میں مبتلا ہو گئے جو اُن کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر چکا ہے اور جس سے وہ جدید دَور کی جنسی بے راہ روی کے باوجود نجات نہیں پا سکے۔

اِستقراء

اِستقراء کے لغوی معنی ہیں جستجوئے بلیغ کرنا۔ منطق کی اِصطلاح میں اِس کا مطلب ہے حقائق کے کامل مشاہدے کے بعد کُلیّات کا اِستخراج کرنا۔ اِس کے برعکس قیاسی منطق میں پہلے کُلیّات

قائم کئے جاتے ہیں اور اُن کے حوالے سے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اِن کا فرق ایک مثال سے واضح ہوگا۔ فرض کیجیے کہ ایک ٹوکری میں سیب ہیں۔ ہم نے دیکھنا ہے کہ یہ سیب تازہ ہیں یا گلے سڑے ہوئے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ٹوکری کے اوپر کے دو چار سیب دیکھ کر اپنی رائے قائم کرلیں۔ اوپر کے سیب دیکھنے میں تازہ دکھائی دیں تو ہم قیاس کرلیں کہ سارے ہی سیب تازہ ہوں گے۔ یہ منطق قیاسی کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم ٹوکری کو اُلٹ دیں اور ایک ایک سیب کو غور سے دیکھیں۔ اگر سارے سیب تازہ ہوں تو ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ یہ ٹوکری تازہ سیبوں کی ہے۔ اِس میں گلے سڑے سیب نکل آئے تو ہم اِس کے بارے میں یہ رائے قائم نہیں کر سکیں گے۔ یہی اِستقراء کا طریقہ ہے۔ قیاسی منطق ارسطو نے وضع کی تھی۔ اُس کا یہ قضیہ معلومِ عوام ہے۔

تمام اِنسان فانی ہیں

سُقراط اِنسان ہے

لہٰذا سُقراط فانی ہے

اِس میں مُشکل یہ ہے کہ کُلیّہ پہلے اختیار کیا جاتا ہے اور اِستدلال بعد میں کیا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سارے کُلیے محولّہ بالا کُلیے کی طرح مُحکم ہوں اِس لئے اِحتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پہلے دقتِ مُشاہدہ سے کام لیں اور اِس طرح جو حقائق سامنے آئیں اُن کی بِنا پر کُلیّہ قائم کریں۔ یہی طریقہ سائنس کا بھی ہے۔ اِسی بِنا پر فرانسس بیکن نے اِستقراء پر زور دیا تھا اور ارسطو کی منطقِ قیاسی کو رد کر دیا تھا کیوں کہ بقول اُس کے قیاس سے علمی تحقیق کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اہلِ تحقیق نے فرانسس بیکن کے بعد اِستقراء کو اپنا لیا اور قیاسی منطق کو فرسودہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ لیکن قیاس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض سائنس دانوں نے قیاس کی بنا پر تحقیق کا آغاز کیا جو بعد میں درست ثابت ہوا۔ اتنا ضرور ہے کہ اِستقراء قیاس سے زیادہ قابلِ اعتماد طریقۂ جستجو ہے کہ اِس میں غلطی اور سہو کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی اور اِس سے اخذ کئے ہوئے نتائج کی صحت کو بر

کہیں جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

اِسرائیل

یہ لقب جناب یعقوب کا ہے اور اس کا معنیٰ ہے خُدا پر غالب آنے والا۔ عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے کہ جناب یعقوب نے خُدا سے کُشتی لڑی تھی اور اُسے عاجز کر دیا تھا اِس لیئے اُنہیں اِسرائیل کہا گیا۔ جناب یعقوب کے بارہ بیٹوں کی اولاد بنی اِسرائیل کہلائی جب کہ اِن کے بھائی اسمٰعیل کی اولاد کو بنو اسمٰعیل کہا گیا۔ قریش مکہ بنو اسمٰعیل تھے۔

اُسلوبِ بیان

لکھنے والے کا ذہن صاف ہو گا تو اُس کا اُسلوب بیان بھی صاف اور عام فہم ہو گا۔ پراگندہ دماغ آدمی کی تحریر اُلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ شوپنہائر کا قول ہے "سلیس اور سادہ زبان میں نادر نکتے بیان کرنا یہ ہے اسلوبِ بیان۔" کسی شخص کے اسلوبِ بیان سے اُس کی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن اُدبا کی تحریر خطیبانہ ہو اُن کے ہاں جدّتِ افکار کی کمی ہوتی ہے جس پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ مرصّع تراکیب استعمال کرتے ہیں۔

آسمان

آس: چکّی، مان: مانند۔ یعنی چکّی کی مانند پھرنے والا۔ قدیم زمانے کے ہیئت دانوں کے خیال میں آسمان چکّر کھاتے ہیں اور انسان کے حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گردشِ فلک اور چرخِ چنبری کی تراکیب اِسی سے یادگار ہیں۔ آسمان آریا اقوام کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ رِگ وید دیا اوہ (بعد کا وارونہ) آسمان دیوتا تھا۔ دیا اوہ کا معنیٰ ہے دکھائی دینے والا آسمان۔ وارونہ یونانیوں کا اورے نس بن گیا۔ بعد میں عیسائی خُدا کو آسمانی باپ کہنے لگے۔ مغل اپنے آسمان دیوتا کو تنگری کہتے تھے جس کا معنیٰ ہے "نیلا آسمان"۔ اُن کے خیال میں تنگری رُوحوں کا مسکن ہے۔

اِسکیمو

اِسکیمو کا لغوی معنیٰ ہے "کچا گوشت کھانے والا"۔

آسن

سمادھی کی نشست: جنسی اختلاط کے مختلف طریقوں کو بھی آسن یا بندھ کہا جاتا ہے۔ پنڈت وتسیاین اور شیخ نفزاوی نے کم و بیش بتیس آسنوں کی تفصیل دی ہے۔

آسیب

بد ارواح جن کی پکڑ سے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ یہ توہم دُنیا بھر کی اقوام میں پایا جاتا ہے آسیب کو دفع کرنے کے طریقے بھی ملتے جلتے ہیں۔ ہمارے ہاں جس عورت پر آسیب کا سایہ پڑ جائے اُس کا نہان (غسل) کرایا جاتا ہے۔ عورتیں مٹی کے سات کورے برتنوں میں سات کنوؤں سے پانی بھر لاتی ہیں جس میں کئی پیڑوں کے پتے بھگوئے جاتے ہیں۔ ان برتنوں کو سُرخ رنگ کی صافیوں سے ڈھک دیتی ہیں۔ پھر آسیب زدہ عورت کو چوکی پر بٹھاتی ہیں اور اُس کے سر پر سُرخ رنگ کی چادر تان دی جاتی ہے۔ اس چادر میں سے پانی اُنڈیل کر عورت کو نہلاتی ہیں۔ اس کے بعد عورت کو کسی دریا یا تالاب کے کنارے جا کر غسل دیا جاتا ہے۔ نہان کے دوران میں آسیب اُتارنے والی عورت پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ زور شور سے اپنا سر ہلانے اور گھمانے لگتی ہے۔ اس کے ہوش میں آنے پر مریضہ کا آسیب بھی دفع ہو جاتا ہے۔

اشتراکیت

اشتراکیت کا مطلب ہے ملکی پیداوار کی منصفانہ تقسیم یا دوسرے الفاظ میں شخصی املاک کا خاتمہ کر کے اجتماعی ملکیت کا نفاذ عمل میں لانا تاکہ پیداواری وسائل پر افراد کا تصرف ختم کر کے استحصال کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اشتراکیت یا اشتمالیت کا تصور نیا نہیں ہے۔ علم الانسان کے طلبہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ ماقبل تاریخ کے شکار کے زمانے میں قدیم اشتمالی معاشرہ ابتدائی صورت میں موجود تھا۔ زرعی انقلاب کے بعد ریاست معرض وجود میں آئی اور چند طاقت ور طالع آزماؤں نے اُس پر قبضہ کر کے ایسے قوانین وضع کیے جن سے اُن کے اقتدار کا تحفظ مقصود تھا۔ جنگی قیدیوں کو جان سے مار دینے کی بجائے اُنہیں غلام بنا کر گھروں اور کھیتوں میں کام لینے لگے۔ غلامی کا یہ دور کئی صدیوں پر محیط ہے۔ اس کے بعد

جاگیرداری نظامِ معاشرہ صُورت پذیر ہوا جو صنعتی انقلاب تک دُنیا کے بیشتر ممالک میں قائم رہا۔ سائنس کی ترقی اور صنعت کاری کے ساتھ پیداواری وسائل بدل گئے لیکن کارخانہ داروں نے پیداوار کے پُرانے علائق کو باقی و برقرار رکھا جس سے آقا اور غلام یا جاگیردار اور مُزارعہ کا رشتہ، کارخانہ دار اور مزدور کے رشتے میں بدل گیا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ پیداواری قوتوں کو پوری طرح پھلنے پھُولنے کا موقع دیا جاتا اور مزدوروں کو بھی سائنس اور صنعت کے برکات میں برابر کا شریک کرلیا جاتا لیکن صنعت کاروں اور ساہوکاروں کی ہوسِ زر مانع ہوئی اور مزدوروں کا اِستحصال جاری رہا۔ انیسویں صدی میں یورپ کے صنعت کاروں کو اپنی مصنوعات کی فروخت اور کارخانوں کے لئے کچّا مواد فراہم کرنے کے لئے منڈیوں اور نو آبادیوں کی تلاش ہوئی چنانچہ اہلِ مغرب نے ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک پر جارحانہ تاخت و تاراج کی۔ اِن نو آبادیوں میں مشنری بھیجے گئے تاکہ وہ ملکیوں کو عیسائی بنالیں۔ خیال یہ تھا کہ اِس طرح ہم مذہبی کے ناطے سے وہ اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے۔ نو آبادیوں کی لُوٹ کھسوٹ اور بندر بانٹ پر اقوامِ مغرب ایک دوسری کی مخالف ہوگئیں اور اپنے اپنے معاشی مفادات کے تحفّظ کے لئے جنگ کی آگ بھڑکا دی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد پچاس سے زیادہ نو آزاد اقوام دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئیں۔ اہلِ مغرب کو انہیں سیاسی آزادی تو دینا پڑی لیکن اُنہوں نے مالی اِمداد کے نام پر اُنہیں بڑی بڑی رقموں کے قرضے دیئے اور اِس طرح لوہے کی زنجیروں کی بجائے انہیں سونے کی زنجیریں پہنا دیں۔ ظاہر ہے کہ مُعاشی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہوتی ہے چنانچہ اِمداد کے نام پر مغرب کے سامراجی ساہوکار اور اِجارہ دار نو آزاد قوموں کا بدستور اِستحصال کر رہے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے فرانسیسی اہلِ علم دی مابلی، دی موریلی، میزلیر اور دولباخ نے سلاطین اور پادریوں کے گٹھ جوڑ کی جانب توجّہ دلائی اور کہا کہ یہ طبقات مل کر عوام کا اِستحصال کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے متفقہ طور پر ذاتی اِملاک کو معاشرے کی تمام بُرائیوں کی جڑ قرار دیا۔ دیدرو نے کہا کہ جب تک آخری بادشاہ کو آخری پادری کی انتڑیوں سے پھانسی نہیں دے دی جائے گی انسان کے مصائب کا

خاتمہ نہیں ہوگا۔ میزلیر اپنی کتاب "عہد نامہ" میں کہتا ہے کہ موجودہ معاشرتی نظام شر پر مبنی ہے جس میں کروڑوں عوام فاقہ کشی کر رہے ہیں جب کہ گنتی کے چند اُمراء انہیں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ شخصی املاک چوری ہے، رہزنی ہے۔ مذہب، قانون اور تعلیم و تدریس کے اداروں سے اِس لوٹ کھسوٹ کے جواز اور اِس شرمناک ادارے کے تحفظ کا کام لیا جا رہا ہے۔ ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جس سے عوام کے خلاف اِس سازش کا خاتمہ کر دیا جائے۔ دی مابلی نے لکھا "معاشرے کی تمام برائیوں کی جڑ شخصی املاک ہے اور انسان اشتمالی معاشرے ہی میں نیکی اور خوشی کی زندگی گذار سکتا ہے۔" اُس نے اپنی ایک کتاب "قانونِ فطرت" میں اشتمالی نصب العین کی تشریح کی ہے۔ موریلی کہتا ہے کہ انسان بالطبع نیک ہے، پدری اور مادری جبلتیں اُسے نیک کاموں کی جانب مائل کرتی ہیں۔ مقتدر طبقے کے بنائے ہوئے قوانین نے شخصی املاک کا ادارہ مستحکم کیا جس کے باعث انسان میں خودنمائی، تکبر، جاہ طلبی، ایذا رسانی اور ریاکاری کے معائب پیدا ہو گئے اور تعمیری جبلتیں دب کر رہ گئیں۔ حصولِ املاک کی ہوس نے تمام اخلاقی معائب کو تقویت دی ہے اور انسان جو بالطبع نیک تھا خود غرض اور قابوچی بن گیا ہے۔ اگر انسان لالچ، حسد، رقابت اور منافرت سے مبرّا ہوتا جنھیں شخصی املاک نے ہوا دی ہے تو وہ امن اور چین کی زندگی گذار سکتا تھا۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ شخصی املاک کو صرف اُن اشیا تک محدود کر دیا جائے جو کسی فرد کی ذاتی ضروریات ہوں اور ہر قسم کی پیداوار کو ذخیرہ کر کے اُسے شہریوں میں اُن کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جائے۔ ہر صحت مند شخص سے کام لیا جائے اور بے کار طفیل خواروں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ موریلی کی اِس کتاب سے وہ اصول لیا گیا ہے جو بعد میں اشتمالی انقلاب کا نعرہ بن گیا ــــ "ہر ایک سے اُس کی قابلیت کے مطابق، ہر ایک کو اُس کی ضروریات کے مطابق۔"

دولباخ نے اپنی کتاب "عیسائیت کا کچا چٹھا" میں کلیسا اور ریاست کے اتحاد پر کڑی تنقید کی۔ اُس نے مذہب کو عوام کی افیون کہہ کر کارل مارکس کی پیش قیاسی کی۔ وہ کہتا ہے کہ حکّام عوام کے توہمات سے فائدہ اٹھا کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں۔ مذہب عوام کو غیر مرئی قوتوں کا خوف

دلا کر اُنہیں اُس جور و ستم کو خاموشی سے برداشت کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے جو مربیٔ قوانین اُن پر ڈھاتے ہیں۔ اُس نے ضمیر کو پولیس کا خوف کہہ کر فرائڈ کی پیش قیاسی کی۔ وہ کہتا ہے کہ "ہم دیکھتے ہیں کہ امیروں کو ضمیر کی خلش کبھی پریشان نہیں کرتی نہ اُنہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے عوام پر ظلم کر کے اپنی دولت اکٹھی کی ہے۔ دولباخ نے لاک اور کارل مارکس کی طرح کہا کہ محنت ہی تمام دولت کا ماخذ ہے۔

کارل مارکس کے پیش روؤں میں آدم سمتھ اور ریکارڈو نے بھی محنت ہی کو تمام دولت کا مصدر قرار دیا تھا۔ رابرٹ اووِن نے صنعت کاروں اور مزدوروں کے تعلقات میں امداد باہمی کے اصول پر شفا ہمیت کرنے کی تلقین کی۔ سیں سائمن نے معاشرتی زندگی کے ارتقاء میں سائنس اور صنعت کاری کی اہمیت واضح کی۔ گویا اشتمالیت کے عناصر ترکیبی کسی نہ کسی صورت میں شروع سے موجود رہے ہیں۔ کارل مارکس کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اشتمالیت کے مثالی تصوّر کو حقیقی اور قابلِ عمل بنا دیا اور مارکسیت کی صورت میں ایک محکم منطقی نظام پیش کیا۔ اُس نے تاریخ اور معاشرے کے ارتقاء کی مادی توجیہہ کی اور طبقاتی کشمکش اور فاضل قدر جیسے معروضی قوانین دریافت کیے جس نے اُس کے نظریے کو سائنٹیفک بنا دیا۔ یاد رہے کہ اشتمالیت نظریہ بھی ہے اور عمل بھی ہے۔ اِس میں نظریے کو عمل سے اور عمل کو نظریے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے مارکس نے کہا ہے کہ فلاسفہ کا کام کائنات کی تشریح کرنا ہی نہیں ہے بلکہ معاشرے کو بدل دینا بھی ہے۔

اِشراق

باطن کو نورِ حق سے روشن کرنا۔ افلاطون کی مثالیّت ایک عقلیاتی نظامِ فکر ہے لیکن اُس کے اِشراق پر فیثاغورس کے باطنی نظریے کا اثر پڑتا ہے جو وجد و حال پر مبنی تھا۔ اُس کے اِشراقی افکار کو فلاطینوس نے ازسرِ نو مُرتّب کر کے نو اِشراقیت کا فلسفہ پیش کیا تھا۔ مسلمانوں میں شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول کا مسلک اِشراق ہی تھا۔ اُنہیں صلاح الدین ایوبی نے کفر و زندقہ کے الزام میں قتل کرا دیا۔

اُشیرا

مُقدّس کھمبا جو مصر اور کنعان کے معبدوں کے صحن میں گاڑتے تھے۔ اُشیرا لنگ کی علامت تھا۔

یہودی اپنے معبدوں میں صدیوں تک اُشیرات نصب کرتے رہے اور ان کی تقدیس کرتے رہے۔ گرجوں کے مینارے اِنہی سے یادگار ہیں۔

اِضافیت

جدید طبیعیات کا ایک اِنقلابی نظریہ جس نے زمان اور مکان کے بارے میں روائتی مفروضات بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ گلیلیو اور نیوٹن کے خیال میں زمان اور مکان ایک دوسرے سے علاحدہ مستقل صُورت میں موجود ہیں۔ نیوٹن کے معاصر لائب نِٹز نے کہا کہ زمان اور مکان متغائر نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت اِضافی ہے۔ منکوسکی، لورنٹز اور آئن شٹائن کی تحقیق نے لائب نِٹز کی تصدیق کی ہے۔ اُنہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ زمان مکان/زمان اِکائی کی چوتھی بُعد ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی ایک آفاقی زمان نہیں رہا بلکہ وہ مکان/زمان اِکائی کی چوتھی بُعد بن گیا ہے۔ عالم چار ابعاد کی اِکائی ہے۔ مکان/زمان اِکائی کے تین ابعاد مکانی ہیں اور چوتھی بُعد زمانی ہے۔ گویا اضافیت کی رُو سے زمان اور مکان ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں بلکہ باہم دگر اضافی طور پر موجود ہیں۔ اضافیت نے نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ آئن شٹائن نے اِضافیت کے چھوٹے نظریے میں ثابت کیا ہے کہ روشنی کی رفتار ـــــ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ـــــ سے زیادہ رفتار کسی شے کی نہیں ہو سکتی۔

اِعادۂ شباب

از سرِ نَو جوان ہونے کا شوق قدیم زمانے سے اِنسان کے دل میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ اِس مقصد کے لئے رومہ میں اکھاڑوں میں لڑ کر مرنے والے جوانوں کے زخموں سے اُبلتا ہوا خون پیا جاتا تھا۔ اُمراء کی عورتیں اپنے شباب کو بحال رکھنے کے لئے جوان لڑکیوں کے خُون میں نہاتی رہی ہیں ہنگری کی ایک شہزادی باتھوری اپنی جوان لونڈیوں کو ذبح کر کے اُن کے خُون میں نہایا کرتی تھی۔ بعض اقوام میں اس مقصد کے لئے بُڈھے جوان عورتوں کا دُودھ پیا کرتے تھے۔ آیور ویدک میں کھوئی ہوئی جوانی کو واپس لانے کے لئے کایا کلپ کا طریقہ رائج ہے یعنی بُڈھا ایک مدت تک اندر گھُسا بیٹھا رہتا ہے اور خاص طریقے سے تیار کئے ہوئے کھانے اور مشروبات استعمال کرتا ہے۔ طب یُونانی میں یاقوتی،

انوشدارو اور ماء اللحم موثر خیال کئے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے بعض نسخوں میں بکرے اور بیل کے آلاتِ تناسل بھی ملا کر کھلائے جاتے ہیں۔ چین میں تاؤمت والے نوخیز کنواریوں کو خلوت میں بلا کر بغور رفتہ کو آواز دیا کرتے تھے۔ عہد نامۂ قدیم میں آیا ہے کہ حضرت داؤدؑ بڈھے اور کہن سال ہوئے تو اُن کا نکاح ایک دوشیزہ شونمیت ابی شاگ سے کیا گیا تاکہ اُن کے بدن میں شباب کی حرارت دوبارہ رواں کی جا سکے۔ اس لڑکی کے نام پر جنسی نفسیات کی اصطلاح "شونمیت کا مسلک" وضع کی گئی جس کا مطلب ہے جوان لڑکیوں کو خلوت میں بلا کر اعادۂ شباب کرنا۔ حافظ شیرازی سے

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر　　صبحدم تا ز کنارِ تو جواں برخیزم

کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر وورنوف نے بندر کے غدود لگا کر بوڑھوں کو جوان کرنے کے تجربات کئے تھے جو ناکام ثابت ہوئے آج کل مغرب میں ماں اپنی بیٹی اور باپ اپنے بیٹے کا ہم عمر دکھائی دینے کے لئے مذبوحی حرکتیں کر رہے ہیں۔

اعداد

اعداد کا فلسفہ فیثا غورس سے یادگار ہے جو اعداد سے حساب لگا کر پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ جفت اعداد شر کی علامتیں ہیں اور مونث ہیں جب کہ طاق اعداد خیر کی علامات ہیں اور مذکر ہیں۔ ۲ کا ہندسہ سب سے زیادہ شر آمیز ہے کیوں کہ یہ سب سے پہلے ایک سے علاحدہ ہوا تھا۔ ایک خدا کا عدد ہے جب کہ ۲ اُس کے دشمن شیطان کا عدد ہے۔ ۳ باپ، ماں اور بیٹے کی تثلیث کا نشان ہے۔ اوزیرس، آئسس اور ہورس کی تثلیث مصرِ قدیم میں موجود تھی جو بعد میں عیسائیوں نے اپنا لی۔ ۳ جنسی عدد ہے اور مرد کے آلاتِ تناسل کی علامت ہے۔ یہی تکون عورت کی فرج کی علامت بھی ہے۔ ۴ کا ہندسہ مربع ہے جو روح اور ہیولیٰ کی علامت ہے: چاند کے چار مراحل، مہینے کے چار ہفتے، سال کے چار موسم، چار اطراف، چار کیفیات (گرم، سرد، مرطوب، خشک)، چار اخلاط (دم، بلغم، صفرا، سودا)، بہشت کے چار دریا، چار بڑے فرشتے۔ ۵ کا عدد نظرِ بد اور آفات سے محفوظ رکھتا ہے۔ پرانے زمانے میں انسان کے پنجے کا نشان مقدس سمجھا جاتا تھا۔ مغلوں کے ہاں خاص فرامین پر بادشاہ اپنے ہاتھ کا پنجہ خون یا صندل میں ڈبو کر لگاتے تھے۔ پنج تن، پنج پیر میں اس کا تقدس کار فرما ہے۔ عرب اور ایرانی اپنے قالینوں

میں پانچ پانچ پتیوں کے پھول کاڑھتے ہیں تاکہ وہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ تعویذوں میں عموماً پانچ خانے رکھے جاتے ہیں۔ سِکھوں کے پنج پیارے، پانچ کّکّے، جشن ابدال میں گورو صاحب کے پنجے کا نشان بھی قابلِ غور ہیں۔ ۶ کا عدد جُفت ہے، عورت کی محبت اور گرہست کی علامت ہے۔ فیثا غورسیوں کے یہاں ۷ کا عدد نہایت مُقدّس تھا۔ وہ اسے سات سیاروں کی علامت مانتے تھے۔ ہفتے کے سات دنوں کے نام بابل والوں نے سات سیاروں کے نام پر رکھے تھے۔ یہی حال ہندوؤں کا تھا؛ اتوار (آدِت یعنی سورج کا دن) سوم وار (چاند کا دن) منگل (مریخ کا دن) بُدھ (عطارد کا دن) ویروار (برہس پتی یا مشتری کا دن) شُکّر (زُہرہ دیوی کا دن) سنیچر (زُحل کا دن)، سپتک کے سات سُر (کھرج، رکھب، گاندھار، مدھیم، پنچم، دھیوت، نکھاد)، یہودیوں کے مُقدّس شمع دان کی سات شاخیں، بنات النعش کے سات ستارے، سات جزیرے، اِسماعیلیوں کے سات اِمام اس عدد کے تقدّس کی شہادت دیتے ہیں۔ ہپوقریطیس (بقراط) کہتا ہے کہ اپنی طلسماتی قوّت کے باعث یہ عدد تمام اُمور کی تکمیل کا باعث ہوتا ہے، حیات بخش ہے اور تمام موجودات کو متاثر کرتا ہے۔ ۷ کی طرح ۱۲ کے عدد کو بھی بارہ بُرجوں کی رعایت سے مُتبرّک مانتے تھے۔ یہودیوں کے بارہ قبائل، عیسائیوں کے بارہ اولیاء، اِثنا عشریوں کے بارہ اِمام۔ ۴۰ کے عدد کو بھی سِرّیت اور عرفان میں اہمیت دی جاتی تھی۔ صُوفی اور ملنگ چالیس دن کا چِلّہ کاٹ کر جنوں کو اپنے قابو میں لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے چالیس دن کوہِ سینا پر کاٹے تھے۔ مُردے کی آخری رسوم چہلم پر ختم ہوتی ہیں۔ ہندوؤں کی جوتش میں ۵۲ اور ۸۴ کے اعداد بھی سعد ہیں۔ ۵۲ پیر، چوراسی سِدھ، چوراسی لاکھ جنم، سب منحوس اور نامبارک عدد ۱۳ کا ہے جسے شیطانی عدد کہا جاتا ہے۔ جناب عیسیٰ کو اُن کے ۱۳ ویں حواری یہودا اسکریوطی نے گرفتار کروایا تھا۔ ایرانی گنتی کر رہے ہوں تو ۱۳ کا عدد مُنہ سے نہیں نکالتے۔ دوازدہ کے بعد زیاد کہہ کر ۱۴ پر چلے جاتے ہیں۔ آج کل یورپ میں یہ توہّم عام ہے کہ کسی مجلس یا دعوت میں ۱۳ ویں کُرسی پر بیٹھنے والا شخص چند روز کے بعد مر جاتا ہے۔

آفتاب

آفتاب کو اِنسان قدیم زمانے سے اپنا مہربان باپ اور سچّا دوست سمجھتا رہا ہے کیوں کہ وہ اُسے

رات کی بھیانک تاریکیوں سے نجات دلاتا ہے چنانچہ اقوامِ عالم نے اپنی دیومالا میں اُسے خداوند خدا بنا لیا جو حیات بخش ہے، پروردگار ہے۔ سُمیریا کا شمش، بابل کا بعل، کارتھیج کا مولک، شام کا مردوک، فلسطینیوں کا ایل، مصریوں کا رع اور ہورس، یونانیوں کا اپالو، میکسیکو کا ہوئی ٹو لوپکٹی، ایرانیوں کا متھرا، ہندوؤں کا مِترا، آدِت، سُوتر، دوسوت، وِشنو سب آفتاب دیوتا ہی تھے۔ ان کے بھجنوں میں آفتاب کو زندہ و پائندہ، خِرد بخش اور نیّرِ اعظم کہا گیا ہے۔ ویدوں میں اِس کے القاب ہیں دِنکر (دن کو لانے والا) بھاسکر (روشنی کا خالق) گرہ پتی (ستاروں کا آقا) کرم ساکھشی (انسان کے اعمال کا مشاہدہ کرنے والا) وغیرہ۔

آفتاب دانش، صداقت، روشنی اور نیکی کی علامت بن گیا تھا۔ ہندوؤں کے مقدس ترین منتر گایتری میں آفتاب ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

"آؤ ہم یزدانی حیات بخش آفتاب کے عظیم جلال پر تعمق کریں وہ ہمارے فہم کو روشن کرے"

غاروں کے انسان کو بخوبی معلوم تھا کہ اُس کی زندگی کا انحصار آفتاب پر ہے اِس لئے جب شام کو سُورج غروب ہو جاتا تو اس کے دل میں ہَول اُٹھتا کہ اگر وہ واپس نہ آیا تو کیا ہوگا۔ جاڑے میں جب آفتاب جنوب کی طرف سرکنے لگتا تو وہ دہل جاتا کہ کہیں وہ غائب ہی نہ ہو جائے۔ چنانچہ آفتاب کو فنا سے بچانے، لوٹانے اور اُس کی روشنی کو بحال رکھنے کے لئے رسُومِ عبادت ادا کی جاتی تھیں اور کسی انسان کی یا جانور کی قربانی دی جاتی تھی۔ قدیم انسان خُون کو زندگی اور حرارت کی علامت سمجھتا تھا اِس لئے خیال یہ تھا کہ قربان گاہوں پر بہائے جانے والے خُون سے آفتاب کی روشنی اور حرارت کو تقویت بہم پہنچے گی۔ معبدوں کے دروازے مشرق کی طرف رکھے جاتے تھے تاکہ سُورج کی پہلی شعاعیں دیوتاؤں پر پڑیں۔ ہندوؤں کے ہاں آج بھی مندروں کے دروازے مشرق ہی کی جانب رکھے جاتے ہیں۔ صابئیت یا سیارہ پرستی دُنیا کا قدیم ترین منظّم مذہب ہے۔ اِس میں سات سیاروں کی پُوجا کی جاتی تھی۔ آفتاب کو ان سب کا سردار مانتے تھے اور نیّرِ اعظم کہتے تھے۔ پروہت صبح، دوپہر اور شام کو آفتاب کے نام جپتے تھے اور سوریہ نمسکار کرتے تھے۔ ایران میں آفتاب کے پجاریوں کو شمسیہ کہا جاتا تھا۔ آگ کی تقدیس بھی اُسے آفتاب کی علامت سمجھ کر کی جاتی تھی۔ اکبر کا دینِ الٰہی شمسیہ مذہب ہی کی ایک شاخ تھا۔ اُس نے مجوسی علماء اردشیر اور

آزر ٹیوان کو ایران سے بلوایا اور آفتاب کی پرستش کے طریقے اُن سے سیکھے۔ اسی طرح ہندوؤں سے اُس نے آفتاب کے ایک ہزار نام سیکھے جو ہر روز وہ جپتا تھا۔ ایک جین عالم بھان چندر اپادھیائے نے اُس کے لئے ایک کتاب سوریہ سہاشترا لکھی جس میں سوریہ پوجا کے طریقے درج تھے۔ ملا شیری نے اسی انداز میں مثنوی ہزار شعاع تصنیف کی۔

بابل، عراق اور ایران کے صابئین نے آفتاب کی گردش کو برقرار رکھنے کے لئے عبادت کی رسمیں وضع کیں۔ بابل کے صابئین دن رات میں سات نمازیں پڑھتے تھے جن کے اوقات آفتاب کی مختلف منازل سے وابستہ تھے۔ طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب مشرق کی جانب اُجالے کی مدہم لکیر پھیل جاتی صابئین کے معبدوں میں گھڑیال بجائے جاتے اور پروہت نماز پڑھتے جس میں رکوع و سجود کرتے تھے۔ اس میں جو بھجن پڑھے جاتے اُن میں آفتاب کی ستائش کی جاتی تھی۔ طلوعِ آفتاب پر شکرانے کی نماز پڑھتے تھے اور آفتاب کے سامنے سجدے میں گر پڑتے تھے۔ تیسری اور چوتھی نماز آفتاب کے زوال کے اوقات میں ادا کی جاتی تھی جس میں اس تشویش کا اظہار مقصود تھا کہ آفتاب مغرب میں ڈوب جائے گا۔ غروبِ آفتاب اور آدھی رات کی نمازیں آفتاب کے ظہور کی دعاؤں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ آخری نماز آدھی رات گذر جانے کے بعد ادا کرتے تھے اور اس میں دُعا مانگتے تھے کہ آفتاب تاریکی کے عفریت کے چنگل سے آزاد ہو کر دوبارہ طلوع ہو۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کی نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ یہودیوں کی کتاب تالمود میں صبح، دوپہر اور شام تین نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ مجوسی پانچ نمازیں پڑھتے ہیں اور انہیں پنجگاہ (گاہ یعنی وقتِ نماز) کہتے ہیں۔ ان نمازوں میں گا تھا سے آفتاب دیوتا متھرا کی حیاتِ جاوید کے لئے بھجن پڑھتے ہیں۔ متھرا کی دُعا کو نیائش اور آفتاب کی دعا کو ستائش کہتے ہیں۔ ان دعاؤں کے پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ آفتاب کی روشنی اور حرارت برقرار رہے۔ لفظ نماز پہلوی زبان سے لیا گیا ہے۔ فارسی میں نماز کو گاہ کہتے ہیں۔

سواستکا (卐) جو قدیم آریائی نشان ہے سورج ہی کی علامت ہے کلیسیائے رُوم میں بھی آفتاب پرستی کے کئی شعائر باقی ہیں مثلاً راہب اپنے سر کے بال منڈوا کر جو چاند سی بناتے ہیں وہ

قرصِ آفتاب کی علامت ہے۔ تصویروں میں جناب عیسیٰ اور اولیاء کے سروں کے گرد جو ہالہ دکھاتے ہیں وہ بھی اِسی نوع کی ایک علامت ہے۔

افرودائتی

یونانی دیومالا کی حُسن و عشق کی دیوی جو زمین، دوزِ عالم کے دیوتا ہیفے سٹس کی زوجہ تھی لیکن دوسرے دیوتاؤں اور انسانوں سے بھی معاشقے کرتی تھی عشق کا دیوتا کیوپڈ اسی کا بیٹا تھا جو اپنے بے پناہ تیروں سے اکثر اپنی ماں کو بھی مجروح کر دیتا تھا۔ اِس روایت میں یہ حقیقت مرموز ہے کہ عشق حُسن ہی کا زائیدہ ہے، جہاں حُسن نہ ہو وہاں عشق بھی نہیں ہوگا۔ افرودائتی جزیرہ قبرص کے ساحل سمندر سے جھاگ میں سے نمودار ہوئی تھی اس لئے اِسے سپرین بھی کہتے ہیں۔ افرو یونانی زبان میں جھاگ کو کہتے ہیں چنانچہ اِس کے نام کا مطلب ہے "جھاگ کی بیٹی" کسبیوں کی سرپرست دیوی ہے، اِس کے معبد میں جنسی ملاپ کی عام اجازت تھی۔ ہنس، چڑیا، فاختہ، سرو، گلاب اور سیب اس کے علامتی پرندے اور پودے ہیں۔ اِسی کے نام پر مقوی اور ممسک دواؤں کو افروڈیسیک کہا جاتا ہے۔

اقدارِ اعلےٰ

جس بات یا شے میں ہم دلچسپی لیں اُس میں ہمارے لئے قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ اعلےٰ قدریں بقول افلاطون تین ہیں: صداقت، خیر، حُسن۔ سائنس دان اور فلاسفہ صداقت کی، مصلحین اِخلاق خیر کی اور فن کار حُسن کی ترجمانی کرتے ہیں۔

آکاش

عنصر جو ہندو ودوانوں کے خیال میں فضا کے خلا میں بھرا ہوا ہے۔

اکھاڑا

(۱) ناچ گانے کی مجلس۔ اندر دیوتا کا اکھاڑا جس میں گندھروں کے سازوں کی گت پر اپسرائیں بھاؤ بتا بتا کر ناچتی ہیں۔ ابوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتا ہے کہ اُمراء اور روساء کے محلوں میں تفریحِ طبع کے لئے راتوں کو اکھاڑا برپا ہوتا ہے جس میں اُن کی لونڈیاں اور پاتر ہی حصّہ لیتی ہیں۔ اُنہیں گانے بجانے اور

ناچ کی تعلیم دلائی جاتی ہے۔ چار حسین عورتیں ناچ کی پیش وائی کرتی ہیں اور چار گانا شروع کرتی ہیں۔ دو دو عورتیں پکھاوج اور اُپنگ بجاتی ہیں جب کہ ایک ایک رباب، وین اور جنتر کو چھیڑتی ہے۔ اس موقعے پر فانوس روشن کیئے جاتے ہیں۔ دو عورتیں ناچنے والیوں کے قریب کنول روشن کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بعض اکھاڑوں میں زیادہ عورتیں حصّہ لیتی ہیں۔ نوخیز لونڈیوں کو ناچ گانا سکھانے کے لیئے نٹ ملازم رکھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ لوگ خود اپنی لڑکیوں کو ناچ گانے کی تربیت دے کر روساء کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

(۲) جہاں لوگ مل بیٹھ کر افیم، چرس وغیرہ کا نشہ کرتے ہیں، سندھ میں اِسے دائرہ کہتے ہیں۔ پنجاب میں اکھاڑا پہلوانی کے ساتھ مخصوص ہے۔ شام کو پہلوان اکھاڑے میں زور آزمائی اور ورزش کرتے ہیں۔

اکیڈیمی

ایتھنز کے نواح میں ایک پُر فضا باغ تھا جس میں افلاطون فلسفے کا درس دیا کرتا تھا۔ آج کل یہ لفظ علماء کی جماعت کے لیئے مخصوص ہے۔

آگ

اِنسان دورِ وحشت میں آگ کی پوجا کیا کرتا تھا کیونکہ وہ اُسے جاڑے کی ٹھر سے محفوظ رکھتی تھی اور درندے بھی آگ کے الاؤ کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ رفتہ رفتہ آگ پر گوشت بھوننے کا رواج ہو گیا۔ پہلے پہل آگ آسمانی بجلی گرنے سے حاصل کی جاتی تھی پھر پتھر اور لکڑی کے ٹکڑوں کو آپس میں رگڑ کر آگ روشن کرنے لگے۔ آگ ہی سے دھاتوں کے زمانے کا آغاز ہوا اور صنعت و حرفت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ قدیم اِنسان آگ کو اپنا مہربان دوست سمجھ کر اُس کی تقدیس کرتا تھا اور اُس پر سوختنی قُربانیاں دیا کرتا تھا۔ کھیتی کی پہلی بالیں اور بھیڑوں بکریوں کے پلوٹھی کے بچے اُس کی بھینٹ کیئے جاتے تھے۔ ہندوؤں کا ہوم اِسی سے یادگار ہے جس میں گھی، چاول اور خوشبودار لکڑیاں آگ میں پھینک کر بھجن پڑھتے ہیں۔ مجوسی یا گبر آگ کو آفتاب کی علامت اور مظہرِ یزدانی سمجھ کر اسے مقدّس مانتے ہیں۔ اُن کے آتشکدوں میں آگ کبھی بجھنے نہیں پاتی۔ وہ دن میں تین بار اِس میں خوشبودار لکڑیاں ڈال کر گاتھا سے زمزمہ کرتے ہیں۔ یہی اُن کی نمازیں ہیں۔ یہودیوں نے سوختنی قُربانیاں دینے کی رسم کنعانیوں سے لی تھی۔ کنعانیوں اور کارتھیج والوں کے دیوتا مولک (یہ لفظ عربی

میں ملک بہ معنی بادشاہ یا آقا بن گیا) کے برنجی بُت کے سامنے ہمہ وقت آگ جلتی رہتی تھی اور اُس کے شکم میں شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔ قومی مصیبت کے وقت اُمرا اپنے ننھے مُنّے بچّے اس کی آگ میں پھینک کر نجات طلب کیا کرتے تھے۔ اُن کی چیخوں کو دبانے کے لئے زور زور سے دمامے پیٹے جاتے تھے اور نفیریاں بجائی جاتی تھیں۔ مائیں اپنے جگر گوشوں کو آگ میں بھسم ہوتے دیکھ کر حرفِ شکایت زبان پر نہیں لا سکتی تھیں نہ اُنہیں آنسو بہانے کی اجازت تھی۔ اکثر مذاہب میں آگ کے سامنے عہد و پیمان کئے جاتے تھے۔ آج بھی ہندوؤں کے یہاں دُلہا اور دُلہن آگ کے گرد سات پھیرے لیتے ہیں۔ اقوامِ عالم کی دیومالا میں آگ کو دیوتا مانا گیا ہے۔ رِگ وید میں اگنی آگ ہی کا دیوتا ہے۔ یونانی دیومالا کی ایک کہانی میں بتایا گیا ہے کہ پرومیتھس دیوتاؤں کے مسکن سے اِنسان کے لئے آگ چرا کر لایا تھا جس کی پاداش میں خُداوند خدا زیوس نے اُسے کوہ قاف کی ایک چٹان سے جکڑ دیا۔ ایک گِدھ ہر روز اُس کا کلیجا نوچا کرتا تھا۔ اِس موضوع پر یونان کے المیہ نگار اِسکیلس کی تمثیل مشہور ہے جس میں پرومیتھس کو ایک بطلِ جلیل کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے جو اِنسانوں کی بہبود کے لئے دیوتاؤں کا ستم برداشت کرتا ہے۔ وہ مردانہ وار عذاب جھیلتا ہے اور خداوند خدا زیوس کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔

اِلحاد

اِس لفظ کے لغوی معنی ہیں جھگڑا کرنا، ملحد جھگڑالو ہوا۔ فلسفے کی اصطلاح میں جو شخص حیات بعد موت یا بقائے روح کا منکر ہو اُسے ملحد کہتے ہیں۔ بقائے روح مذہب کا سنگِ بنیاد ہے لہٰذا اِس سے انکار گویا مذہب سے انکار ہے۔ اِسلامی تاریخ میں اسحٰق الراوندی، عمر خیام اور ابوالعلا معرّی مشہور ملاحدہ ہو گزرے ہیں۔

اُلجھنیں

تحلیلی نفسیات کی اِصطلاح میں شعور کے وہ ٹکڑے جو کسی شخص کی اذیت ناک ذہنی کشمکش کے باعث اپنی اصل سے منقطع ہو کر لاشعور میں چلے جائیں اور وہاں سے بھیس بدل بدل کر شعور پر اثر انداز ہوتے رہیں، اُلجھنیں کہلاتے ہیں۔ اُلجھن کی ترکیب ژُنگ نے وضع کی تھی اور اِس کی محولہ بالا تعریف بھی اُسی کی ہے۔ اُلجھنیں بعض حالات میں خللِ ذہن کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ جب کوئی ماہرِ نفسیات

تجزیۂ نفس سے کسی اُلجھن کی نشان دہی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ اُلجھن غائب ہو جاتی ہے اور اس کے سلبی اثرات بھی زائل ہو جاتے ہیں۔

اللہ

اَل اِلٰہ کا مرکب ہے۔ اِس کا معنیٰ ہے معبود۔ یہ لفظ اِسلام سے پہلے کے عرب شُعراء کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ کنعانی معبود کو اِل کہتے تھے۔ شامی اور عبرانی میں اِسے اِیل اور ایلوہیم (جمع ایلوا) کا نام دیا گیا۔ عربی میں اللہ کہا گیا۔ اللاّت اِس کی مونث ہے جس کا معنیٰ ہے ربّہ۔ جبرائیل، اِسرافیل وغیرہ ناموں میں اِیل بہ معنیٰ خداوند ہی آیا ہے۔

اَلموت

اس کا لغوی معنیٰ ہے "آشیانۂ عقاب"۔ یہ قزوین اور گیلان کے درمیان پہاڑ کی چوٹی پر حشیشین کا مضبوط قلعہ تھا جو حسن بن صباح نے تعمیر کرایا تھا اور جس میں اُس نے جنت بسائی تھی۔ رُکن الدین خور شاہ کے عہد حکومت میں ہلاکو خان نے اِسے فتح کر کے برباد کر دیا۔

اَلمیّہ

اَلمیّہ کا آغاز یونانی تمثیل سے ہوا۔ اسکیلس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز کو دُنیا کے عظیم اَلمیّہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسکیلس کا پرومیتھیس، سوفوکلیز کا ایڈیپس ریکس اور یوری پیڈیز کا ٹروجن عورتیں مشہور المیئے ہیں۔ المیّہ یا ٹریجیڈی کی ابتداء اُن گیتوں سے ہوئی تھی جو بکیس کے پجاری اُس کے تہوار پر گاتے تھے۔ یونانی المیّے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں کسی بطلِ جلیل کی آویزش تقدیر (یونانی اِسے موئرا کہتے تھے) سے دکھائی جاتی ہے۔ اُسے اپنے المناک انجام کا علم ہوتا ہے لیکن وہ تقدیر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا بلکہ مردانہ وار جدّوجہد کرتا ہوا موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اُس کی دلیرانہ کشمکش اور المناک موت سے ناظرین کے دلوں میں بقول ارسطو رحم اور خوف کے جذبات اُبھرتے ہیں جس سے اُن کے ذہن و قلب کی تنقیح ہو جاتی ہے۔ یونانی المیّے کا ہیرو بسا اوقات کوئی بادشاہ یا سردار ہوتا تھا۔ یونانیوں کے بعد رومہ کے تمثیل نگاروں نے بھی المیّے لکھے لیکن وہ یونانی المیّے کی بلندیوں تک نہ پہنچ

سکے۔ احیاء العلوم کے دور میں فرانس میں ریسین اور کورنیل اور برطانیہ میں شیکسپیئر نے عظیم المیے لکھے۔ ریسین کی فیدرے کو آدم سمتھ نے دنیا بھر کا عظیم ترین المیہ کہا ہے۔ شیکسپیئر کے المیے میکبتھ، ہیملٹ، کنگ لیئر، رومیو جولیٹ اور اوتھیلو نفسیاتی کشمکش پر مبنی ہیں۔ ان میں انسان کی آویزش مقدر کے علاوہ دوسرے انسانوں کے خلاف بھی دکھائی گئی ہے۔ جدید دور کے المیے میں انسان کی اپنی ذات کے ساتھ آویزش کا موضوع نمود پذیر ہوا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثالیں ابسن کی تمثیلیں ہیں۔ بہر صورت خارجی اور داخلی جبر کا شعور اور اس سے نجات پانے کی مردانہ وار مگر ناکام کوشش ہی المیے کا موضوع رہا ہے۔ ارسطو کے بعد نیٹشے کو المیے کا سب سے بڑا نقاد سمجھا جاتا ہے۔

اَمرد

مرد آہ سے ہے جس کا معنی ہے وہ چٹیل میدان جہاں سبزے کا نام و نشان نہ ہو۔ اَمرد سادہ عذار نوجوان کو کہتے ہیں جس کی مَس نہ بھیگی ہو۔ مردوں کی ہم جنسی محبت کو اَمرد پرستی کہا جاتا ہے۔ فارسی اور اردو کی کلاسیکی غزل میں اَمردوں ہی سے اظہارِ عشق کیا گیا ہے۔

اَنا

شعورِ ذات یا شعور کے شعور کو تحلیلی نفسیات کی اصطلاح میں اَنا یا الیغو کہتے ہیں۔ حیوانات میں شعور ہوتا ہے لیکن اس شعور کا شعور نہیں ہوتا۔ ایک کتّا ہڈی کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتا ہے۔ وہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ یہ کھانے کی چیز ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ "میں ہڈی کو دیکھ رہا ہوں" جب کہ انسان ہڈی کو دیکھ کر جان لیتا ہے کہ یہ ہڈی ہے اور "میں جانتا ہوں کہ میں اسے جانتا ہوں"۔ اَنا کے تین پہلو ہیں (۱) بحیثیت مالک کے (۲) بحیثیت مفکّر کے اور (۳) بحیثیت حَکَم کے۔ اَنا کی تین قسمیں ہیں (۱) نرگسی یا واضح اور جارحانہ انانیت (۲) اپنی ذات کو گرانے والی (۳) متوازن۔

اَنتریامی

ہندو سریانی خدا کو جو کائنات میں جاری و طاری ہے اَنتریامی کہتے ہیں۔

اِنتقاد نقد سے مشتق ہے۔ اصطلاح میں اس کا مطلب ہے کسی فن پارے یا ادبی

تحریر میں جمالیاتی قدر کا تعین کرنا۔ انتقاد کی کئی قسمیں ہیں مثلاً تاثراتی، سائنٹفک وغیرہ۔ ارسطو، لان جائنس، ڈرائڈن، کولرج، سانت بو، بیلنسکی، ٹی۔ ایس ایلیٹ وغیرہ نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے انتقاد کے اصول وضع کئے ہیں لیکن نقدِ ادب محض ان اصولوں کے اطلاق کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر اور مصنّف کی شخصیت اور اُس کے ماحول کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ژنگ کہتا ہے کہ مصنّف یا شاعر کی ذات غیر اہم ہے اصل بات تو یہ ہے کہ کسی نظم یا ادب پارے کی اپنی حدود میں رہ کر اُس پر محاکمہ کیا جائے۔ بہرصورت نقّاد کے لئے خود بھی جمالیاتی احساس، تخلیقی صلاحیت اور حُسنِ ذوق سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ شاعر کی تخلیقی قوت کا اندازہ لگانے سے قاصر رہے گا۔ فن کار انسان کے منتشر ذہنی و قلبی واردات و کیفیات میں معنویّت اور ربط پیدا کرتا ہے اور حُسن و جمال کی بے بقائی اور گریز پائی کو اپنے معجز نما اسالیبِ فن سے غیر فانی سانچے میں ڈھال دیتا ہے لہٰذا کسی فن کار کی ذہن کا تجزیہ کرتے وقت یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ وہ کس حد تک یہ شرائط پوری کرتا ہے۔ ناقدینِ ادب کا فریضہ اہم ہے۔ وہ نہ صرف عطائیوں کے زعمِ بے جا کا بلبلہ پھوڑ دیتے ہیں بلکہ جواہرِ قابل کی جلا بھی کرتے ہیں۔ کاونٹ لیو ٹالسٹائے اور اشتراکی ناقدینِ ادب نے انتقاد کے روائتی معیار بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ ٹالسٹائے کے ہاں جمالیاتی قدر کا معیار یہ ہے کہ کوئی فن پارہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتا ہے کہ نہیں۔ اُس کے خیال میں جمالیاتی قدر کسی نظم، تصویر یا نغمے میں نہیں ہوتی بلکہ سامعین اور ناظرین اُس میں جمالیاتی قدر پیدا کرتے ہیں مثلاً روسی عوام کے لوک گیت شیکسپئر کے المیے ہیملٹ سے زیادہ جمالیاتی قدر رکھتے ہیں کیوں کہ اُن کا حلقۂ اثر ہیملٹ سے زیادہ وسیع ہے۔ اشتراکی ناقدین نے لیو ٹالسٹائے سے اتفاق کیا ہے البتّہ اُن کے خیال میں انسان دوستی، صداقت اور حُسن کے عناصر عظیم فن و ادب کی اساس بنتے ہیں۔ انہی عناصر نے اسکیلس، ارسٹوفینیس، شیکسپئر، مولئیر، سروانٹز، گوئٹے، بالزک، ابسن، طامس مان وغیرہ کو عظمت بخشی ہے۔ اشتراکی ناقدین کے یہاں فی زمانہ انسان دوستی کا تصوّر انقلابی اور فعّال ہو کر اُبھرا ہے۔ وہ جدید دور کے مغربی اہلِ قلم کی داخلیت اور موضوعیّت کو زوال پذیر اور مریضانہ قرار

دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان دوستی کا زبانی کلامی ذکر کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ استحصال کے خاتمے کے لئے عملی جدوجہد کرنا سچی انسان دوستی ہے۔ لہٰذا سچا فن کار، شاعر اور ادیب وہی ہے جو اس جدوجہد میں عملاً حصّہ لے رہا ہو اور عوام کی انقلابی اُمنگوں کی آبیاری کر رہا ہو۔

اناہیتا

ایران قدیم کی دریا اور بار آوری کی دیوی جسے فارسی میں ناہید کہا گیا ہے۔ اس کا تعلق بار آوری کے مُت سے تھا اور اس کے معبد میں دیوداسیاں زائرین سے جنسی اختلاط کرتی تھیں تاکہ فصلیں باافراط پیدا ہوں۔

انڈا

پُرانے زمانے میں انڈے کو حیات بعد موت اور خوش بختی کی علامت سمجھتے تھے۔ آج کل بھی عیسائی ایسٹر کے تہوار پر رنگے ہوئے انڈے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں تاکہ اگلے ایسٹر تک خوش و خرّم اور زندہ رہیں۔

انّاس۔

مشہور پھل ہے: اَن، اناج، کھاجا؛ آس، دیوتا مطلب ہوا دیوتاؤں کا کھاجا۔

اَن دیو

راجپوتوں کا اناج کا دیوتا۔

اونسیاں پانا

زمین پر لکیریں کھینچ کر دو دو لکیریں مٹائی جاتی ہیں اگر ایک لکیر بچ رہے تو نیک فال سمجھی جاتی ہے۔

انگ ساک

دکن کے سیما قبائلی اپنے ماں باپ کے قریبی رشتہ داروں کو انگا کہتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں اُنہیں انگ ساک کہا جاتا ہے۔

آواگوَن

لغوی معنیٰ ہے آنا جانا۔ اسے سنسار چکر بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے اس عقیدے کا

کہ رُوح موت کے بعد بار بار نیا قالب اختیار کرتی ہے رِگ وید میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ شت پتھ برہمن میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ رِگ وید میں اتنا لکھا ہے کہ مرنے کے بعد آدمی کی رُوح پانیوں میں چلی جاتی ہے۔ یہ تصوّر دراوڑوں سے ماخوذ ہے جن کا عقیدہ تھا کہ موت کے بعد ارواح پرندوں یا درختوں میں چلی جاتی ہیں۔ آریا نے اس پر جزا سزا کا پیوند لگایا اور کہا کہ ارواح اپنے نیک یا بد اعمال کے سبب نیا قالب لیتی ہیں اور انسان اپنے کرم کا پھل بہر صُورت بھوگتا ہے۔ آواگون ہندو مت کا بنیادی عقیدہ ہے۔ جو شخص آواگون کا قائل ہے وہ ہندو ہے خواہ وہ خُدا اور ویدوں کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ اسی بنا پر گوتم بُدھ اور مہاویر کو ہندو کہا جاتا ہے اگرچہ وہ خدا اور ویدوں کو نہیں مانتے۔

اوتار

سنسکرت میں اس کا معنیٰ ہے 'نیچے آنا'۔ ہندوؤں کے عقیدے کے بموجب جب زمین ظلم اور گناہوں سے بھر جاتی ہے تو وشنو بھگوان کسی نہ کسی صورت میں اوتار لیتے ہیں اور ظلم اور بدیٰنی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ رام اور کرشن اسی نوع کے اوتار تھے۔ آخری اوتار کلکی ہوگا جو کلجگ کی برائیوں کا خاتمہ کر دے گا۔

اولیاء

صُوفیہ کے خیال میں قُطب یا غوث کا درجہ سب سے بلند ہے۔ اُس کا تصرف ساری کائنات پر محکم ہوتا ہے گویا وہ کائنات کا محور ہے۔ قطب کے بعد چار اوتاد ہیں۔ ان کے بعد سات اخیار، پھر چالیس ابدال (انہیں چہل تن بھی کہا جاتا ہے) پھر ستر نجباء اور آخر میں تین سو نقباء ہیں۔ شیخ احمد سرہندی کے خُلفاء قیّم کہلاتے تھے یعنی کائنات اُنہی کے وجود سے قائم ہے۔ قیّم قُطب ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

اوم

ہندوؤں کا مُقدّس ترین کلمہ۔ مونیر ولیمز کے خیال میں یہ کلمہ تین دیوتاؤں اگنی، والیو اور مترا (سُورج) کے ناموں کے پہلے حروف سے مُرکّب ہے۔

اہورا مزدا

مجوسیوں کا خداوند خدا جو خیر، روشنی اور صداقت کا مبدء ہے۔ اس کا لُغوی معنیٰ ہے "خدائے خیر"۔

پروں والا اسرارِ انس کی تصویری علامت تھی۔

اہرمین

اہرمین یا انگرامینیو (فرد خبیث) اہورا مزدا کا توام تھا۔ شر، جہالت اور تاریکی کا نمائندہ ہے جو اہورامزدا کا ازلی و ابدی دشمن ہے۔ دونوں زروان (زمان) کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ثنویت اور کشمکش مجوسی مذہب کا اصل اصول ہے۔

اہرامِ مصر

فراعین مصر کے شاندار مقبرے جو انہوں نے اپنی میت اور دولت کو محفوظ کرنے کے لئے بنوائے تھے۔ غزہ کے تین اہرام سب سے بڑے ہیں۔ ان میں عظیم ترین فرعون خوفو کا ہے جو چار سو پچاس فٹ اونچا ہے اور جس میں ۲۳ لاکھ ۸۳ ہزار ٹن وزن کی سلیں لگائی گئی ہیں۔ فراعین کا خیال تھا کہ جب وہ دوبارہ جی اٹھیں گے تو یہ دولت اُن کے کام آئے گی لیکن گذشتہ صدیوں میں چوروں نے اُن کا سونے چاندی کا بیشتر سامان چرا لیا ہے اور صرف توت عنخ آمن کا ساز و سامان ہی محفوظ صورت میں دستیاب ہو سکا ہے۔

آئسس

مصرِ قدیم کی چاند کی دیوی جو بعد میں بار آوری اور حیات کی دیوی بن گئی۔ اوزیرس کی زوجہ تھی جو زیریں دوز مملکت کا دیوتا تھا اور مردوں کے اعمال کا حساب لیتا تھا۔ ان کا بیٹا ہورس آفتاب دیوتا تھا۔ ان کی تثلیث کئی مجسموں میں دکھائی دیتی ہے جن میں ننھے ہورس کو اپنی ماں کی گود میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ابتدائی دور کے عیسائی ان کے مجسموں پر مریم عذرا اور ننھے مسیح کا گمان کر کے اُن کے آگے سجدہ کرتے تھے۔ اہلِ تحقیق کے خیال میں مریم پوجا آئسس ہی کی پوجا سے یادگار ہے۔ مصری دیومالا کی ایک روایت کے مطابق اوزیرس کے دشمن دیوتا سیت نے اُسے قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور انہیں دور دور پھینک دیا۔ آئسس نے دوڑ دھوپ کر کے ان ٹکڑوں کو جمع کیا اور اوزیرس کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اس طرح وہ حیات کی دیوی بن گئی۔ آئسس کا مت تیسری صدی قبل مسیح میں یونان میں پھیل گیا۔ روما میں سلا نے اسے رواج دیا تھا۔

ایٹم

قدمائے یونان میں دیمقراطیس نے کہا کہ دنیا ایٹموں سے بنی ہے جو ایسے ننھے منے ذرات ہیں جن کا مزید تجزیہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں ویکیوم ٹیوب میں سے بجلی کی رو گذاری گئی تو ٹیوب میں عجیب سی شعاعیں نمودار ہو گئیں جنہیں کیتھوڈین کا نام دیا گیا۔ ایک سائنس دان جوزف تھامسن نے کہا کہ یہ ذرات کی لہریں ہیں۔ اِن ذرات کو آج کل ہم الیکٹران کہتے ہیں جو توانائی کے ریزے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں لارڈ ردرفورڈ نے نائٹروجن گیس میں اِن ذرات سے دھماکا کیا جس سے نائٹروجن بھاری آکسیجن میں تبدیل ہو گئی یعنی ایک عنصر دوسرے میں بدل گیا۔ یہیں سے ایٹم کے تجزیے کی بنیاد پڑی اور اسی عمل سے بعد میں پلوٹونیم کا نیا عنصر دریافت کیا گیا جسے ایٹم بم میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایک سائنس دان لوئی ڈی بروگلی نے ثابت کیا کہ الیکٹران ایک ننھا منا ذرہ ہی نہیں ہے بلکہ روشنی جیسی لہروں پر مشتمل ہے۔ بعد میں پروٹان اور نیوٹران کے ذرات دریافت کئے گئے۔ جیمز چیڈوک نے جس نے نیوٹران دریافت کیا تھا یہ انکشاف کیا کہ نیوٹران میں دوسرے ذرات کی طرح کا برقی چارج نہیں ہوتا۔ ڈنمارک کے ایک سائنسدان نیلز ڈبلو بوہر نے کہا کہ الیکٹران اپنے مرکزے کے گرد یوں گھومتے ہیں جیسے سیارے سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ بعد میں ہائزن برگ اور شروڈنگر نے اس خیال کو نادرست قرار دیا۔ بہرصورت اِن انکشافات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ مادہ ٹھوس نہیں ہے بلکہ ذرات پر مشتمل ہے یعنی توانائی ہی کی ایک صورت ہے جو چند نامعلوم قوانین کے تحت مربوط ہو کر ٹھوس مادے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ہر ایٹم کا مرکزا دو قسم کے ذرات سے مرکب ہے مثبت چارج کے الیکٹران اور بغیر چارج کے نیوٹران۔ اِس مرکزے کے گرد منفی الیکٹران تیزی سے گردش کرتے ہیں ایٹم کے اندرون میں ذرات منتشر ہوں تو دھماکے کے ساتھ بے پناہ توانائی پیدا ہوتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پروٹان اور الیکٹران ایک دوسرے کی جانب شدید کشش محسوس کرتے ہیں لیکن اپنے ہی نوع کے ذرات سے گریزاں ہیں۔ ہائزن برگ اور شروڈنگر نے ثابت کیا ہے کہ مادہ کوئی ٹھوس شے نہیں ہے۔ میز کرسی سورج چاند وغیرہ کو محض 'سلسلۂ واقعات' کہا جا سکتا ہے جو چند قوانین کے تحت صورت پذیر ہوتے ہیں۔

شرودنگر نے ثابت کیا کہ ایٹم کے اجزاء یعنی توانائی کی لہروں کی حرکت میں آزادہ روی پائی جاتی ہے۔ البتّہ اِس کی توجیہہ نہیں کی جا سکی۔ ہائزن برگ نے بھی اِس خیال پر صاد کیا ہے۔

بڑے سے بڑے ایٹم کا حجم ایک انچ کا $\frac{1}{1000,0000000}$ واں حصّہ ہوتا ہے۔

ایجابیّت

یہ فلسفہ فرانس کے فلسفی اگست کومت نے پیش کیا تھا۔ کومت مشاہدے اور تجربے کو علم کا اصل ماخذ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم کائنات کی ماہیّت کو نہیں جان سکتے ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ کائنات کی کَل کیسے چل رہی ہے، یہی ہمارا مبلغ علم ہے اور یہی کچھ ہمیں جاننے کی ضرورت ہے؛ جو کچھ انسان کے تجربے میں آتا ہے وہی حقیقی ہے۔ دوسرے الفاظ میں تجرّبہ ہی حقیقت ہے اِنسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے تجاوز نہیں کر سکتا اِس لئے مابعد الطّبیعیاتی بحثوں میں اُلجھنے کے بجائے اِنسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کو احسن طریقے سے گذارنے کی کوشش کرے۔ کومت کے خیال میں خدا پر ایمان لانا یا کسی وُجودِ مطلق کو ماننا ہمارے تجربے سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ہی وُجودِ مطلق کا قائل ہے اور وہ ہے اِنسانیّتِ عالیہ۔ اِنسان کی خدمت اور اُس کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا ہی اُس کے یہاں نیکی ہے۔ اُس نے روائتی مذہب کو ماننے سے اِنکار کر دیا اور اپنے اِنسانیّتِ عالیہ کے مسلک کو "کلیسائے رُوم بغیر عیسائیت" کا نام دیا۔

کومت کا تاریخی نظریہ یہ ہے کہ ذہنِ اِنسانی تین اِرتقائی مراحل سے گذرا ہے۔ پہلا مرحلہ مذہب کا تھا جس میں واقعات کی توجیہہ یزدانی قوت کے حوالے سے کی گئی، دوسرا مرحلہ مابعد الطّبیعیات کا آیا جس میں یہ توجیہہ مختلف قوتوں کے حوالے سے کی گئی؛ تیسرا اور آخری مرحلہ سائنس کا ہے جس میں واقعات کی توجیہہ سبب و مُسبّب کے قانون سے کی جا رہی ہے۔ یہی اِنسانی عقل و خرد کی معراج ہے؛ مذہب اور مابعد الطّبیعیات فکری پہلو سے فرسودہ ہو چکے ہیں۔

کومت کہتا ہے کہ حقیقی علم وہ ہے جو مفید مطلب اور کار آمد ثابت ہو۔ وہ علمی نظریّات کو درخورِ توجہ نہیں سمجھتا بلکہ اِس بات کی جستجو کرتا ہے کہ کون سا علم اِنسانی زندگی میں عملاً نتیجہ خیز ثابت ہو

سکتا ہے۔ وہ علم کے صرف عملی پہلوؤں کو اہم سمجھتا ہے کیوں کہ بقول اُس کے سائنس ہمیں یہ تو بتاتی ہے کہ واقعات کیسے رُونما ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتی کہ کیوں رُونما ہوتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے فرانسیسی قاموسیوں کی طرح کومت بھی ذہن کو مادے کا ایک جُز قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ نفسیاتی کیفیت مغزِ سر کا فعل ہے۔ اُس کے مسلک میں ذہن اور رُوح کے وجود سے اِنکار کیا گیا ہے۔ وہ انہیں محض مابعد الطبیعیاتی مفروضے خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم اپنی نفسیاتی کیفیات کا داخلی مُشاہدہ نہیں کر سکتے، ہم تو صرف عملاً نفسیاتی واردات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

فرانسیسی قاموسیوں کی طرح کومت کو بھی اِنسانی ترقّی پر کامل اعتقاد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بنی نوعِ اِنسان سائنس کی بدولت ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ اِنسانیتِ عالیہ کے نصب العین کی عملی ترجمانی کو ترقّی کا نام دیتا ہے اور قدیم مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی روایات کو ترقّی کے راستے میں حائل خیال کرتا ہے۔ اُن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "مُردے زندوں پر حکومت کر رہے ہیں"۔ کومت کی ایجابیت نے سٹوارٹ مِل، ولیم جیمز، ڈیوی، رینان اور درخائیم کے افکار کو مُتاثر کیا تھا۔

ایراس

افلاطون کا آفاقی عشق۔ فرائڈ نے یہ ترکیب ہمہ گیر جنسی کشش کے مفہوم میں استعمال کی ہے۔ یُونانیوں کے عشق کے دیوتا کا نام۔

ایلچی

سفیر کے معنیٰ میں ہنگولی زبان کا لفظ ہے۔

ایل

عبرانی میں ایل اور عربی میں اِلٰہ کا معنیٰ ہے "قُوّت"، ایل سامیوں کے خدا کا قدیم نام ہے۔

ب

باب

شیخیہ فرقے کے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام غائب یا مہدی موعود اور خلق خدا کے درمیان ایک ضروری واسطہ باب (دروازہ) ہوتا ہے جس سے وہ بندوں سے اپنا رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ مرزا علی محمد نے ۱۲۶۰ھ میں جب وہ ۲۵ برس کی عمر کے تھے شیراز میں آکر دعویٰ کیا کہ میں وہی باب ہوں۔ اُن کے پیرو بابی کہلائے۔ بابی بھی دوسرے باطنیہ کی طرح قرآنی آیات و اصطلاحات کی حسب منشا تاویل کرتے تھے۔ مرزا علی محمد باب کو ارتداد کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔ بابیوں نے انتقام لینے کے لئے شاہ ایران ناصر الدین پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ اٹھارہ بابیوں کو سازش کے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔ ان میں بابیوں کے مشہور نغز گو شاعرہ اور نقیبہ قرۃ العین بھی تھی جسے ایک گڑھے میں دھکیل کر اُسے مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

بابل

باب ایل یعنی دروازۂ خداوند قدیم عراق کا سب سے بڑا شہر تھا جو دو ہزار برسوں تک دُنیا بھر کی تجارت اور تمدن کا مرکز بنا رہا۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے اس کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شہر مربع شکل میں دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر تعمیر کیا گیا تھا اور اس کا محیط ۵۶ میل تھا۔ اس میں بعل دیوتا کا عظیم الشان معبد تھا جس کے کھنڈر کو آج کل منارۂ بابل کہتے ہیں۔ اس منارے کی بالائی منزل پر بعل دیوتا کے لئے ایک کمرہ تعمیر کیا گیا تھا جس کی دیواریں ۴۸ فٹ بلند تھیں اور ان کے باہر کی جانب سونے کے پتروں اور نیلگوں روغنی اینٹوں سے کاشی گری کی گئی تھی۔ ان دیواروں کی چمک دمک میلوں تک دکھائی دیتی تھی۔ منارے اور معبد کی کل بلندی ۲۸۸ فٹ تھی۔ بعل دیوتا کا بُت خالص سونے

کا بنایا گیا تھا۔ اُس کے قدموں میں سیروش یا اژدہائے بابل کا مجسمہ تھا۔ بالائی منزل میں ایک منتخب حسینہ رہتی تھی جسے عروسِ بعل کہتے تھے۔

بابل کے باشندے مشہور تاجر اور صنّاع تھے۔ دریائے دجلہ شہر کے بیچوں بیچ بہتا تھا۔ اُس میں دُور دراز کے ملکوں کا سامان تجارت کشتیوں میں لدکر آتا تھا۔ بابلیوں کی تجارت چین، ہند، رُوم، مصر اور فلسطین تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِن ممالک کے سوداگر قافلوں کی صُورت میں اپنے ہاں کی مصنوعات اور اجناس فروخت کے لئے لاتے تھے۔ اِن تاجروں کے واسطے سے بابل کے دیو مالائی قصّے، قوانینِ حمورابیؔ، علمِ ہیت و نجوم، ریاضیات، کہانت اور سحر و سیمیا کی اشاعت متمدّن اقوام میں ہوئی اور بابلی روایات دُنیا بھر کے مذاہب و ادیان، عُلوم وفنون اور صنائع بدائع میں نفوذ کر گئیں۔ بنی اسرائیل بابل کی اسیری کے دوران میں صابئیّت کے بہت سے عقائد اور شعائر اپنے ساتھ لے گئے جن میں کہانت، فرشتوں، جنّوں اور شیطان کے تصورات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِسی طرح شجرِ حیات، بہشت، عالمگیر سیلاب کی دیو مالائی روایات بھی بابلیوں ہی سے اخذ کی گئی ہیں۔ ۵۳۹ ق م کو روش کبیر شاہِ ایران نے بابل فتح کیا اور اِس کے ساتھ ہی اِس عظیم الشان شہر کی عظمت خاک میں مِل گئی۔

بارھہ

سؤر کو کہتے ہیں۔ کشمیر کا ایک شہر بارھہ مُولہ کہلاتا ہے کیوں کہ وہاں وِشنو کے اوتار بہ شکلِ خنزیر کا بُت رکھا ہے۔

باشا

بھانڈ کو کہتے ہیں۔ مکار اور چالاک آدمی کو بھی پنجابی میں باشا کہا جاتا ہے۔

بازی گر

پنجاب کا ایک خانہ بدوش قبیلہ جس کے نٹ رسّے پر کرتب دکھاتے ہیں۔ کرتب دِکھانے والی عورت کو کبوتری کہتے ہیں۔ یہ لوگ بندر دیوتا ہنومان کی پُوجا کرتے ہیں کیوں کہ بندر قلا بازیاں لگانے میں تیز ہوتا ہے۔ اِن کا خیال ہے کہ ہنومان اُنہیں رسّے پر سے گِرنے سے بچاتا ہے۔

بامیان

افغانستان کی ایک مشہور آبادی جہاں ایک عظیم قلعے کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔ اِس وادی کے کوہستان میں بارہ ہزار غار ہیں جہاں کسی زمانے میں بودھ سوامی بُود و باش رکھتے تھے۔ ان غاروں کے در و دیوار پر استرکاری کر کے تصویریں بنائی گئی ہیں جنہیں شماج کہتے ہیں۔ بعض غار اتنی بُلندی پر واقع ہیں کہ بودھوں کو ٹوکروں میں بٹھا کر اور کھینچ کر اوپر نیچے لایا جاتا تھا۔ یہاں تین عظیم الجثہ مجسّمے ہیں۔ مردِ کا بُت اسّی گز اونچا ہے، عورت کا پچاس گز اور بچے کا پندرہ گز طویل ہے۔ یہ بُت چٹانوں میں سے تراش کر بنائے گئے ہیں اور گوتم بدھ، اُس کی زوجہ یشودھرا اور بیٹے رہولا کے بتائے جاتے ہیں۔ چنگیز خان نے اِس وادی کو آباد کرنے سے منع کر دیا تھا جب سے ویران پڑی ہے۔

باطنیّہ

مُسلمانوں کے بعض غالی فرقے جو قُران کی تمثیلی تفسیر کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر کا باطن ہوتا ہے جسے صرف اِمام ہی سمجھ سکتا ہے۔ سبعیّہ، قرامطہ، شلمغانیہ، راوندیہ، صباحیہ، نزاویہ، دروز، علی الہیہ وغیرہ باطنیّہ ہیں۔ اسمٰعیلیہ (پیروان آغا خان) اور بوہرے بھی باطنیّہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تناسخِ ارواح اور اوتار پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کے اِمام میں خدا حلول کر جاتا ہے۔ اِسمٰعیلیہ کو تعلیمیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ محمّد بن اسمٰعیل کو آخری اِمام مانتے ہیں۔ گلگت میں انہیں مولائی کہا جاتا ہے۔

بُت

فارسی زبان کا یہ لفظ بدھ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ مہایان فرقے کے بودھوں نے گوتم بدھ کے مجسّمے بنانا شروع کئے اور اُن کی پوجا کرنے لگے۔ ایرانیوں نے ہر مورتی کو بُت کہنا شروع کیا بُتوں کو خوبصورت وضع میں تراشا جاتا تھا۔ اِس لئے فارسی والے اُس پُرشباب حسینہ کو بھی جس کے بدن کے زاویے اور خطوط سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں بُت اور معشوق کہنے لگے۔

بخشی

تاتاری بودھ بھکشوؤں کو بخشی کہتے تھے اور بھکشوؤں کو محکمہ مالگذاری میں عہدے

دیتے تھے۔ بعد میں اِس عہدے کے لئے بخشی کا لفظ رواج پا گیا۔

بدویت

بدویت یا صحرائیت حضارت اور تمدّن کی اُلٹ ہے۔ بدویت پسند تہذیب و تمدّن کی ترقی سے نالاں ہیں اور دوبارہ فطرت کی طرف لوٹ جانے کی دعوت دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں سائنس کی اِشاعت نے انسان کو دِلی خوشی سے محروم کر دیا ہے۔ یہ لوگ خرد دشمن بھی ہوتے ہیں کیوں کہ خرد مندی بداہتہً ترقی پسندی کی مُتقاضی ہوتی ہے۔ روسو، ٹالسٹائے، جارج برنارڈ شا، اِقبال اور سولز نٹسن بدویت پسند ہیں اور معاشرۂ انسانی کو علومِ تحقیقی کی روشنی میں آگے کی طرف بڑھانے کے بجائے پیچھے کی طرف دھکیل دینا چاہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ خوشی فطرت کی گود میں رہ کر میسر نہیں آتی بلکہ اِس کی تسخیر سے ارزانی ہوتی ہے۔

بردہ فروشی

شاہیت کے دور میں بردہ فروشی کا کاروبار ہر کہیں پھیل گیا۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنا کر بیچ دیتے تھے۔ بڑے شہروں میں نخاس یا بردہ فروشی کا بازار موجود تھا جہاں دُور دراز کے مُلکوں سے لائے ہوئے غُلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ انہیں گاہک بھیڑ بکریوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر خریدتے تھے۔ بعض اوقات غُلاموں کی تعداد شہریوں سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ ارسطو نے غلاموں کو ریاست کے لئے ضروری قرار دیا ہے تاکہ شہری روزمرّہ کے کاموں سے آزاد ہو کر نظم و نسق کی طرف توجّہ دے سکیں۔ اشوریا اور بابل میں آختہ کئے ہوئے غُلام محل سراؤں میں لونڈیوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ اسلامی ممالک میں انہیں خُنثیٰ، خواجہ سرا، خوجہ، شیخ کہہ کر بُلاتے تھے۔ روما میں غلاموں کی کثرت تھی۔ بعض اُمراء کے پاس سیکڑوں غُلام تھے۔ جب کبھی کوئی غُلام ظُلم سے تنگ آ کر اپنے آقا کو قتل کر دیتا تو قاتل کے ساتھ اُس گھر کے سارے غُلاموں کی گردن مار دی جاتی تھی۔ ۳۰ء ق م میں سپارٹاکس کی بغاوت تاریخِ عالم کا ایک ولولہ انگیز باب ہے۔ سپارٹاکس نے بھگوڑے غُلاموں کی فوج اکٹھی کی اور کئی برس روما کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا رہا۔ آخر مغلوب ہوا، اُسے لنے کھ

ہزار ساتھیوں سمیت، میلوں تک سولیاں کھڑی کر کے اُن پر گاڑ دیا گیا۔ عربوں نے ایران اور شام فتح کیے تو لاکھوں عورتوں اور مردوں کو لونڈی غلام بنا لیا۔ بغداد، سامرّا، حلب اور دمشق میں بڑے وسیع پیمانے پر بردہ فروشی کا کاروبار ہونے لگا۔ عرب بردہ فروش (انہیں جلاّب کہتے تھے) افریقہ کے ساحلی علاقوں پر دھاوے کر کے ہر سال ہزاروں حبشی عورتیں مرد پکڑ لاتے تھے اور نخاس میں بیچتے تھے۔ خلفاء بنو اُمیہ اور بنو عباس کے محلوں میں منتخب حسین لونڈیاں رکھی جاتی تھیں۔ بردہ فروش خوبصورت نوخیز لونڈیوں کو ناچ گانے کی تعلیم دلا کر اُمراء کے یہاں بیچ دیتے تھے۔ مکّہ اور مدینہ ناچ گانے کے مرکز بن گئے جہاں کی تربیت یافتہ کنیزیں گراں قیمت پر بکتی تھیں۔ عربوں نے افریقہ کے شمال مغربی ساحلی علاقہ ہسپانیہ اور صقلیہ فتح کیے تو وہاں بھی بردہ فروشی کا کاروبار چمک اُٹھا۔ اضلاعِ متحدہ امریکہ کی آبادکاری کے دوران میں بردہ فروشوں نے لاکھوں حبشیوں کو وہاں فروخت کیا۔ انہی حبشی غلاموں نے اضلاع متحدہ کے بنجر علاقے اپنا خون پسینہ ایک کر کے آباد کیے تھے۔ اِن کی اولاد سے آج بھی کروڑوں حبشی وہاں موجود ہیں۔ روس میں غلام کھیتوں سے وابستہ تھے اور کھیت کے ساتھ اُنہیں بھی بیع کر دیا جاتا تھا۔ ۱۸ ویں صدی کے اواخر میں دُنیا بھر کے روشن خیال دانشوروں نے غلامی اور بردہ فروشی کے اِنسداد کی تحریک چلائی۔ ڈنمارک نے ۱۷۹۲ء میں غلامی کو خلاف قانون قرار دیا۔ اُس کی تقلید کرتے ہوئے اِنگلستان نے بھی ۱۸۰۷ء میں بردہ فروشی اور غلامی کا انسداد کر کے اِس پُرانی لعنت کا خاتمہ کر دیا۔

برہمن

یہ لفظ تین معنی میں آیا ہے۔ (۱)—— جاتی: برہمنوں کی جاتی سب سے افضل و برتر ہے۔ منوسمرتی میں کہا گیا ہے کہ برہمن دیوتا ہیں، وہ پوجا پاٹھ کی رسمیں انجام نہ دیں تو سورج طلوع نہیں ہوگا۔ وہ اپنے منتروں سے دیوتاؤں کو بھی مغلوب کر سکتے ہیں۔ (۲)—— برہمن وہ کتابیں ہیں جو ویدوں کے بعد لکھی گئیں اور جن میں پوجا پاٹھ کے طریقے درج ہیں۔ (۳)—— اُپنشد کی زبان میں برہمن وجودِ مطلق ہے جو کائنات کے ساتھ متحد ہے۔ جیو آتما یا شخصی رُوح اور برہمن اصلاً ایک ہی ہیں۔

برہنگی: قدیم زمانے میں برہنگی کو صداقت اور پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لوگ

معبدوں اور بتوں کا طواف مادر زاد برہنہ ہو کر کرتے تھے جیسا کہ سکندرِ اعظم نے ایکلیس کی قبر کا کیا تھا۔ اسلام سے پہلے عرب حج کے موقع پر برہنگی کی حالت میں کعبہ کا طواف کرتے تھے۔

بَز

بَز کا معنیٰ ہے کپڑا۔ بزاز کپڑا بیچنے والا اور بزار جہاں کپڑا بیچنے کی دکانیں ہوں۔

بکارت

علم الانسان کے طلبہ کہتے ہیں کہ زرعی انقلاب کی ابتدائی صدیوں میں مادری نظام معاشرہ قائم رہا جس میں ایک ہی قبیلے کے مرد عورتیں مل جل کر رہتے تھے اور اُن میں خوراک اور عورت کا اشتراک تھا۔ اس زمانے میں دوشیزگی یا بکارت کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ مرد باکرہ سے بیاہ کرنے سے کتراتے تھے کیوں کہ وہ خون بہانے سے سخت خائف تھے جیسا کہ آج کل کے بعض افریقی اور آسٹریلیائی قبائل کے مشاہدے سے معلوم ہوا ہے۔ دلہن کی رخصتی سے پہلے اُس کا ازالۂ بکارت کسی پروہت یا اجنبی سے کرایا جاتا تھا۔ زرعی انقلاب کے بعد دوسری قدروں کی طرح کنوارپنے کی قدر بھی بدل گئی۔ اب شخصی املاک معاشرے کا محور بن گئی تھی اس لئے ہر باپ چاہتا تھا کہ اپنی جائداد یا اراضی اپنے ہی صُلبی فرزند کے لئے ورثے میں چھوڑے۔ لہذا بکارت کو اہم سمجھا جانے لگا۔ اکثر قدیم اقوام میں رواج تھا کہ بیاہ کی رات کی صبح کو بستر کی چادر ملاحظہ کی جاتی تھی اور اگر دلہن کی بکارت کا ثبوت مل جاتا تو اُسے قبیلے کے گھر گھر میں پھرایا جاتا تھا۔ یورپ کے ملکوں میں ۱۵ ویں صدی عیسوی تک دوشیزہ کو لوہے کی پیٹی پہنا دیتے تھے۔ بیاہتا عورتوں کو بھی "عصمت کی پیٹی" پہنائی جاتی تھی۔ صنعتی انقلاب کے بعد سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدریں بدلتی جا رہی ہیں اور اب بکارت کو بھی اگلی سی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ اضلاع متحدہ امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک میں نوخیز لڑکیاں بکارت کو مصیبت سمجھ کر جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانے کی آرزو مند ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ روز بروز کنواری ماؤں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بہادر: تاتاری زبان میں دلیر آدمی کو بگھاتر کہتے تھے جو فارسی میں بہادر بن گیا۔ پنجابی

میں بگھوتر احمق کو کہتے ہیں

بَنجارا

یہ لفظ بنج سے ہے جس کا معنیٰ ہے بیوپار۔ پنجابی کا ونج۔ بنجارے اناج کے سوداگر تھے جو چل پھر کر اناج کی تجارت کرتے تھے۔ پنجابی کے ونجارے۔

بندوق

بندوق کا اصل معنیٰ کمان کا ہے جس سے تیر پھینکتے تھے۔

بودلے

پیر بودلا کی اولاد سے ہیں۔ پنجابی میں بھولے بھالے آدمی کو بودلا کہتے ہیں۔

بورژوا

لفظ بورژ سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے منڈی۔ اس لئے تجارت پیشہ کو بورژوا کہنے لگے۔ سیاسیات کی اصطلاح میں صنعت کار، ساہوکار، جاگیردار، اجارہ دار اور بڑے بڑے تاجر سبھی بورژوا میں شامل ہیں جو محنت کشوں کا استحصال کرکے دولت سمیٹتے ہیں۔

بھائی پھیرو

بھائی پھیرو سخی سرور کا ایک معتقد تھا جس کی درگاہ موضع میانکے نزد چونیاں ضلع لاہور میں ہے۔ کسان گردباد آتے دیکھیں تو "بھائی پھیرو تری سرکار" کہہ کر اُس سے پناہ مانگتے ہیں۔

بھائیاری

دکن کے جنگلی قبائل میں برادری کو بھائیاری کہتے ہیں۔ یہی ترکیب پنجابی میں بھائی چارا کی صورت میں موجود ہے۔

بھان متی

کالا جادو ہے جو حیدرآباد دکن میں کیا جاتا ہے۔ اس سے جسم پر کالے دھبے نمودار ہو جاتے ہیں اور معدے میں سخت درد ہونے لگتا ہے۔ جس شخص پر یہ جادو کیا جائے وہ دیوانہ وار ناچنے لگتا

ہے۔ جادوگرنیاں اپنی مخالف عورتوں کے ایام روک دیتی ہیں اور اُن پر مرگی کا دورہ ڈال دیتی ہیں۔

بھیڑی

کسی ولی کی قبر پر رکھا ہوا پتھر جسے مقدّس سمجھا جاتا ہے بھیڑی کہلاتا ہے۔ حاجت مند لوگ اس پر مَنتیں مانتے ہیں۔ یہ پتھر مدفون ولی کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ مثلاً بھیڑی شاہ رحمٰن۔

بھنگ

مشہور نشہ آور جڑی بوٹی ہے جسے سبزی، سبز پری، سردائی اور بوٹی کہتے ہیں۔ ملنگ بڑے شوق سے سردائی گھوٹ کر پیتے ہیں۔ جوان لڑکیوں کو ورغلانے اور بے آبرو کرنے کے لئے عیار ملنگ اُنہیں مٹھائی میں بھنگ ڈال کر کھلاتے ہیں۔ بھنگ کا نشہ طلوع ہونے سے آدمی بڑی چونچالی محسوس کرتا ہے اور اپنے سامنے ہر شخص اور ہر شے کو حقیر و صغیر محسوس کرتا ہے۔ حسن بن صباح اپنے فدائیوں کو بھنگ (حشیش، جس سے اُن کا نام حشیشین پڑ گیا تھا) پلا کر اپنی بنائی ہوئی جنّت کی سیر کراتا تھا جہاں وہ حسین عورتوں میں گھرے شرابِ ناب کے ساغر لنڈھایا کرتے۔ کچھ روز کے بعد پھر اُنہیں بھنگ پلا کر باہر نکال دیتے تھے۔ وہ واپس جانے پر اصرار کرتے تو کہتے تم ہمارے فلاں دشمن کو قتل کرو تو جنّت میں باریاب ہو سکو گے۔ اِس طرح کئی سلاطین اور اُمرا کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ سکھوں کو بھنگ پینے کی ترغیب دی گئی تھی تاکہ وہ لڑائی میں دلیری سے دشمن کا مقابلہ کریں۔

بھگتی لہر

چھٹی صدی عیسوی تک ہندو چار ویدوں اور اُن کے دیوتاؤں کو بھول چکے تھے اور تری مورتی (وشنو، شیو، برہما) کی پوجا رواج پا چکی تھی۔ پرانوں میں کہا گیا کہ سنسار چکّر سے نجات پانے کے لئے بھگتی (عشق) ضروری ہے چنانچہ وشنو اور اُس کے اوتاروں رام اور کرشن کی محبت ہی کو بھگتی کہا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ شکتی پوجا اور تنتر مت کی بھی اشاعت ہوئی۔ شیو کی زوجہ کی پوجا شکتی کے نام پر کرنے لگے اِسے مہا میا (بڑی ماں) بھی کہتے تھے۔ آٹھویں صدی میں بدھ مت کے زوال کے ساتھ وشنو اور اُس کے اوتاروں رام اور کرشن کے پجاریوں نے بھگتی لہر کا آغاز کیا۔ اُن کے

خیال میں بھگت کا رشتہ وشنو کے ساتھ وہی ہے جو پتنی کا اپنے پتی سے ہوتا ہے۔ بھگتوں کے کلام میں بار بار آتا ہے۔ "میں اپنے بھگوان سے بیاہ کروں گی" رام پُجاریوں میں تُلسی داس اور کرشن پُجاریوں میں راجکماری میراں بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں۔ بنگال اور بہار میں بھگتی کو چیتنیہ، سُورداس اور چنڈی داس نے پھیلایا، اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ میں رام نند اور کبیر نے اس کی اِشاعت کی اور پنجاب میں گورو نانک نے اس کی آبیاری کی۔ بھگت شاعروں نے سنسکرت کے شاعر جے دیو ــــ اس کی نظم گیتا گووندا کے نام سے مشہور ہے ــــ کی طرح جیو آتما کی علامت رادھا کو اور برہمن کی علامت کرشن کو بنا دیا۔ رادھا کی طرح آتما بھی اپنے محبوبِ ازلی یا برہمن کے فراق میں تڑپتی رہتی ہے اور اُس کے وصال سے شاد کام ہوتی ہے۔

بھُوت

یہ لفظ سنسکرت کے مادہ 'بھُو' سے ہے جس کا معنیٰ ہے "ہو جانا، بن جانا" کہتے ہیں کہ خودکشی کرنے والے یا قتل ہو جانے والے کی رُوح خبیث بھُوت بن جاتی ہے۔ بے اولاد کی رُوح بھی بھُوت بنتی ہے جسے اوُت یا اوتر کہتے ہیں۔ بھُوت ویران جگہوں میں بسیرا کرتے ہیں اور روشنی، خوشبو، ہلدی، حنا، حرمل، لوہے، آگ، نمک اور فیروزے سے دُور بھاگتے ہیں۔

بہشت

عربی میں اِسے جنّت کہتے ہیں جس کا معنیٰ ہے وہ سرزمین جو درختوں کی کثرت سے ڈھکی ہوئی ہو یعنی گھنا باغ۔ فردوس پہلوی زبان کا لفظ پیُرا دوزا (سبزہ زار جس کے گرد باڑ لگا دی جائے) کا معرّب ہے۔ یہی انگریزی کا پیراڈائز بھی ہے۔ ہندو اِسے سُورگ، بیکنٹھ یا اندرلوک کہتے ہیں۔ عہد نامۂ قدیم میں باغِ عدن کا ذکر آیا ہے جسے چار دریا دجلہ، فُرات، جیحوں اور فیسوں (سیوں) سیراب کرتے ہیں۔ اِسلامی روایات میں جنّت آٹھ[۹] ہیں جنھیں ہشت بہشت کہا جاتا ہے: دارالجلال جس میں موتیوں کے محلات ہیں، جنّت الماویٰ جس میں زرد تانبے کے محل ہیں، جنّت الخُلد جس کے محل زرد مونگے کے ہیں، جنّت النعیم میں سفید ہیرے کے محل ہیں، جنّت الفردوس جو زرِ سُرخ

کا تعمیر کیا گیا ہے۔ جنّت العدن سرخ موتیوں کا بنا ہے، جنّت الفزار مشک کا اور دار السلام لعل سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اِن میں سرسبز پھل دار درخت ہیں جنہیں دودھ اور شہد کی نہریں سیراب کرتی ہیں۔ اہلِ جنّت کی خدمت پر غلمان یعنی سادہ عذار لڑکے اور خوبصورت حوریں جن کا رنگ نکھرا ہوا گورا اور آنکھوں کی پُتلیاں گہری سیاہ ہیں، مامور ہوں گی۔ مجوسیوں کے بہشت میں اُبھری ہوئی چھاتیوں والی پریکا (پریاں) بہشت کے مکینوں کا جی بہلائیں گی۔ اوستا میں فردوس کے دربان فرشتے کا نام دوہومنو ہے جبکہ مسلمانوں میں رضوان بہشت کا محافظ ہے۔ ہندو مت کے اِندر لوک میں سونے کے محل ہیں، جواہرِ آبدار سے آراستہ، ہر طرف باغ خوشنما موجود ہیں نہریں بہہ رہی ہیں پھول کھل رہے ہیں بیلیں لہلا رہی ہیں، درخت ہر جگہ چھا رہے ہیں گندھروں (آسمانی گویّے) کے سازوں کی گت پر اپسرائیں ترغیب آواز انداز میں ناچ رہی ہیں۔ ناروے سویڈن کی دیو مالا میں جس جنّت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اُس میں جنگجو سُورمے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے ہیں۔ جو مر کر گرتا ہے وہ پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ یونانی فلاسفہ کا بہشت خانۂ بے تشویش ہوگا جس میں فلسفی محویّت کے عالم میں سر جھکائے بیٹھے کائنات کے مسائل پر غور و فکر کیا کریں گے۔

بیاہ کی رسمیں

دُنیا بھر کی اقوام میں بیاہ کی رسمیں دُلہا دُلہن کو نظرِ بد اور خبیث ارواح کی کارستانی سے محفوظ رکھنے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ دُلہا دُلہن پر ہر کس و ناکس کی نگاہ پڑتی ہے اس سے یہ واہمہ پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے بیاہ کے گھر میں کوئی ایسی عورت یا مرد بھی موجود ہو جو نظرِ بد رکھتا ہو۔ بیاہ سے پہلے ہمارے ہاں دُلہا دُلہن کو مانجھے بٹھایا جاتا ہے اور وہ معمولی میلے کچیلے کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اُن کا حُسن و جمال نظرِ بد سے بچا رہے۔ سہرا باندھنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ بد رُوحوں کو بھگانے کے لئے دُلہا کے ہاتھ میں لوہے کی چھڑی دی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے یہاں دُلہا دُلہن کو اگنی کنڈ کے گرد سات چکّر لگوائے جاتے ہیں اور دھرو (قطب ستارہ) کے درشن کرائے جاتے ہیں تاکہ اُن کی برکت سے وہ بھوتوں پریتوں سے بچے رہیں۔ مسلمانوں میں آرسی مصحف کی رسم ادا کرنے کا مقصد بھی یہی ہے اگرچہ بظاہر

اس میں دُلہا دُلہن کا ایک دوسرے کو دیکھنا مقصود ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں شادی کے دن سے پہلے مہندی اور تیل کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ سات سُہاگنیں دُلہن کے بالوں میں تیل چوٗاتی ہیں۔ مہندی کو بد ارواح کے بھگانے کا موثر وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ تیل کی رسم میں دُلہن جس کنواری لڑکی کی پیٹھ تھپکے اُس کا بیاہ اُسی سال ہو جاتا ہے اس لئے کنواری لڑکیاں دُلہن کا گھیرا ڈالے رہتی ہیں۔ وہ اپنی کسی پیاری سہیلی کی پیٹھ پر ہاتھ مار دیتی ہے۔ کافرستان میں دُلہا دُلہن کے باپ کی دو چھڑیاں لے کر اُنہیں آپس میں مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں چلئے نکاح ہوگیا۔ یہ چھڑیاں اُنہیں دے دی جاتی ہیں۔ جُدائی مقصود ہو تو دُلہا یا دُلہن انہیں کھول دیتی ہے۔

یہودیوں اور اکثر مغربی اقوام میں دُلہا دُلہن پر مُٹھی بھر چاول یا گیہوں نثار کرتے ہیں تاکہ وہ پھلیں پھولیں۔ ہمارے دیہات میں گھڑولی بھرنے اور کھارے چڑھانے کی رسمیں ڈھول باجوں کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ لڑکیاں ایک جلوس کی شکل میں گاتی ہوئی گھڑے اُٹھائے جاتی ہیں اور پانی بھر کر لاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ڈھول ایک خاص تال میں پیٹے جاتے ہیں۔ اس پانی سے دُلہا دُلہن کو نہلایا جاتا ہے۔ غسل کے بعد کھارے سے نیچے اُترتے ہوئے دُلہا لوہے کی چھڑی سے چھونٹریاں توڑتا ہے گویا کنوارپنے کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ بیاہ کی آخری رات کو دُلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ گاؤں کی گلیوں کا چکر لگاتی ہے گویا وہ اپنے میکے سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی ہے۔ اس موقعے پر اُس کی سہیلیاں گاتی ناچتی ہیں اور خوب دھما چوکڑی مچاتی ہیں۔ میراثنیں دُلہا کے گھر میں لہک لہک کر گھوڑیاں گاتی ہیں اور انعام پاتی ہیں۔ دُلہن کی رخصتی پر بابل کے گیت گائے جاتے ہیں جنہیں سن کر آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھتے ہیں۔ بارات عام طور سے تاروں کی چھاؤں میں دُلہن کے گھر پہنچتی ہے تاکہ دُلہا شام کے دُھندلکے میں نظرِ بد سے بچا رہے۔ دُلہا کے پیچھے گھوڑی پر شہ بالا بیٹھا ہوتا ہے تاکہ لوگوں کی نظریں دُلہا سے ہٹ کر پڑیں۔ روما میں دُلہا دُلہن کو گود میں بھر کر اپنے گھر کی چوکھٹ کے اندر لاتا تھا اور سب عورتیں مرد مل کر " ٹلاسیو " کا نعرہ لگاتے تھے۔ ٹلاسیو روما کا ایک جوان رعنا ہو گذرا ہے۔ ہمارے دیہات میں چوکھٹ پر تیل گرایا جاتا ہے۔

بیٹھک

بیٹھک اصطلاح میں اُس نشست کو کہتے ہیں جو حاضرات ارواح کے لئے کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں عورتیں رُوحوں کو بُلانے کے لئے بیٹھک کرتی ہیں۔ جو عورت حاضرات کرتی ہے وہ جمعرات کے دن عمدہ پوشاک اور زیورات سے آراستہ ہو کر بدن میں خوشبو لگاتی ہے اور بیٹھ کر گانا سُنتی ہے۔ جب کوئی پری یا رُوح اُس کے سر پر آتی ہے تو وہ زور زور سے اپنا سر ہلانے لگتی ہے۔ اس حالت میں دوسری عورتیں اپنی اپنی حاجتیں اُس کے سامنے پیش کرتی ہیں اور وہ اُن کے سوالات کا جواب دیتی جاتی ہے۔ حاضراتِ ارواح کا یہ طریقہ مختلف اقوام میں مختلف صورت میں رائج رہا ہے۔ شمن مت میں بھی کم و بیش اِسی طریقے سے حاضرات کی جاتی تھی۔ جدید حاضرات کا آغاز اضلاع متحدہ امریکہ سے ہوا۔ نیو یارک کے نواح میں ہائڈس وِل کی بستی میں ایک کُنبہ رہتا تھا: جے ڈی فاکس، اُس کی زوجہ اور دو بیٹیاں مارگریٹ اور کیٹ۔ اِنہیں راتوں کو دستک کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں جنہیں وہ ارواح سے منسوب کرنے لگے۔ شُدہ شُدہ اِس بات کا چرچا مُلک بھر میں ہو گیا جس سے حاضرات کی شروعات ہوئی اور واسطوں کے کام کو فروغ ہوا۔ واسطے دو قسم کے تھے جسمانی اور رُوحانی۔ جسمانی واسطے کسی تاریک کمرے میں رُوح کو نورانی دھندلکے کی صورت میں دکھاتے تھے اور اِن کی زبانی رُوحیں سوالات کے جواب دیتی تھیں۔ امریکیوں نے حاضرات کا یہ طریقہ لال ہندیوں سے لیا ہے۔ لال ہندیوں کے شمن مُردہ عزیزوں کی رُوحوں کو بُلا کر اُن کی مُلاقات رشتہ داروں سے کرواتے تھے۔ امریکیوں نے شمن کو واسطے کا نام دیا۔ راتوں کو ایک خاص کمرے میں اکٹھا ہونا، حاضرین کا واسطے کی مافوق الطبع قوتوں پر اعتماد ہونا۔ واسطے کا اپنے آپ پر وجد و حال طاری کر لینا اور اِس عالم میں رُوحوں کو دکھانا اور اُن کی آوازیں سُنوانا یا اُن سے سوالوں کے جواب لینا یہ سب طریقے لال ہندیوں کے شمن مت سے ماخوذ ہیں البتہ اِن پر سائنس کی اصطلاحات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ شمن مت میں نیک یا سعد اور بد یا شقی رُوحوں پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اِن سے مدد مانگتے ہیں یا دشمنوں کو ایذا پہنچاتے ہیں جب کہ جدید حاضراتِ ارواح میں مُردوں کی رُوحوں کو

بلانے اور اُن سے رابطہ قائم کرنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ شمَن مرد ہوتے ہیں جب کہ جدید حاضرات میں عام طور سے عورتیں واسطہ بنتی ہیں۔ جدید حاضراتِ قدیم شمَن مت ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ سائنس دانوں اور ماہرینِ نفسیات نے واسطوں کا قریب سے مشاہدہ کیا تو اِن میں اکثر عورتیں مکّار ثابت ہوئیں جو چھُپے ہوئے کیمروں سے ارواح دکھاتی تھیں اور خفیہ ٹرانسمٹر سے آوازیں سُنواتی تھیں۔ دیکھنے والے اکثر اثر پذیری کے تحت سمعی و بصری واہموں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں اور ایسی شکلیں دیکھتے ہیں یا ایسی آوازیں سُنتے ہیں جن کا وجود اُن کے ذہن سے باہر کہیں نہیں ہوتا۔ دوسروں کو سمعی و بصری واہموں میں مُبتلا کر دینا قوتِ ارادی کا ایک ادنےٰ کرشمہ ہے جس سے واسطہ بننے والی عورتیں کام لیتی ہیں اور سادہ لوح ناظرین کو "چکمّہ" دیتی ہیں۔ جدید حاضراتِ ارواح اُن چکّروں میں سے ایک ہے جو طلبِ زر کے لئے "روحانیت" کے نام پر چلائے جا رہے ہیں۔

بتیال

چشموں، کنوؤں اور دریاؤں کی ارواح جو مسافروں کو فریب دے کر جان سے مار دیتی ہیں۔ مرگھٹ یا قبرستان میں اندھیری راتوں کو چمکتا ہوا چراغ یا شعلہ دکھائی دیتا ہے اُسے اگیا بتیال کہتے ہیں۔ یہ آوارہ بد رُوح ہے جو مُردے کے قالب میں گھُس جاتی ہے۔ دراصل یہ شعلے ہڈیوں کی فاسفورس سے نکلتے ہیں۔

بیساکھی

پنجاب کا مشہور موسمی تہوار جو دیسی مہینے بیساکھ کی پہلی تاریخ کو دھوم دھام سے منایا جاتا ہے کسان ربیع کی فصل پکنے پر اپنی خوشی کا اظہار گا بجا کر اور ناچ کود کر کرتے ہیں۔ نوجوان جاٹ ڈھولوں کی تال پر بڑے جوش و خروش سے بھنگڑا ناچتے ہیں اور گاہلڑ نچا نچا کر بولیاں کہتے ہیں۔ یہ گاہلڑ قدیم ہڑپائی دور سے لنگ کی علامت چلا آ رہا ہے۔ یہ تہوار ظاہراً دراوڑوں سے یادگار ہے۔

بیلا

دریا کا ٹاپو جہاں کائی اور نرکل کا جنگل ہو۔

بیگ

تاتاری زبان میں شہزادے کو بیگ اور شہزادی کو بیگی کہتے ہیں۔ فارسی والوں نے بیگی کو بیگم بنالیا۔

برات

ہُنڈی کو کہتے تھے جسے دیکھتے ہی روپیہ ادا کر دیا جاتا تھا۔ یہ لفظ اصطلاح میں نصیبہ اور مقسوم کے لئے بھی آیا ہے۔ روایت ہے کہ شب برات کو ہر ایک کا نصیبہ معین کر دیا جاتا ہے۔

باسمتی

باسمتی سُکھداس بہترین قسم کا چاول ہوتا ہے جس میں خوشبو (باس) آتی ہے۔ پشاور میں اسے بارہ کہتے ہیں

بھگیلا

حیدر آباد، بہار اور اُڑیسہ کا ایک دستور ہے جس کی رُو سے نادہند مقروض کو قرضخواہ کے گھر میں چاکر کر کے اپنا قرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر مقروض ادائیگی سے پہلے مر جائے تو اُس کے بیٹے یا بیٹی سے چاکری کا کام لیا جاتا ہے۔ اِس چاکر کو بھگیلا کہتے ہیں۔

بے معنویّت

مغرب کی ایک جدید ادبی تحریک جو شاعری، افسانے، ناول اور ناٹک میں نفوذ کر گئی ہے اِس کا بُنیادی خیال یہ ہے کہ اِنسان کی زندگی بے معنی، بے مصرف اور بے ثمر ہے۔ دُنیا میں کوئی نصب العین ایسا نہیں ہے جس کے حصول کے لئے عملاً جدّوجُہد کی جائے۔ سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی قدریں کھوکھلی ہیں، شاعر اور قصّہ نویس کا منصب نہ اِنسان دوستی کے نصب العین کی ترجمانی کرنا ہے اور نہ اِنسان کے گریزپا اور پریشان تجربات کو کسی نوع کی ہئیت یا معنویّت بخشنا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اُس عمیق یاسیّت اور کلبیّت کی پیداوار ہے جو دو عالمگیر جنگوں کے دوران میں اور ایٹمی ہلاکت خیزی کی دہشت سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ کامیو نے "سسی فس کا اسطور" میں مغرب کے اِنسان کی اِس کلبیّت اور بے معنویّت کی پُرلطف ترجمانی کی ہے اور کہا ہے کہ ترقّی کا خیال محض واہمہ ہے۔ اِنسان مدّتوں کی محنت اور کاوش سے قصرِ تمدّن کی تعمیر کرتا ہے، پھر اچانک اُس کی

تخریبی رگ پھڑک اُٹھتی ہے اور اُسے اپنے ہی ہاتھوں سے مسمار کر دیتا ہے۔ ابتدائے تاریخ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے اور سدا یوں ہی ہوتا رہے گا اس لئے زندگی میں معنیٰ اور قدر کو تلاش کرنا سعیٔ بے ثمر ہے۔ اس طرزِ فکر و احساس نے اہلِ مغرب کو تنزّل کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اُن پر یہ حقیقت مُنکشف ہو چکی ہے کہ افریقہ، ایشیا اور جنوبی امریکہ کی اقوام جن کے اِستحصال سے امریکی اور یورپی اِجارہ دار بے پناہ دولت سمیٹ رہے ہیں اب بیدار ہو چکی ہیں اور اُن کے معاشی تصرّف سے آزاد ہونے کے لئے کشمکش کر رہی ہیں۔ اپنی معاشی اِجارہ داری کے خاتمے کے اندیشے نے اُن کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ اِسی یاسیّت اور خوف کے باعث وہ انسانی زندگی کو بے معنیٰ سمجھنے لگے ہیں اور اِسی کیفیتِ مزاج کی ترجمانی اُن کے قصوں، ناٹکوں اور نظموں میں کی جا رہی ہے۔

بارہ ماسہ

پنجابی لوک شاعری کی مشہور صنف ہے جس میں بارہ دیسی مہینوں کے حوالے سے دردِ فراق کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہیّت

پنجابی کی خاص بحر ہے۔ ہیّت ایک چھند: شعر یا بند میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ سی حرفی میں چار مصرعوں کا بند یا شعر ہوتا ہے۔ اکثر چار مصرعوں کے بند کو ہیّت کہتے ہیں۔ (بنارسی داس جین)

باورچی

ترکی زبان کا لفظ ہے۔

پاژند

قدیم پہلوی زبان کی بدلی ہوئی صورت جو جدید فارسی سے ملتی جلتی ہے اور فردوسی طوسی کی زبان کے مُشابہ ہے۔ اِس میں عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں۔

پان اِسلامزم

بلقان کی عیسائی ریاستوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف اُکسانے کے لئے عہدِ زار شاہی کے روسی ملوکیت پسندوں نے پان سلاوازم کا نعرہ لگایا جس کا مقصد یہ تھا کہ سلاو نسل کے لوگ بلقان میں جہاں کہیں بھی ہوں متحد ہو کر روسی سلاووں کے ساتھ مل جائیں اور دولتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر دیں۔ اِس نعرے کے جواب میں سلطان عبدالمجید عثمانی نے پان اِسلامزم کا تصوّر پیش کیا اور دُنیا بھر کے مسلمانوں کو متحد ہونے کی دعوت دی تاکہ وہ اغیار کا مقابلہ کر سکیں۔ یہی پان اِسلامزم تھا۔

پپیہا

مشہور چڑیا ہے جو برسات کے موسم میں گھنے درختوں کی ڈالیوں پر بیٹھ کر اِس جوش سے پی پی پکارتی ہے کہ چاہنے والوں کے دِلوں میں جُدائی کا داغ سُلگ اُٹھتا ہے۔ اِسی کی آواز پر سنسکرت اور ہندی میں محبوب کو پی، پیا یا پیو کہنے لگے۔

پُتر

سنسکرت میں دوزخ کو پُت کہتے ہیں۔ پُتر کا معنیٰ ہے دوزخ سے بچانے والا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جس شخص کا کوئی بیٹا نہ ہو جو اُس کی شرادھ کی رسوم ادا کر سکے وہ سیدھا نرک یا دوزخ میں جاتا ہے اِسی لئے بیٹے کو پُتر کہنے لگے۔

پٹ رانی: کسی راجہ کی بڑی مہارانی۔ پٹ کا معنیٰ پنجابی زبان میں عزت و وقار کا ہے۔

پتھر کے زمانے

علم الانسان کے طلبہ نے پتھر کے تین زمانے گنائے ہیں جب انسان کے آباء اپنے ہتھیار اور اوزار پتھر کے بناتے تھے اور پہاڑوں کی کھوہوں میں بسیرا کرتے تھے۔ اُن کے قیاس کی رُو سے جاوا سے ملنے والی کھوپڑی کا انسان قدیم ترین پتھر کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ نینڈرتھل کھوپڑی والا درمیانی زمانے سے اور کرومیگنون والا آخری پتھر کے دور کا انسان تھا۔ اس کے بعد دھاتوں کا زمانہ شروع ہوگیا۔ آخری پتھر کے زمانے میں عورت نے گیہوں اگانے کا راز دریافت کیا اور زرعی انقلاب کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔

پٹرولیم

پٹرولیم کا معنیٰ ہے "چٹان کا تیل"۔ پٹرا : چٹان ، اولیم : زیتون کا تیل۔

پٹولا

کناری زبان کا لفظ پٹودا کا معنیٰ ہے ریشمی کپڑا۔ پنجابی میں پٹولا گُڑیا کے ریشمی کپڑوں کو کہتے ہیں۔ پٹ بہ معنیٰ ریشم سے ہے۔

پدری نظامِ معاشرہ

تاریخ عالم میں زرعی انقلاب کے بعد پدری نظام معاشرہ قائم ہوگیا جس میں مرد کی سیادت عورت پر مسلّم ہوگئی اور بچے باپ کے نام سے پکارے جانے لگے۔ من چلے جنگجوؤں نے لشکر اکھٹے کئے اور بستیوں پر قبضہ کرکے ریاست کی بُنیاد رکھی اور دوسروں پر حکومت کرنے کے لئے قوانین بنائے۔ اِس معاشرے میں عورت کا مقام پست ہوگیا اور اُسے بھی گائے بیل اور بھیڑ بکری کی طرح ذاتی املاک میں شمار کرنے لگے۔ مَردوں کی یہ سیادت صنعتی انقلاب تک قائم رہی جس کے بعد عورت مرد کی برابری کی مُدعّی ہوکر اُبھری ہے اور اپنا صدیوں سے کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جدّوجہد کر رہی ہے۔

پدر

باپ کو فارسی زبان میں پدر، سنسکرت میں پتر، یونانی میں پیٹر، جرمن میں واٹر، ڈچ میں

واڈر، ڈینش میں فاڈر، انگریزی میں فادر، فرانسیسی میں پائرے، اطالوی اور ہسپانوی میں پادری، ہندی میں پتا، پنجابی میں پیو کہتے ہیں۔

پروشاپورا

پشاور کا پرانا نام تھا۔

پشکلاوتی

چارسدہ کا پرانا نام جس کا معنیٰ ہے "کنول کا شہر"۔

پرشاد

دیوتاؤں کا پس خوردہ جسے پروہت اور پجاری کھاتے ہیں۔

پری

پروں والی خوبصورت عورت جس کا ذکر کہانیوں میں آتا ہے۔ روایت کے مطابق پریوں کا ملک پرستان کوہ قاف میں واقع ہے۔ قصوں میں شہپال کو ان کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ یہی لفظ انگریزی میں فیری ہے۔

پرش

ہندوؤں کے یہاں کائنات کا تخلیقی اصول یا توانائی جس کے پرکرتی (مادہ) کے ساتھ اتصال سے کائنات معرضِ وجود میں آئی تھی۔

پرہا

چھوٹا ناگپور کے منڈا قبائل میں مختلف گروہ اپنے اپنے ٹوٹم یا نشان سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس قسم کے گروہ کو پرہا کہتے ہیں جس کا ایک سرپنچ ہوتا ہے۔ پنجابی میں یہ لفظ پرھیا ہے جس سے مراد پنچایت ہے۔

پرولتاری

محنت کش طبقے کو سیاسیات کی اصطلاح میں پرولتاری کہتے ہیں۔ اس ترکیب کا لغوی معنیٰ ہے "وہ شخص جس کی کثرت سے اولاد ہو"

پران : پران وہی لفظ ہے جسے ہم پرانا کہتے ہیں یعنی قدیم۔ آج کل کے ہندو ویدوں کو

بھول چکے ہیں اور پُرانوں کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں، جو تعداد میں اٹھارہ ہیں۔ اِن میں برہما، شیو اور وشنو اور اس کے اوتاروں رام اور کرشن کے حالات اور پُوجا پاٹھ کے طریقے درج ہیں۔ پرانوں کی تعلیم یہ ہے کہ دیوتاؤں کی پُوجا کرنا اور پُوجا کی رسوم کو ادا کرنا ہر طرح کی نیکی سے بہتر ہے۔ ان میں بھگوت پُران، وشنو پُران، سکند پُران اور اگنی پُران مشہور ہیں۔

پختون

یہ ترکیب پخت سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے پہاڑی پختون یعنی پہاڑیوں میں بسیرا کرنے والے۔ یہی لفظ بگڑ کر پٹھان بن گیا۔ محمود غزنوی کے زمانے میں علاقہ قندھار کے رہنے والوں کو افغان کہنے لگے جب کہ سلسلۂ کوہِ سلیمان میں بُود و باش رکھنے والے پختون کہلائے۔ عرب ممالک میں پٹھانوں کو سُلیمانی کہا جاتا ہے۔

پُشکر

اجمیر کے پاس ایک جھیل جسے پکھر بھی کہتے ہیں۔ برہما کا تیرتھ ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ آدمی دُنیا بھر کے تیرتھوں پر جائے لیکن پُشکر میں نہ نہائے تو اس کے نیک اعمال اکارت جائیں گے۔

پروہت

زرعی انقلاب کے بعد ریاست وجود میں آئی تو مذہب کی بھی تنظیم کی گئی۔ بادشاہ خود مہا پجاری بن بیٹھے اور پُوجا پاٹھ کی رسمیں ادا کرنے کا کام پروہتوں کے سپرد کیا گیا جس سے پیشہ ور مذہبی پیشواؤں کی جماعت بن گئی اور شروع ہی سے ریاست اور مذہب کا اتحاد عمل میں آگیا۔ پروہتوں نے اپنے مذہبی اثر و رسوخ کو حصول زر و مال کا وسیلہ بنا لیا۔ وہی بادشاہوں کی رسم تاجپوشی ادا کرتے تھے اس لئے بادشاہ ہر طرح انہیں خوش رکھتے تھے۔ پروہتوں کے تموّل کا ثبوت فرعون ریمسیس سوم کے عہد کے ایک تاریخی مخطوطے سے ملتا ہے۔ اِس میں لکھا ہے کہ اُس کے عہد میں پروہتوں کے پاس ایک لاکھ ستّر ہزار غلام تھے، سات لاکھ پچاسی ہزار ایکڑ اراضی اُن کی املاک میں تھی، اُن کے پاس پانچ لاکھ مواشی تھے اور مصر و شام کے ۱۶۹ دیہات معبدوں کے ساتھ وقف تھے۔ یہی حال بابل، اشوریا اور کنعان کا تھا۔ کنعان میں پروہتوں کے لئے عُشر اور صدقہ کے محصول لگائے گئے تھے جو بعد میں

بنی اسرائیل نے بھی اپنا لئے۔ پروہتوں نے عشتار، آئسس، اندھتا وغیرہ دیویوں کے معبدوں میں مقدّس عصمت فروشی کا کاروبار جاری کر رکھا تھا۔ یاتری دیوی کے نام پر خرچی دے کر دیوداسیوں سے تمتّع کرتے تھے۔ یہ رقم پروہتوں کی جیب میں جاتی تھی۔ گوتم بدھ، کنفیوشس اور یسعیاہ ثانی نے پروہتوں کی دکان آرائی اور دین فروشی کے پردے چاک کئے لیکن سلاطین اور پروہتوں کے اتحاد نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ سائنس کے فروغ اور روشن خیالی کے اس دور میں بھی پسماندہ ملکوں میں پروہتوں کا اقتدار برقرار و بحال ہے اور یہ لوگ مذہب کے نام پر سادہ لوح عوام سے روپیہ بٹور رہے ہیں۔ مغرب کے سامراجیوں نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک فتح کئے تو وہاں پادریوں کو بھیج دیا تاکہ ملکیوں کو عیسائی بنا کر انہیں قومیت اور وطنیت کے احساسات سے محروم کر دیں۔ فی زمانہ تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں دین فروشی کا کاروبار بحال رکھنے کے لئے پروہتوں نے ملکی رجعت پسند جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے۔

پکھّی وارا

ایک خانہ بدوش قبیلہ جو پرندوں (پکھّی) کے شکار پر گذر اوقات کرتا ہے۔

پُل صراط

پہلوی زبان میں اسے چنوت کہا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے اکٹھا کرنے والا۔ مجوسیّت کی رُو سے ہر شخص کو چنوت کے پُل پر سے گذرنا ہوگا جو بال سے باریک تر اور تلوار کی دھار سے تیز تر ہوگا۔ سعید اس پر سے آرام سے گذر جائیں گے اور شقی کٹ کٹ کر دوزخ میں جا گریں گے۔

پلیتہ

موم بتی، دھونی کا تعویذ جو حاضرات ارواح، آسیب اُتارنے یا جادو کی رسوم ادا کرتے ہوئے جلاتے ہیں۔

پنج پیر

پنج پیروں کا تصوّر برصغیر میں قدیم زمانے سے موجود ہے۔ ان کے ناموں میں البتہ اختلاف

ہے۔ وارث شاہ نے اپنی ہیر میں حضرات خواجہ خضر، بابا فرید الدین گنج شکر، لال شہباز قلندر، سیّد جلال بخاری اور بہاؤ الدین ذکریا کو پنج پیر کہا ہے۔ لاہور میں خانقاہ پنج پیراں کے نام سے ایک زیارت گاہ موجود ہے۔ اودھ میں پنج پیر کا مَت رائج ہے جس میں ہندو مُسلم پیر اکھٹے کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ہیں ستی، بھیروں، رجب سالار، سکندر دیوانہ، ہتھیلی پیر۔ پنج پیر فی الاصل پنجاب کے پانچ دریاؤں کی علامتیں ہیں۔

پنچال

پنج آل یعنی پانچ بیٹے بجھوا کے جن کی رعائیت سے پنجاب کو پنچال کہا جاتا تھا۔ پانڈووں کی رانی دروپدی پنچال کے راجہ دروپد کی بیٹی تھی۔ سنسکرت میں پنچال کو پنچاندا (پانچ دریا) بھی کہا گیا ہے۔ ایرانیوں نے اسے پنجاب (پنج آب) کا نام دیا۔

پنج کلیان

وہ گھوڑا یا بھینس جس کے چاروں کُھر اور ماتھا سفید ہوں۔

پنج گویّہ

ہندو ناپاکی یا نجاست دور کرنے کے لئے پنج گویّہ (گائے کی پانچ چیزیں) دُودھ، مکھن، دہی، پیشاب اور گوبر ملا کر پیتے ہیں۔

پھمنیاں

پنجابی دیہات کا لوک ناچ ہے۔ ناچنے والے ڈھول کی تال پر کبھی جھکتے ہیں کبھی کھڑے ہو جاتے اور ہاتھوں سے تالی پیٹتے جاتے ہیں۔ شروع میں ان کی رفتار سُست ہوتی ہے جو بتدریج تیز ہوتی جاتی ہے۔

پوُجا

قدیم زمانے سے اِنسان جن اشیاء کی پوُجا کرتا رہا ہے اُن کے کچھ گروہ ہیں (۱) آسمانی: سورج، چاند، سیارے، گرج چمک (۲) زمینی: دھرتی ماتا (۳) جنسیاتی: یونی اور لنگ (۴) حیوانی: سانپ، بیل، گائے وغیرہ (۵) اِنسانی: آباء و اجداد کی پوُجا (۶) یزدانی: دیوتاؤں یا

خداوند خدا کی پوجا۔

پچھے کٹنی

مکار عورت جو جوان لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر اُن کی آبرو کا سودا کرتی ہے۔ اس ترکیب سے پنجابی دیہات کی ایک حکایت وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کے یہاں مہمان ٹھہرا۔ کئی دن گذر گئے لیکن وہ جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آخر تنگ آ کر میاں بیوی نے ایک تجویز سوچی۔ عورت کوٹھڑی میں جا کر لکڑی سے پرانی روئی کے لحاف (پچھے) کو زور زور سے کوٹنے لگی اور چیخ چیخ کر گالیاں بکنے لگی مہمان نے گھبرا کر پوچھا یہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ میزبان نے کہا کہ میری عورت بڑی بدمزاج ہے، بچوں کو پیٹ رہی ہے۔ یہ سُن کر مہمان بھاگ گیا۔

پہلوان

پہلوی زبان میں شریف اور خاندانی آدمی کو پہلوان کہتے ہیں۔ اصل لفظ پہلوا تھا۔

پیپل

وِشنو کا مقدس درخت جسے ہندو دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔ عورتیں اس کی جڑوں میں دودھ انڈیل کر اس کی پوجا کرتی ہیں اور اس کا پرکما (طواف) کرتی ہیں۔ اس کی ٹہنیوں سے رنگ برنگ کے دھاگے باندھ کر اولاد کے حصول کے لئے منتیں مانی جاتی ہیں۔

پیدائش

انسان کی پیدائش کے بارے میں اقوامِ عالم کی دیومالا میں مختلف روایات ہیں عہد نامہ قدیم میں ہے کہ خدا نے آدم کا پُتلا اپنی ہی صورت پر بنایا اور اس میں اپنی رُوح (سانس) پھونکی جس سے وہ زندہ ہو گیا پھر ایک دن سوتے میں اُس کی پسلی سے حوّا پیدا کی۔ ایک ہندی روایت میں خدا نے پانی میں بیج ڈالا جو انڈا بن گیا۔ اس انڈے میں سے برہما جی نکلے۔ انہوں نے اپنے آدھے جسم کو وِراج (نر) اور آدھے کو شت رُوپا (ناری) بنایا۔ ان سے منو جی پیدا ہوئے جن کے سبب دیوتا، آسمان اور زمین پیدا ہوئے۔ افلاطون نے ایک قصے کا حوالہ دیا ہے

جس میں لکھا ہے کہ ابتدا میں ایک ہی متنفس تھا جس کے دو ٹکڑے کر کے نر اور مادہ پیدا کئے گئے۔ اُس کے خیال میں جنسی کشش کا راز اِس بات میں ہے کہ یہ دونوں ٹکڑے دوبارہ ایک دوسرے میں ضم ہونے کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔ جاپانی دیو مالا میں بنی نوع انسان ازا ناگی اور ازا نامی کی اولاد سے ہیں۔

پیشاچی

پیشاچ یا گندے لوگوں کی زبان۔ قدیم آریا شمال مغربی ہند کے اصل باشندوں کو وحشی اور گندا کہتے تھے اِس لئے اُن کی بولی کو بھی پیشاچی کہنے لگے۔

تابوتِ سکینہ

یہودیوں کا مقدس صندوق جس میں جنابِ موسیٰ کا عصا، شریعت کی الواح، مقدس شمعدان اور من کا مرتبان رکھے تھے۔ یہودی اسے میدانِ جنگ میں لے جاتے تھے کہ اس کی برکت سے فتح نصیب ہو۔ اسے کیکر کی لکڑی سے بنایا گیا تھا اور سونے کے پتروں سے منڈھا گیا تھا۔ اس پر کروبیوں کی شبیہیں بنی تھیں جن سے یہواہ جنابِ موسیٰ سے مخاطب ہوا کرتا تھا۔ بخوکد نفر شاہِ بابل نے یروشلم فتح کیا تو مسجدِ سلیمان کے ساتھ تابوت کو بھی برباد کر دیا۔

تاریخی ارتقاء

مورخین تاریخی واقعات کو حتی الامکان صحت اور دیانت سے بیان کرتے ہیں اور فلاسفۂ تاریخ ان کی ترجمانی کر کے تاریخی حرکت یا تمدنی ارتقاء کے قوانین دریافت کرتے ہیں تاکہ تاریخ کو سائنس اور فلسفے کا درجہ دیا جائے۔ فلسفۂ تاریخ میں عبدالرحمٰن ابن خلدون کو اولیت کا شرف حاصل ہے جیسا کہ مشہور انگریز مورخ ٹوئن بی نے ابن خلدون کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں معاشرۂ انسانی کے ارتقاء کے قوانین مرتب کئے اور تاریخ نگاری کو سائنس بنا دیا۔ اس پہلو سے وہ فلسفۂ تاریخ کا بانی ہی نہیں عمرانیات کا موجد بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ابن خلدون کے خیال میں بدوی یا صحرائی انسانی معاشرے میں سبقت کا درجہ رکھتے ہیں کیوں کہ تمام اقوامِ عالم اس ابتدائی مرحلے سے گذر کر تمدن و حضارت کی جانب قدم بڑھاتی رہی ہیں۔ جب صحرائی اور کوہستانی مہذب و متمدن اقوام پر غلبہ پا کر انہیں فتح کر لیتے ہیں تو خود مفتوحین کا تمدن اختیار کر لیتے ہیں اور عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر ابتدائی شجاعت اور

مہم جوئی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ صحرائیوں کا ایک اور ریلا آتا ہے اور ان پر غالب آجاتا ہے۔ یہ چکّر یونہی چلتا رہتا ہے وہ کہتا ہے کہ کسی سلطنت کا خاتمہ اتنا ہی قطعی اور یقینی ہے جتنا کہ کسی شخص کا بوڑھے ہو کر موت سے ہمکنار ہونا۔ ابن خلدون نے انسانی معاشرے پر طبیعی اثرات سے محققانہ بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جغرافیائی ماحول کے اثرات سیاسیات اور اقتصادیات ہی پر نہیں ہوتے بلکہ انسان کی شکل وصورت، عادات و اطوار اور طرزِ فکر و احساس پر بھی ہوتے ہیں۔ ویکو، مونتسکو اور ٹامس بکل نے اِس پہلو سے ابن خلدون سے اِستفادہ کیا ہے اور تاریخی جبریت اور تاریخی عمل کے دولابی (دائرے میں) ہونے کے تصورات بھی اُسی سے اخذ کئے ہیں۔ سپنگلر بھی تاریخی جبر کا قائل ہے۔ اُس کے خیال میں اقوام عالم عروج، جمود اور زوال کے ادوار سے گذرتی ہیں جیسے انسان بچپن، شباب اور بڑھاپے کی منازل سے گذرتا ہے۔ سپنگلر نے کہا ہے کہ مغربی اقوام تنزل کی شکار ہو چکی ہیں۔ کروچے نے تاریخ کو فلسفے کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ مذہب بحیثیت ایک زندہ اور فعّال قوت کے ختم ہو چکا ہے اور اب آرٹ اُس کا نعم البدل بنتا جا رہا ہے۔ ہیگل کا تاریخی نظریہ اُس کی مثالیاتی جدلیات سے وابستہ ہے۔ اُس کے خیال میں امثال و افکار کا تصادم تاریخی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ اکابر فلاسفۂ تاریخ میں ٹوئن بی تاریخی عمل میں قدر و اختیار کا قائل ہے۔ اُس کے خیال میں اگر کسی تنزل پذیر قوم میں اپنی زوال پذیری کا شعور پیدا ہو جائے اور وہ نامساعد حالات کا چیلنج قبول کرلے تو وہ دوبارہ عروج حاصل کر سکتی ہے۔ اُس کا نقطۂ نظر مذہبی ہے اور وہ عیسائیت کی ہمہ گیر اشاعت و مقبولیت کو انسانی مشکلات کا واحد حل سمجھتا ہے۔ کارل مارکس نے تاریخ کی جدلیاتی مادی ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ طبقاتی کشمکش تاریخی حرکت و ارتقار کا بڑا سبب ہے اور تاریخ کے بنیادی عوامل شروع سے معاشی رہے ہیں: پیداوار، تقسیم اور صرف۔ یہی چیزیں بالآخر زندگی کے دوسرے شعبوں کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا اخلاقی، فلسفیانہ ہوں یا ادبی ـــ متاثر کرتی ہیں۔ پیداوار اور اس کے علائق معاشرے کی اقتصادی بنیاد استوار کرتے ہیں۔ مادی اشیاء کی پیداوار کا طریقہ عمرانی، سیاسی

اور رُوحانی اعمال کی تشکیل کرتا ہے۔ انسان کے وجود کا تعیّن اُس کے شُعور سے نہیں ہوتا بلکہ اقتصادی وعمُرانی احوال اُس کے شُعور کا تعیّن کرتے ہیں۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے اپنے خیالات فلسفہ کے مدارس فِکر، اخلاقی اصول، مذہبی عقائد، جماعتی تعصبات اور فنیّ ذوق کو منطقی استدلال سے پیدا ارتقاء بخشتا ہے۔ یہ اُس کی بھُول ہے۔ فی الاصل بُنیادی معاشی عوامِل اُس کے خیالات کا رُخ و رُجحان متعیّن کرتے ہیں۔ اسی طرح کارل مارکس بھی تاریخی عمل میں جبریّت کا قائل ہے۔ اُس کے خیال میں افراد خواہ وہ کتنے ہی قابل اور ذہین ہوں تاریخ کے رُخ کو موڑ نہیں سکتے۔ وہ کہتا ہے کہ جبر کا شعور ہی ہمیں قدر و اختیار عطا کرتا ہے یعنی اِنسان اپنے طبیعی احوال کا انتخاب کرنے میں مجبور ہے البتّہ اِس جبر کی حدود میں رہ کر وہ حالات کو بدلنے پر قدرت رکھتا ہے۔

تامِل کے الفاظ

انگریزی کے الفاظ آئوری (ہاتھی دانت) ایپ (لنگور) پی کاک (مور) رائس (چاول) اصل میں تامِل کے الفاظ ہیں۔

تاش

یہ کھیل چینیوں سے لیا گیا ہے۔ ایک قسم کے ریشمی کپڑے کو بھی تاش کہتے ہیں۔ تاش کا معنیٰ پتھر ہے اِسی سے تاشقند ہے۔

تال

موسیقی کی اصطلاح میں ہاتھ پر ہاتھ مار کر (تالی) سُر کو ضبط کرنے کا نام تال ہے۔ مشہور تالیں تعداد میں سترّہ ہیں۔ اِن میں سُلفاختہ (دس ماترے۔ اصول فاختہ)، فرودست (۱۴ ماترے) اور پشتو (سات ماترے) ایرانی موسیقی سے یادگار ہیں۔

تان

تان کا لفظی معنیٰ ہے پھیلاؤ جیسے مثلاً چادر تان لینا۔ موسیقی کی اِصطلاح میں سُروں کے دلکش پھیلاؤ کو تان کہتے ہیں۔ تان توڑنا: سُر کو سَم پہ لاکر ختم کرنا؛ تان میں تکلّیں اُڑانا: بہت

اونچی تانیں لینا؛ تانوں کے لچھے: گٹکریوں کے زیر و بم)۔ بول تان اُستاد تصدق خاں کی ایجاد ہے۔ اِس میں راگ کے الفاظ کو سُوروں کے مختلف ٹکڑوں میں گایا جاتا ہے اور اِس سے مختلف شکلیں بنتی ہیں۔ بول تان آگرے کی گائیکی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ تان کی معروف قسمیں ہیں: شُدھ تان، کوٹ تان، مشرا تان، کمپت تان، النکارک تان، گمک تان، بول تان۔

تاؤمت

چین کا ایک مسلک جس کا بانی لاؤتسے تھا۔ تاؤ سے مراد ہے آفاقی قانون جو یانگ (روشنی، حرکت، قوت) اور ین (تاریکی، جمود) سے بالاتر ہے۔ لاؤتسے اپنے پیروؤں سے کہا کرتا تھا کہ وہ دُنیا سے کنارہ کش ہو کر کسی پہاڑ یا جنگل میں قیام کریں اور فطرت کے نظاروں پر تعمق کیا کریں۔ اُس کی تعلیم تھی "اپنے غرور کو دُور کرو، بلند نظری اور ترقی و تمول کی خواہش کو تج دو، جدّوجہد کو چھوڑ دو۔ ان باتوں سے تمہارے کردار کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" تاؤمت کے اثرات چینی مصوّری پر گہرے ہوئے چینی تصاویر میں فطری مناظر کے بڑے حسین نمونے ملتے ہیں جو بعض پہلوؤں سے منفرد اور بے مثال ہیں۔ برٹرنڈرسل نے چینی مصوّری کو دُنیا کی عظیم ترین مصوّری کہا ہے۔

تثلیث

کلیسیائے روم کے اقانیم ثلاثہ ہیں خداوند، رُوح القدس، جناب مسیح۔ تثلیث کا تصوّر اکثر قدیم اقوام میں ملتا ہے۔ پہلی تثلیث سُمیریوں کی تھی: انُو، انلل، ایا۔ مصریوں کی تثلیث: اوزیرس، آئسس، ہورس۔ ہندوؤں کی تثلیث جس کی علامت اوم کا کلمہ ہے: اندر، وایو، مترا۔

تحریر

تحریر کی ایجاد سے انسان نے تہذیب و تمدّن کی طرف بڑا قدم اُٹھایا کیوں کہ وہ اپنے خیالات اور کارناموں کو محفوظ کرنے کے قابل ہوگیا۔ تحریر کا آغاز تصویروں سے ہوا تھا جو پتھر کے زمانے کے غاروں سے دریافت ہوئی ہیں۔ سب سے قدیم تحریر سُمیریوں کی ہے جسے پیکانی رسم الخط کہتے ہیں۔ مصری ہیروغلیفی تصویر نگاری ہی کی صورت تھی۔ کنعانیوں یا فونیقیوں نے سہولت فہم کے لیے

سمیریوں کی پیکانی اور مصریوں کی ہیروغلیفی رسوم تحریر سے چند علامات لے کر انہیں الفبا کی صورت میں مرتب کیا یہی الفبا آرامی، عبرانی، عربی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت اور ان کے واسطے سے دوسری اقوام کی زبانوں میں رواج پاگئی۔ چینی رسم تحریر البتہ خالص ملکی پیداوار تھی اور اُوپر سے نیچے لکھی جاتی تھی۔ اِس کے لیے کئی علامتیں حفظ کرنا پڑتی تھیں۔ موجودہ چینی حکومت نے اِسے بہت کچھ آسان بنا دیا ہے۔

تحلیل نفسی

تحلیل نفسی ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ کا مشہور نظریہ اور طریقۂ علاج ہے جو نفسیاتی دباؤ اور ذہنی کشمکش پر مبنی ہے۔ فرائڈ ۱۸۵۶ء میں وی آنا (آسٹریا) کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے نہائت ذہین اور سنجیدہ تھا۔ طبی تعلیم کے دوران میں اُس نے اعصاب پر قابلِ قدر کام کیا اور اپنی تحقیق کے باعث ملک بھر میں مشہور ہوگیا۔ ہسٹیریا پر تحقیقی کام کرتے ہوئے وہ فرانس کے مشہور ڈاکٹر شرکو کے حلقۂ تدریس سے وابستہ ہوگیا جو اِس مرض کے علاج کے لئے ہپناٹزم سے کام لے رہا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر شرکو نے ڈاکٹروں سے مخاطب ہو کر کہا "فتورِ ذہن کے تمام مریضوں کی جنسی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ خلل ہوتا ہے۔ تم جتنا غور کروگے اِس خلل کو لازماً پاؤ گے"۔ شرکو کا یہ جملہ فرائڈ نے پلّے باندھ لیا اور یہی خیال اُس کی تحلیل نفسی کا سنگ بنیاد بن گیا۔ پیرس سے لوٹ کر فرائڈ نے ڈاکٹر برائر سے مِل کر کام کرنا شروع کیا۔ ہسٹیریا کی ایک مریضہ کا علاج ہپناٹزم سے کرنے کے دوران میں ڈاکٹر برائر نے محسوس کیا کہ غشی کی حالت میں مریضہ کو اپنی ذات کے بارے میں بے تکلّف اور بے محابا باتیں کرنے کا موقع دیا جائے تو ہوش میں آنے کے بعد وہ افاقہ محسوس کرتی ہے مزید برآں خود فراموشی کے عالم میں مریضہ کو اپنی گذشتہ زندگی کے وہ واقعات بھی یاد آجاتے ہیں جن سے وہ جذباتی طور پر متاثر ہوئی تھی اور جو بیداری کی حالت میں اُسے یاد نہیں آتے تھے۔ برائر نے اس علاج کا نام طریقۂ گفتگو رکھا۔ مریضہ شفایاب ہوگئی تو فرائڈ اور برائر نے اِس طریقۂ علاج کو کامیابی سے جاری رکھا۔ انہی ایّام میں شرکو کے ایک شاگرد پائرے ژینے نے تحت شعور کی جانب توجہ دلائی اور ایک مقالے میں ثابت کیا کہ ہپناٹزم کی مدد سے ہسٹیریا کے مریضوں

کی بھولی بسری یادوں کو شعور کی سطح پر لایا جا سکتا ہے جس سے اُس کا جذباتی تناؤ دور ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد بریُر اِس طریقۂ علاج سے دست کش ہو گیا لیکن فرائڈ نے ثابت قدمی سے اِسے جاری رکھا۔ وہ مریض کو آرام سے لٹا دیتا خود اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر بیٹھ جاتا اور مریض کو اپنے متعلق باتیں کرنے کی ترغیب دلاتا رہتا۔ اُس نے محسوس کیا کہ مریض کے ذہن۔۔ بعد میں اِسے لاشعور کا نام دیا گیا۔۔ کی مزاحمت کے باعث مریض باتیں کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر سے مانوس ہونے پر یہ مزاحمت ختم ہو جاتی ہے تو مریض کے اسباب مرض روشن ہو جاتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں مریض یا مریضہ اپنی محبت معالج کی ذات سے وابستہ کر دیتی ہے۔ یہ مرحلہ بڑا نازک ہے۔ کئی جوان عورتوں نے فرائڈ سے اظہارِ عشق کیا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ عارضی اور عبوری مرحلہ ہے۔ تحلیل نفسی کے دوران میں دبائی ہوئی اُلجھنیں شعور کی سطح پر اُبھر آتیں اور مریض ذہنی کشمکش سے نجات پا کر شفایاب ہو جاتے تھے۔ کئی برسوں کے تجربات کے بعد فرائڈ نے ڈاکٹر شرکو کی تائید کرتے ہوئے کہا "جنسیاتی محرومی ہی فتورِ ذہن کا اہم سبب ہے"۔ اُس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ تھا کہ صحت مند جنسی زندگی بسر کرنے والے بہت کم فتورِ ذہن میں مُبتلا ہوتے ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں فرائڈ نے اپنی معرکہ آراء کتاب "خوابوں کی ترجمانی" شائع کی جس سے طبّی اور نفسیاتی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ فرائڈ نے ژینے کے تحت شعور کے تصوّر پر غور کرتے ہوئے لاشعور کا انکشاف کیا اور اپنے دوسرے انکشاف لاشعوری دباؤ کے حوالے سے کہا کہ دبائی ہوئی تلخ اور ناگوار خواہشات لاشعور میں جاگزیں ہو جاتی ہیں اور معاشرے کے مطالبات سے ٹکرا کر نفسیاتی نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔

فرائڈ کے خیال میں لاشعور کے عناصرِ ترکیبی تین ہیں (۱)۔۔ موروثی جبلتیں اور طبعی میلانات (۲)۔۔ عادات و خصائص جو سن شعور کے ساتھ راسخ ہو جاتے ہیں (۳)۔۔ تلخ واردات جو دبا دیئے جاتے ہیں اور لاشعور میں جا کر اُلجھنیں بن جاتے ہیں۔ فرائڈ کے دو شاگرد کارل ژنگ اور الفریڈ ایڈلر اُس کے ہمہ جنسیت کے نظریئے کے باعث اُس سے الگ ہو گئے اور اُنہوں نے

اپنے اپنے مستقل دبستانِ نفسیات کی بنیاد رکھی۔ ژنگ نے اپنے نظریئے کو تحلیلی نفسیات کا نام دیا۔ وہ اجتماعی لاشعور پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دیو مالا کے قصّے، لوک کہانیاں وغیرہ لاشعور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُس کا نقطۂ نظر صوفیانہ اور عارفانہ ہے۔ اُس نے ایک قسم کی ہمہ گیر نفسیاتی توانائی کی جانب توجہ دلائی ہے جو صوفیوں کے اِشراق سے ملتی جُلتی ہے۔ ژنگ تاؤمت، زین بُدھ مت، یوگا اور تحلیل نفسی میں اقدارِ مشترک کا بھی قائل ہے۔ اُس نے فرائڈ کے لاشعور، طِفلی جِنسیت، نفسیاتی دباؤ اور ایڈیپس کی اُلجھن ـــــ صغر سنی سے بیٹی کی باپ سے اور بیٹے کی ماں سے جِنسی محبت ـــــ کو رد کر دیا اور فرائڈ کے اِس دعوے پر بھی صاد نہیں کیا کہ نفسیاتی دباؤ، لاشعوری مزاحمت اور نفسیاتی کشمکش کو پیشِ نظر رکھے بغیر فتورِ ذہن کی تشخیص اور علاج ممکن نہیں ہے۔ ژنگ نے ادھیڑ عمر کے لوگوں کی نفسیات پر قابلِ قدر کام کیا ہے اور انہیں تکمیلِ ذات کی دعوت دی ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح پارس تانبے کو سونے میں بدل دیتا ہے اِسی طرح تکمیلِ ذات اِنسان کے ذہن و قلب سے کھوٹ کپٹ کو دُور کر کے اُس کی شخصیت کو کُندن بنا دیتی ہے۔ فرائڈ نے نفسِ اِنسانی کی تقسیم یوں کی تھی (۱) ـــــ شعور (۲) ـــــ ماقبل شعور یا تحت شعور (۳) ـــــ لاشعور۔ ژنگ اجتماعی لاشعور کو اہم سمجھتا ہے۔ اُس کے خیال میں اجتماعی لاشعور کے موضوعات اصل عنوان ہیں جن کا اظہار لوک کہانیوں اور دیو مالائی قصّوں میں ہوتا ہے۔

الفریڈ ایڈلر نے کہتری کی اُلجھن کو اِنسان کے فتورِ ذہن کا سب سے بڑا سبب قرار دیا اور فرائڈ کے جِنسیاتی مفروضات کو رد کر دیا اِس ضمن میں اُس کی تحقیقات نے تعلیم و تربیت پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں اور معلّمین نے اُس کے اِنکشافات سے بہت کچھ اِستفادہ کیا ہے۔

فرائڈ کا ایک اِنقلابی انکشاف طِفلی جنسیات کا ہے۔ اُس سے پہلے عام عقیدہ یہ تھا کہ بچے کی کوئی جِنسی زندگی نہیں ہوتی۔ اُس نے ثابت کیا کہ بچہ ماں کا دودھ پیتے وقت بھوک کے ساتھ ساتھ جِنسی خواہش کی تشفّی بھی کرتا ہے (شہوانی توانائی (لبائڈو۔ بعد میں فرائڈ نے اِس کے تصوّر کو وسعت دے کر اسے ایراس کا نام دیا تھا) پیدائش کے وقت بچے کے جسم کے مختلف اعضاء

میں منتشر ہوتی ہے لیکن دودھ پیتے وقت ہونٹ اس کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اُس کے خیال میں ایڈپس کی اُلجھن اور تختہ کی اُلجھن ـــ یہ اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ماں باپ بچے کو اپنے عضوِ خاص سے کھیلنے سے سختی سے منع کرتے ہیں اور اُسے کاٹ دینے کی دھمکی دیتے ہیں، لڑکیوں میں یہ اُلجھن اس احساس سے نمود پذیر ہوتی ہے کہ اُن کا عضوِ خاص کاٹ دیا گیا ہے ـــ ہماری نفسیاتی زندگی پر دُور رس اثرات ثبت کرتی ہے۔ فرائڈ کی خوابوں کی ترجمانی بھی اُس کی قابلِ قدر دین ہے۔ اُس نے بے شمار خوابوں کے تجزیے کر کے ثابت کیا ہے کہ ہم اپنے خوابوں میں اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کرتے ہیں۔

فرائڈ کے نظریے کو سائنٹفک کہا جاتا ہے لیکن یہ بات صرف ایک حد تک درست ہے۔ اُس نے ایڈپس کی اُلجھن کو تحلیلِ نفسی کا مرکز و محور قرار دیا ہے لیکن یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ میلی نوسکی نے ثابت کیا ہے کہ جن وحشی قبائل میں مادری نظامِ معاشرہ قائم ہے یعنی جہاں عورت کو مرد پر سیادت حاصل ہے وہاں ایڈپس کی اُلجھن کے نمود پذیر ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کیوں کہ بیٹے باپ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے مزید براں فرائڈ کے یہاں دُوئی کارفرما ہے: انا اور اڈ، اصولِ حقیقت اور اصولِ حظ، حیات کی جبلت اور مرگ کی جبلت، ایراس اور تھانے ٹاس (موت) وغیرہ۔ اس لئے اُس کے اِن کے افکار کو مابعد النفسیاتی کہا جا سکتا ہے۔ فرائڈ کے پیروؤں ایرک فروم، کرن ہورنی وغیرہ نے ان مفروضات میں بہت کچھ ترمیم کر لی ہے۔ فی زمانہ اُس کی ہمہ جنسیت، ایڈپس اُلجھن، موت کی جبلت، جبریت، قنوطیت اور خود دشمنی کے بارے میں اہلِ علم متردّد ہیں لیکن طفلی جنسیات، نفسیاتی دباؤ، ذہنی کشمکش اور خوابوں کی ترجمانی کے بارے میں فرائڈ کی تحقیقات کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اُس کے افکار نے معاصر فن و ادب پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں اور قصوں میں شعوری رَو کے اسلوب کو رواج دیا ہے جس کی جھلک ہمیں مارسل، پروست، جیمز جائس اور جینا وولف کے قصوں میں دکھائی دیتی ہے۔

تجربیت

فلسفے کا ایک مکتب جس میں فلسفے میں سائنسی نقطۂ نظر اور طرزِ تحقیق کو رواج دینے کی کوشش

کی گئی ہے۔ اس کے بہترین اصول سٹوارٹ مل کی کتاب "منطق" میں ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ صحیح علم کے حصول کے لیے صحیح وسائل کا اختیار کرنا ضروری ہے اور یہ صحیح وسائل ہمیں سائنس ہی فراہم کر سکتی ہے۔ تجربیت ذہنی واردات کے ربط و تعلق پر مبنی ہے مثلاً بچہ جانتا ہے کہ آگ جلاتی ہے کیوں کہ اُس کے تجربے میں جلنے اور جلانے کا عمل بہ یک وقت ظہور میں آتے ہیں۔ تجربیت پسند اخلاقیات میں افادیت کے قائل ہیں جیریمی بنتھم کی طرح "زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ مسرت" ہم پہنچانے کو اخلاقیات کا نصب العین مانتے ہیں لیکن اس افادیت میں ایک خامی یہ ہے کہ جب ہر قانون ساز اپنی ہی لذت اور مسرت کی جستجو میں سرگرم ہوگا تو وہ دوسروں کی لذت یا مسرت کے لئے قوانین کیسے بنا سکے گا اور افراد کی مسرتیں ایک جگہ اکھٹی کیسے ہوں گی۔ بعض نئے مکاتب فلسفہ مثلاً منطقی تحلیل، نو حقیقت پسندی اور منطقی ایجابیت وغیرہ تجربیت ہی کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔

تخت کی رات

شبِ عروسی۔ اسے سہاگ رات اور شبِ زفاف بھی کہتے ہیں۔

تخلیقی عمل

یہاں فن کار کا تخلیقی عمل مراد ہے۔ خارجی اشیاء کا عکس فنکار کے تخیل پر پڑے تو تخلیقی ہیولا بنتا ہے جس میں فنکار کا تفکر قدر و معنویت پیدا کرتا ہے اور قوتِ اظہار اسے فنی پیکر عطا کرتی ہے۔ عمل اظہار کے تین مراحل ہیں۔ فن کار کے ذہن میں ایک عرصے تک کوئی خیال مچلتا رہتا ہے اور اس کے تخیل پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور فنکار شعوری طور پر اس پر فکر کرتا رہتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں یہ خیال خوابیدگی کی حالت میں رہتا ہے۔ آخری مرحلے میں یہی خیال فنی پیکروں کی صورت اختیار کر کے فن کار پر منکشف ہو جاتا ہے اور وہ اسے الفاظ، رنگوں یا نغموں وغیرہ میں منتقل کر دیتا ہے۔ فن کے نفسیاتی محرکات سے بحث کرتے ہوئے فرائڈ نے کہا ہے کہ فن کار مصوری، شاعری، موسیقی وغیرہ کی صورت میں اپنی جنسی محرومیوں کی تلافی کرتے ہیں یعنی جو خواہشیں روزمرہ کی زندگی میں ناآسودہ رہتی ہیں اُن کی تلخی سے نجات پانے کے لئے فن ایک قسم کے نشے کا کام دیتا ہے لیکن یہ محلِ نظر ہے۔

فن کے شہ پاروں میں دوامی تاثیر کی توجیہہ محض حرماں نصیب افراد کے حوالے سے نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان دوستی کا نصب العین کسی فن پارے کو بقائے دوام عطا کرتا ہے اور ظاہر ہے یہ نصب العین اپنی ترجمانی کے لئے انفرادی محرومیوں اور شخصی حدود کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ کوئی فنکار جتنا اپنی ذات کی قیود سے بلند تر ہوگا اُتنا ہی وہ عظمت کی بلندیوں کو چھو سکے گا۔

ترِسُل

تین شاخوں کا عصا جو سادھو اپنے پاس رکھتے ہیں۔ یہ مردانہ اعضائے تناسلیہ کی علامت ہے جسے برکت کے لئے رکھا جاتا ہے۔

ترقی پسندی

ترقی پسندی وہ ادبی تحریک ہے جو روس کے اشتراکی انقلاب کے ساتھ اُبھری تھی اور جس کا عظیم ترجمان قصّہ نویس اور تمثیل نگار گورکی تھا۔ اِس تحریک کا مقصد عوام کے سیاسی شعور کی تربیت کرنا اور انقلابی قدروں کی آبیاری کرنا ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے فرانسیسی جمال پسندوں نے فن برائے فن کا نعرہ لگایا جس سے فن کو روزمرّہ کی زندگی سے منقطع کرنا مقصود تھا۔ بیلنسکی اور لیو ٹالسٹائے نے اِس نعرے پر گرفت کی اور کہا کہ ادب و فن کو چند گنے چنے بلند ابرو جمال پسندوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ عوام بھی اِس کے برکات سے فیضان پانے کے حق دار ہیں۔ ترقی پسندوں نے اسی اصول کی ترجمانی کی ہے۔ اُن کا اِدّعا یہ ہے کہ کوئی سچّا فنکار یا ادیب اُس انقلابی تحریک سے بے تعلق نہیں رہ سکتا جو فی زمانہ معاشی انصاف کے حصول کے لئے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں برپا ہے اور جس کا مقصد عوام کو مغربی سامراج کے چنگل اور ساہوکاروں اور صنعت کاروں کے استحصال سے نجات دلانا ہے۔ ترقی پسندی کی ادبی و فنی تحریک اسی ہمہ گیر اشتراکی تحریک سے عضویاتی طور پر وابستہ ہے۔ جب ایک باشعور فن کار دیکھتا ہے کہ اُس کے مُلک کے عوام استحصال کی چکّی کے بے رحم پاٹوں میں پس رہے ہیں تو وہ قدرتاً اِس ظُلم سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ عوام کی محبت اور استحصال کرنے والوں سے نفرت اُس کے مزاجِ عقلی میں اِس طرح رچ بس جاتی ہے کہ وہ اپنے شعر و ادب میں

اس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عوامی آرزوؤں، اُمنگوں اور وَلولوں کے ساتھ اُس کی ذہنی و ذوقی وابستگی اُس کے شعر و ادب کو توانائی اور بالیدگی عطا کرتی ہے۔ ترقی پسندی کے معترضین کہتے ہیں کہ یہ تحریک مقصدی ہے اس لئے فن کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہے گویا بالواسطہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی مقصد و غائیت سے عاری ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ترقی پسندی کی مخالفت کی تہ میں بھی ایک مقصد کار فرما ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام کی انقلابی تحریکوں کے سامنے بند باندھ دیا جائے۔ ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں میں فرق محض اس بات کا ہے کہ ترقی پسند دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لے کر ادب و فن میں مقصدیت کا اعتراف کرتے ہیں جب کہ رجعت پسند اپنے عزائم اور مقاصد کو 'خالص ادب'، 'فن برائے فن' اور 'ازلی و ابدی جمالیاتی قدروں' کے لبادوں میں چھپاتے ہیں اور خارجی احوال سے بے تعلق ہو کر اپنے ہی من میں غواصی کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اسی موضوعیت اور داخلیت نے مغرب کے ادب و شعر کو تنزل پذیری کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

تصوّف

تصوّف کا لغوی معنیٰ ہے اُس نے صُوف کا لباس پہنا۔ صُوف اُونی کھادی کو کہتے تھے جس کا کھُردرا لباس عیسائیوں کے راہب پہنا کرتے تھے۔ اُن کی تقلید میں مسلمان زُہّاد بھی اسی کھادی کا خرقہ پہننے لگے۔ سب سے پہلے ابو ہاشم کوفی کو صُوفی کہہ کر پکارا گیا (۷۶۰ء)۔ تصوّف کی نشو و نما خراسان میں ہوئی تھی جو بدھ مت کا بڑا مرکز رہا تھا چنانچہ خراسان کے صوفیہ زاویہ نشینی اور ترکِ دُنیا پر زور دیتے تھے۔ ان میں ابراہیم بن ادہم، شقیق بلخی، عبداللہ بن مبارک، احمد بن فزرویہ، ابوعلی صادق بلخی اور ابوالحسن نوری خراسانی نے شہرت پائی۔ یحییٰ بن معاذ بلخی کے یہاں حسنِ ازل اور عشقِ حقیقی کا تصوّر ملتا ہے۔ ابوالحسن نوری نے کہا کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کشف و اشراق ضروری ہے۔ ابوبکر شبلی خراسانی کا قول ہے کہ حبسِ دم سے دل پاک ہو جاتا ہے۔ ابوسلیمان الدارانی کہتے تھے کہ اللہ کا وصل صرف مستی اور وجد و حال ہی سے میسّر آ سکتا ہے۔

معروف کرخی رہبانیت میں غلو کرتے تھے۔ انہیں مخمورِ الوہیت کہا جاتا تھا۔ خراسان سے عراق اور مصر میں تصوّف کی اشاعت ہوئی۔ اکثر صوفیہ عجمی تھے۔ حارث بن اسد المحاسبی کے شاگرد جنید بغدادی نے کہا کہ از خود رفتگی الہامی ہوتی ہے جس میں محبوبِ ازلی سے بلا واسطہ ربط ضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ ذوالنون مصری کہا کرتے تھے کہ اللہ کا وصال صرف وارفتگی کے عالم میں ارزانی ہوتا ہے۔ رابعہ بصری نے محبوبِ حقیقی کے عشق میں پُرجوش اشعار لکھے۔ بایزید بسطامی صاحبِ حال تھے۔ اُن کا قول ہے "خدا مَیں ہوں، میرا جلال کیسا عظیم ہے"۔ انہوں نے تصوّف میں فنا کا تصوّر داخل کیا جو صریحاً بودھوں کے نروان ہی کی صورت ہے۔ الحاکم ترمذی نے کہا کہ اولیاء کے پاس بھی ایسی ہی مُہرِ (خاتم) ہوتی ہے جیسی کہ انبیاء کی۔ یہ خیال شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے انہی سے اخذ کیا تھا اور اپنے آپ کو خاتم الاولیاء کہا تھا۔ عجمی صوفیوں میں حبیب عجمی اور منصور حلاج نے شہرت پائی۔ حلاج نے حلول، تناسخ ارواح اور اوتار کے تصوّرات تصوّف میں داخل کئے اور کہا کہ ہُوَ ہُوَ (یونانیوں کا لوگس) خلقِ آدم سے پہلے موجود تھا اور یہی کائنات کی تکوین کا اصول اوّل ہے۔ ابن عربی نے حلاج کے ہُوَ ہُوَ کو انسانِ کامل اور حقیقتِ محمدیہ کے نام دیئے۔ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کے اساسی افکار یہ ہیں: وجود بالذّات حق تعالیٰ ہے، ماسوا اللہ کا وجود بالعرض ہے۔ وجود عین ذاتِ حق ہے، اعیانِ ثابتہ وہ معلومات ہیں جو حق تعالیٰ کے ذہن میں ہیں اور جو مادی اشیاء کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، کوئی شے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی، انسان مجبورِ محض ہے۔ ابن عربی کے افکار کو صدر الدین قونوی، عبد الکریم الجیلی، عراقی، ابن الفارض اور مولوی رومی نے جوش و خروش سے پھیلایا۔ مرورِ زمانہ سے تصوّف جو اصلاحِ اخلاق کی ایک تحریک تھی فلسفے کی شکل اختیار کر گئی اور اِس میں اشراق، حلول، سریان، تجلّی اور فصل و جذب کے نو فلاطونی افکار نفوذ کر گئے۔

بارھویں صدی عیسوی میں صوفیہ کے فرقے نمودار ہوئے۔ ان میں قادریہ، سہروردیہ، چشتیہ، شاذلیہ، مولویہ، شطاریہ اور نقشبندیہ مشہور ہوئے۔ صوفیہ نے دُنیائے اسلام میں ہر کہیں اپنی خانقاہیں اور زاویے قائم کئے اور پیری مُریدی کا سلسلہ مُحکم کیا۔ ایک مدت سے تصوّف کی یہ تحریک زوال پذیر ہو چکی ہے۔

صوفیہ کے ابتدائی حالات، ابو نصر سراج کی کتاب اللمع اور ابو طالب مکی کی قوت القلوب وغیرہ میں ملتے ہیں۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی نے طبقات الصوفیہ لکھی جسے سامنے رکھ کر عبداللہ انصاری نے فارسی میں صوفیہ کے سوانح لکھے۔ جامی نے نفحات الانس میں عبداللہ انصاری سے استفادہ کیا ہے۔ اصفہانی کی حلیۃ الاولیاء، ابوالقاسم القشیری اور علی ہجویری کی کشف المحجوب سے بھی خاص معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

تقدیر

تقدیر کا معنی ہے اندازہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے جو کچھ اس دنیا میں کرنا ہے اُس کا پہلے ہی سے تعین کر دیا گیا ہے۔ یونانی اسے موئرا، عیسائی ازلی گناہ، مجوسی زروان، ہندو کرم اور مسلمان قسمت کہتے ہیں۔ یہ سراسر جبریت کا تصور ہے۔ اس کی رو سے انسان بے بس اور مجبور محض ہے۔ وہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے اپنی قسمت کو بدل نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قسمت اور کرم کے نام پر انسان اپنے جرائم اور بداعمالیوں کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ وہ بڑے سے بڑا جرم کرنے کے بعد بھی اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ میری تقدیر میں یہی لکھا تھا میں کیا کر سکتا تھا۔ جبر کے اس تصور نے سادہ لوح محنت کش عوام کو بھی اپنے حقوق کی طلب سے باز رکھا ہے۔ انہیں یہ بات ذہن نشین کرا دی گئی ہے کہ غربت اور احتیاج اُن کے نوشتۂ تقدیر میں ہے اس لئے اس پر قناعت کرنا ہی قرینِ مصلحت ہوگا۔ جدید سائنس کے فروغ اور اُس کی درخشاں کامیابیوں نے انسان کو اس سلبی تصور سے نجات دلائی ہے اور وہ فطرت کی تسخیر کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرتی اور اقتصادی ماحول کو بدلنے پر بھی کمربستہ ہو گیا ہے۔

تشکک

فلسفے کا ایک مکتب جس کا اصل اصول یہ ہے کہ ہم کسی مسئلے کے بارے میں کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے نہ کوئی قطعی رائے قائم کر سکتے ہیں کیوں کہ تمام دلائل ایک دوسرے کی نفی کر دیتے ہیں۔ اس کا مشہور شارح پرہو تھا۔ جب وہ مر گیا تو اُس کے شاگرد میت کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ کسی نے پوچھا تم لوگ اپنے اُستاد کی تدفین کا سامان کیوں نہیں کرتے۔ وہ بولے "ہمیں اس بات کا یقین نہیں

ہے کہ وہ مر گیا ہے۔"

تکوین

کائنات کی تکوین کے بارے میں مختلف دیو مالائی روایات ہیں۔

— سُمیریا : خُدا نے ایک کلمہ کہا اور کائنات معرضِ وجود میں آ گئی۔

— مِصر : خُدا نے کائنات کو چرخے پر سُوت کی طرح کاتا۔ ایک اور روایت کے مطابق خُدا نے کائنات کو یوں بنایا جیسے ایک کُمہار چاک پر برتن بناتا ہے۔

— بابل : بعل مردوک نے مادہ اژدھا تیامت کو قتل کر کے اُس کے دو ٹکڑے کیے، ایک سے آسمان اور دوسرے سے زمین بنائی۔

— یُونان : پہلے پہل اتھاہ تاریکی تھی۔ اِس سے عشق پیدا ہوا جس کے ساتھ کائنات وجود میں آئی۔ پہلی مخلوق آسمانی باپ (یورے نس) اور دھرتی ماتا جیا کے بچے تھے۔

— ہند : شیو کی سرشت کے نسوانی پہلو سے شکتی پیدا ہوئی جو اُس کی زوجہ بن گئی۔ بعد میں یہی شکتی ازلی اصولِ تخلیق قرار پائی جو پُرش سے واصل ہوئی اور یہ کائنات بنی۔ ایک اور روایت کے مطابق پرکرتی (مادہ) اور پُرش کے اختلاط سے کائنات بنی تھی۔

— پولی نیشیا : کائنات ایک انڈے سے نمودار ہوئی تھی۔

تعلیم

بچوں کی تعلیم کو کوئی عمل کہا گیا ہے جس میں بچہ، نصاب اور اُستاد شامل ہیں۔ پہلے پہل فیثا غورس، افلاطون اور ارسطو نے تعلیم کے اصول مُرتب کیے تھے جن پر فروبل، پستالاتسی، مونٹے سوری اور ایڈلر نے قابلِ قدر اضافہ کیا۔ افلاطون نے کہا کہ تعلیم کا مقصد بچے کی جسمانی، ذہنی اور ذوقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا ہے تاکہ بالغ ہو کر وہ اپنے مُلک کا اچھا شہری بن سکے۔ اِس مقصد کے لئے اُس نے جمناسٹک، موسیقی اور ریاضی کی تعلیم پر زور دیا۔ وہ بچوں کو عشقیہ نظمیں پڑھانے کے حق میں نہیں تھا اور کہتا تھا کہ اِن سے جذباتی ہیجان پیدا ہوتا ہے جو اُن کی فکری نشوونما میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ نصاب مُرتّب کرتے

وقت اِس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے پیشِ نظر مقصد کیا ہے۔ سپارٹا والے اپنے بچوں کو جنگ جُو بنانا چاہتے تھے اِس لیے اُن کے نصابِ تعلیم میں جسمانی ورزش اور جفاکشی پر زور دیا گیا تھا۔ وہ لڑکوں کو اپنے ماں باپ سے الگ تھلگ بارکوں میں رکھتے تھے اور اُن میں شجاعت اور ثابت قدمی کے اوصاف پیدا کرتے تھے۔ افلاطون بھی اُن کے نصابِ تعلیم سے مُتاثّر ہوا تھا۔ جدید دَور میں سائنس اور خاص طور سے نفسیات کے انکشافات کی روشنی میں نصاب مُرتّب کرنے پر زور دیا گیا۔ فروبل، پستالالسی اور مونٹے سوری نے بچوں کو پھُولوں سے تشبیہہ دی ہے اور کہا ہے کہ پیار محبت ہی سے اُن کی صحیح نشوونما ہو سکتی ہے چنانچہ اب مدرسوں کو کنڈر گارٹن (بچوں کے باغ) کہا جاتا ہے اور ننھے بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اُستادوں کی تربیت میں اُنھیں فلسفۂ تعلیم کے ساتھ ساتھ نفسیاتِ تعلیم بھی پڑھائی جاتی ہے جس سے وہ بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات سے باخبر ہو جاتے ہیں، مناسب طریقے سے اُن کی شخصیّت اور کردار کی تشکیل کرتے ہیں اور اُن کی ذہنی و جذباتی مشکلات کو دُور کرتے ہیں۔ آج کل نصاب کو مُرتّب کرتے وقت سائنس کی تدریس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ بچوں میں تحقیقِ علمی کا شوق پیدا ہو اور وہ اُن توہّمات سے محفوظ رہ سکیں جنھوں نے صدیوں سے ذہنِ انسانی کو پراگندہ کر رکھا ہے۔ نظری و تجرباتی سائنس کی تدریس کے بغیر صنعتی معاشرے کے سیاسی، مُعاشی اور عمرانی تقاضوں کو پُورا کرنا ممکن نہیں ہے۔

تلسی

نازبُو کا پودا جو ہندوؤں کے ہاں مُقدّس ہے۔ یہ پودا قدامت پسند ہندوؤں کے گھروں میں اُگایا جاتا ہے اور اِسے دیوی سمجھ کر اِس کی پُوجا کی جاتی ہے۔ رات کو اِس کے آگے چراغ روشن کر کے اِس کا پرکما کرتے ہیں۔ مرتے وقت اِس کا پتہ مُنہ میں رکھتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق تُلسی ایک خوبصورت دوشیزہ تھی جس پر کرشن جی عاشق ہو گئے، اِسے پودے میں بدل دیا اور اِس کی پُوجا کا حکم دیا۔ تُلسی کو سِیتا کا اوتار بھی کہا جاتا ہے۔ لوگ آفات سے بچنے کے لئے اُس کے منکوں کی مالا پہنتے ہیں۔

تمباکو

۱۵۵۸ء میں تمباکو پہلی بار امریکہ سے ہسپانیہ لایا گیا۔ پرتگال میں فرانس کا سفیر نکوٹ تھا جس نے تمباکو کے کچھ بیج سوغات کے طور پر ملکۂ فرانس کیتھرین دمیچی کو بھیجے۔ نکوٹ کے نام پر تمباکو کے پودوں کو نکوٹین کہا جانے لگا۔ تمباکو کے پودوں میں زہریلے مادے کو اُسی کے نام پر نکوٹین کہا گیا۔ کلیسیائے یونان میں تمباکو کو منشیات میں شمار کیا گیا ہے اور اس میں تمباکو نوشی ممنوع ہے۔

تمغہ

(۱) تمغہ ترکی زبان میں شاہی مہر کو کہتے ہیں (۲) ایک محصول جو منگول تجارت پر لگاتے تھے۔

تنترمت

تنتر کا لغوی معنیٰ ہے وسیلہ۔ یہ رسالے شیو اور اُس کی زوجہ شکتی کے مکالمات پر مشتمل ہیں جن میں شیو اُس کے سوالات کے جواب دیتا ہے۔ تنتروں میں شکتی پوجا کے رسوم و آداب کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ تنترمت والے شکتی کی پوجا کے دوران میں جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کرتے ہیں۔

توہمات

توہم اُس عقیدے یا عمل کو کہتے ہیں جو نامعلوم اور پُراسرار کے خوف پر مبنی ہو اور جس کی کوئی علمی توجیہہ نہ کی جا سکے۔ توہمات اکثر و بیشتر جادو، نظرِ بد، غیب بینی اور سعد و نحس سے وابستہ رہے ہیں اور قدیم انسان کی اُن ذہنی کاوشوں سے یادگار ہیں جب وہ سبب و مسبّب کے قانون ـــــ ہر مسبّب کا لازماً ایک سبب ہوتا ہے ـــــ سے بے خبر تھا اور قدرتی مظاہر اور غیر معمولی واقعات کی توجیہہ طفلانہ قیاس آرائیوں سے کیا کرتا تھا۔ اُسے اپنے چاروں طرف ہر شئے پُراسرار دکھائی دیتی تھی۔ وہ سورج اور چاند کے طلوع و غروب، تاروں کی ٹمٹماہٹ، بادلوں کی گرج چمک، دریاؤں اور سمندروں کی موجزنی، پہاڑوں کی سربلندی، پیڑوں کے جھومنے اور پھولوں کے لہلہانے اور ان جیسے دوسرے فطرتی مناظر کو سمجھنے سے قاصر تھا اور ان کے بارے میں قیاس آرائیوں سے کام لیتا تھا۔ انہی قیاس آرائیوں سے قدیم مذہب اور جادو کا آغاز ہوا۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ انسان کا خوف حیرت اور

بجنسہ یہی بدل گیا تو سائنس کی بنیاد پڑی، علمی تحقیق سے اسرار کے پردے اٹھنے لگے اور انسان نے فطرت سے خوفزدہ ہونے کے بجائے اُس کی تسخیر پر کمر ہمت باندھی. سائنس کے فروغ کے ساتھ ساتھ توہمات کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں لیکن سائنس کی ترقی کے باوصف آج بھی ایک حد تک انسانی ذہن و قلب پر توہمات کا تصرف باقی ہے اور جہلاء سے قطع نظر بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی بھی اِن کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فال گیروں، نجومیوں، عاملوں، پیروں، یوگیوں، رشیوں اور دست شناسوں وغیرہ کا کاروبار زوروں پر ہے۔ آج بھی لوگ ۱۳ کے ہندسے، آئینہ ٹوٹ جانے، کالی بلی کے رستہ کاٹنے، نمک کے گر جانے، آنکھ پھڑکنے اور اُلّو کے بولنے سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں؛ ۳، ۵، ۷ اور ۱۲ کے اعداد کو سعد مانتے ہیں، مریخ، چاند اور زحل کو نحس اور شمس اور زہرہ کو سعد کہا جاتا ہے، سُرخ اور زرد رنگ کو مبارک اور نیلے اور سیاہ رنگوں کو منحوس سمجھتے ہیں، بھوتوں پریتوں، چڑیلوں، عفریتوں پر عقیدہ رکھتے ہیں، قبروں پر اُگے ہوئے درختوں کی ٹہنیوں سے سُرخ رنگ کے دھاگے باندھ کر مُرادیں مانگتے ہیں۔ مغرب میں حاضرات ارواح کا چکر "رُوحانیت" کے نام پر چلایا جا رہا ہے اور اِسے سائنٹفک ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رُوحانی نشست یا بیٹھک میں واسطہ بننے والی عورت وجد و حال کے عالم میں ناظرین کو مُردہ عزیزوں کی شکلیں دکھاتی ہے یا آواز سُنواتی ہے اور سادہ لوح لوگ اِن سمعی و بصری واہموں کو حقیقت مان لیتے ہیں، بلور میں گھور کر پیش گوئیاں کی جاتی ہیں اور دعوی کیا جاتا ہے کہ بلور میں ماضی کے سارے واقعات دیکھے جا سکتے ہیں۔ "رُوحانیت" کے نام پر اِس عقیدے کا پرچار کیا جا رہا ہے کہ کچھ لوگوں کے قبضے میں ایسی خفیہ اور غیر مرئی قوتیں بھی ہیں جو سائنس کے احاطۂ تحقیق سے آزاد ہیں بالاتر ہیں۔ بعض مکار طالع آزما جو نفسیات کے مبادیات سے بھی بے بہرہ ہیں ماوراء النفسیات اور کشف و اشراق کے نام پر اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے یوگی اور مہارشی "سائنٹفک یوگا" کا چکر چلا کر لاکھوں کما رہے ہیں۔ اِن لوگوں نے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں گیان دھیان کے مرکز قائم کر رکھے ہیں۔ مہیش یوگی اور گورو مہاراج جیسے متفنی یوگا

اور ریدانت سے "رُوحانی امراض" کا علاج کر رہے ہیں اور لاکھوں میں نوٹ رہے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اہلِ مغرب کے مزاجِ عقلی میں نفوذ نہیں کر سکی۔ اُنہوں نے سائنس کو اپنے معاشی مفادات کی پرورش کا محض ایک وسیلہ بنا رکھا ہے۔ اِس کے برعکس اِشتراکی معاشرے میں سائنس ایجاد و انکشاف تک محدود نہیں رہی بلکہ عوام کی سوچ اور احساس میں نفوذ کر چکی ہے، اُن کا طرزِ فکر بن چکی ہے یہی وجہ ہے کہ مہارشی، یوگی، فال گیر اور رُوحانیت کا پرچار کرنے والے اِشتراکی ممالک کا رُخ نہیں کرتے اور سیدھے امریکہ اور یورپ میں جا کر اپنا جال پھیلاتے ہیں۔

تھال

پنجابی دیہات میں لڑکیوں کا کھیل ہے جس میں وہ گیت گا کر گیند کھیلتی ہیں۔

تہذیب و تمدّن

تہذیب کا معنیٰ ہے 'سنوارنا' اور تمدّن کا مطلب ہے شہری زندگی گذارنا۔ تہذیب کے لئے انگریزی کا لفظ کلچر اور جرمن کا لفظ کلٹر ہے دونوں کا معنیٰ ہے کھودنا، پیدا کرنا، اُگانا۔ لفظ تہذیب کئی معنوں میں مستعمل ہے (۱)۔ علم الانسان اصطلاح میں جو کام بھی اِنسان نے بہ حیثیت انسان کے کیا ہے وہ تہذیب یا کلچر کے ضمن میں آئے گا (۲)۔ کسی خاص قوم کی ذہنی اور ذوقی ترقی اُس مُلک کی تہذیب کی نشان دہی کرتی ہے (۳)۔ فرد کی نسبت سے تہذیبِ نفس کا مطلب ہو گا شائستگی، ادبی و علمی ذوق، انسانی ہمدردی اور مُروّت، کسی اعلیٰ نصب العین پر عقیدہ رکھنا اور اُس کی مُتعلقہ قدروں کی آبیاری کرنا۔ بعض عُلماء کے خیال میں تمدّن تہذیب ہی میں مشمول ہے اُس سے الگ نہیں ہے۔ عام طور سے کسی قوم کے علمی، فنّی اور فکری کارناموں کو اُس کی تہذیب اور مادی ترقّی کو اُس کے تمدّن سے منسوب کیا جاتا ہے۔

تھگڑ پیر

کسی ولی کے مزار کے درخت کو تھگڑ پیر کہتے ہیں۔ اِس پر عورتیں منت کی دھجیاں لٹکاتی ہیں۔ تھگڑ کپڑے کو کہتے ہیں۔

تیرتھ

تیرتھ اصل میں کسی جھیل یا دریا کے کنارے کی نہانے کی جگہ کو کہتے تھے بعد میں زیارت گاہ کے معنوں میں آیا۔ بنارس، الہ آباد، کوروکھشیتر، پشکر، کناس، گیا ہندوؤں کے مشہور تیرتھ ہیں۔ ہر سال سیکڑوں امیر کبیر ہندو مرنے کے لئے بنارس آتے ہیں اور برہمنوں کو لاکھوں روپے دان کرتے ہیں۔ گیا میں عورتیں سر کے بال مونڈ کر بھینٹ کرتی ہیں گویا وہ اپنے سر کی قربانی دے رہی ہیں۔ یہ مقامات لاکھوں طفیل خوار برہمنوں کی عیاشی کے اڈے بن گئے ہیں۔

تیرہ تالن

گانے اور ناچنے والیوں کا طائفہ جنہیں ابوالفضل نے آئین اکبری میں سیزدہ تالی (تیرہ تالن) کہا ہے۔ یہ عورتیں گاتے اور ناچتے وقت تیرہ تالوں سے کام لیتی تھیں جو اُن کے زیورات میں لگے ہوئے گھنگروؤں سے بجتی تھیں جو دو کلائیوں پر، دو دو کہنیوں پر، دو دو کندھوں پر، ایک چھاتی پر اور دو ہاتھوں کی انگلیوں میں پہنے جاتے تھے۔ ان کا تعلق عام طور سے گجرات کاٹھیاواڑ اور مالوہ سے ہوتا تھا۔ پنجابی میں چالاک اور عیار عورت کو تیرہ تالن کہتے ہیں۔

تین گُن

ہندومت کی رُو سے تین گُن (اوصاف) کائنات کی ہر شے میں سرایت کئے ہوئے ہیں، ستوگن (صداقت) وشنو سے تموگن (جوشِ غضب) شیو سے اور رجوگن (خواہش جس نے کائنات کو پیدا کیا) برہما سے متعلق ہے۔ انہیں ست، تم اور رَج بھی کہا جاتا ہے۔

تورۂ چنگیزی

مغلوں کے اس قانون کی رُو سے وہ عورت جس پر بادشاہ خواہش کی نظر کرتا تھا اپنے شوہر پر حرام ہو جاتی تھی اور وہ اُسے آراستہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ شاہانِ بخارا اس قانون کے تحت رعایہ کی حسین و جمیل عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کر لیا کرتے تھے۔ رُوسیوں نے تُرکستان پر قبضہ کیا تو اس رسم کا انسداد کر دیا۔

ترسا

فارسی والے عیسائیوں کو ترسا کہتے تھے جس کا معنیٰ ہے (خدا سے) ڈرنے والا۔

تاجیک

تُرک ایرانیوں کو تاجیک کہتے تھے۔ ایرانی عربوں کو تازیک یا تازی کہنے لگے۔

تُرک

لفظ تُرک کا لغوی معنیٰ ہے "قوّت، توانائی، نمود"۔

تنگری

منگولوں کا خداوندِ آسمان جس سے وہ دشمن کے واسطے سے استمداد کرتے تھے۔

ٹ

ٹپّہ

پنجاب کی لوک شاعری میں ماہیے کا بول ٹپّہ کہلاتا ہے۔ موسیقی کی اصطلاح میں گیت جسے پنجاب کے ساربان گاتے ہیں جنہیں میاں شوری لکھنؤ لے گیا جہاں اِسے اُستادی موسیقی میں شامل کر لیا گیا۔ اِس میں گٹکری اور مرکی کا لطیف امتزاج ہوا ہے۔ فی زمانہ یہ صنف متروک ہو چکی ہے۔

ٹکسلا

راولپنڈی کے نواح میں ایک قدیم شہر تھا جس کا اصل نام ٹکشا شیلا تھا۔ اِسے ٹکا قبیلے نے بسایا تھا جس کا فرد راجہ پورس تھا۔ اب اِس کے کھنڈر دُور تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تین ملحقہ شہروں کے آثار دریافت کئے گئے ہیں۔ بھڑ، سرکپ اور سرسکھ۔ قیاس یہ ہے کہ بھڑ کا شہر ایران کے ہنخامنشی فاتحین نے آباد کیا تھا۔ صدیوں تک یہاں بودھوں کی درس گاہیں کھلی رہیں جہاں تعلیم پانے کیلئے دُور دراز کے ممالک سے طلبہ آتے تھے۔ اشوک کا مشہور ستوپا دھرم راجیکا یہیں تعمیر کیا گیا تھا۔ اِس شہر پر ایک صدی تک باختری یونانیوں نے حکومت کی پھر ساکا، پارتھیوں اور کشانوں نے یکے بعد دیگرے اِسے فتح کیا۔ باختری یونانیوں سے سرکپ کا شہر اور جنڈیال کا معبد یادگار ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں سفید ہنوں نے ٹکسلا کو فتح کر کے اِس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ٹوبھا

پنجابی دیہات کے غوطہ خور جو کنواں کھودنے کے بعد غوطے لگا کر پانی کی سوتیں درست کرتے ہیں۔

ٹھگی

۱۹ ویں صدی کے اوائل میں ٹھگ ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اِن میں ہندو

مسلمان بھی شامل تھے۔ یہ قاتلوں کی ایک خفیہ تنظیم تھی جس میں کالی دیوی کو سرپرست مانا جاتا تھا۔ کالی کے مت میں خون بہانا مباح ہے اس لئے یہ لوگ مسافروں کو لوٹنے سے پہلے انہیں دھوکا دے کر قتل کر دیتے تھے۔ ان کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ کسی کھاتے پیتے مسافر کی ہمراہی میں سفر کرتے تھے اور راستے میں اُس سے دوستی جتاتے تھے۔ موقع پر یہ مسافر کو کھانے میں کوئی نشہ آور دوا کھلا دیتے اور پھر اُس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتے تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنا رومال کام میں لاتے تھے۔ انگریز کمپنی نے ان کے انسداد کی مہم چلائی اور کرنل سلیمن نے ان کا استیصال کر کے مُلک کو اِس لعنت سے نجات دلائی۔ بنارسی ٹھگ خاص طور سے خطرناک لحد تک سمجھے جاتے تھے۔

ٹھُمری

ٹھُمری ہلکی پھلکی گائیکی کی ایک صورت ہے جو لکھنؤ اور بنارس میں پروان چڑھی۔ اس گائیکی کے تین اسالیب ہیں۔ لکھنوی، بنارسی اور پنجابی۔ لکھنوی اسلوب کا موجد صادق علی خاں تھا۔ اس میں لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ لکھنؤ کے قادر پیا نے متعدد ٹھُمریاں مرتب کیں۔ بنارس کی ٹھُمری پر چیت اور کجری جیسے لوک گیتوں کا اثر پڑا اور پنجابی ٹھُمری پہاڑی، ماھیا وغیرہ لوک گیتوں سے متاثر ہوئی۔ ٹھُمری آسان اور عام فہم راگنیوں میں گائی جاتی ہے جو لوک گیتوں کے قریب تر ہیں مثلاً دیس، کھماج، تلک کاموَد، بھیرویں، جھنجھوٹی، تلنگ، پیلو وغیرہ۔ اس کے اکثر بول ہندی میں باندھے گئے ہیں جن میں عورت اپنے بچھڑے ہوئے شوہر سے یا رادھا کرشن سے شوقِ ملاقات کا اظہار کرتی ہے یا اُس کی بیوفائی کی شکایت کرتی ہے۔

ٹھیپا

ہندوؤں کا ایک توہم ہے کہ جب کسی شخص کی زوجہ مرجاتی ہے اور وہ دوسرا بیاہ کر لیتا ہے تو پہلی زوجہ کا پریت دوسری عورت کو ستانے لگتا ہے اور اُس کے درپئے آزار رہتا ہے۔ اس کے آزار سے بچنے کے لئے دوسری عورت پہلی عورت کا چھوٹا سا چاندی کا ٹھیپا یا بُت بنوا کر اپنے گلے میں پہن لیتی ہے۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتی ہے تو پہلے اس ٹھیپے کو نوالے پیش کرتی ہے تاکہ وہ خوش ہو جائے۔ اس کے بعد خود کھاتی ہے۔ اُس کے خیال میں ایسا کرنے سے پہلی عورت کا پریت اُسے ستانا چھوڑ دیتا ہے۔

ٹھیرا : بودھوں کے عمر رسیدہ اُستاد کو ٹھیرا کہتے ہیں۔ اسی سے ہے ٹھیرا دادا یا بزرگل

کا علم و دانش۔ پنجابی کا بڈھا ٹھیرا۔

ٹیلی پیتھی

بغیر کسی واسطے کے دوسرے کے خیالات معلوم کر لینے یا اپنے خیالات اُس کے ذہن میں منتقل کرنے کو ٹیلی پیتھی کہتے ہیں۔ ٹیلی پیتھی والے کہتے ہیں کہ ایک ایسا عالم بھی ہے جو ہمارے ادراک سے ماوراء ہے اور اُس تک مروّجہ سائنس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ ٹیلی پیتھی کا تعلق اسی مافوق الطبع عالم سے ہے تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ وہی قیاس درست ہوتے ہیں جن میں قیاس آرائی کرنے والے کو اپنے ایجنٹ کے ساتھ قُرب، مکانی میسّر ہو اور اُس کے ساتھ سمعی و بصری رابطہ قائم ہو۔ جہاں دونوں میں دُوری واقع ہو گی وہاں ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ ناکام ہو جائے گا۔ امریکہ کے ایک ماہرِ نفسیات جاسٹرو اور روس کے ایک عالم ٹارچینوف نے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ واسطے سے دُوری کی صورت میں ٹیلی پیتھی کا تجربہ ناکام رہتا ہے کیونکہ حسّی اشارات دینے والے ایجنٹ کا رابطہ قیاس آرائی کرنے والے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ بہر صورت ٹیلی پیتھی کی صداقت کا اثبات کسی قسم کی مافوق الطبع قوتوں سے رجوع لانے سے نہیں بلکہ سائنسی تجربات ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔

ٹنکہ

چاندی کا سکّہ۔ منگولی زبان کا لفظ ہے۔ منگولوں کا سکّہ تھا جسے وہ ٹنگہ کہتے تھے۔

ٹلّہ جوگیاں

پنجاب کی لوک کہانیوں میں ٹلّہ جوگیاں اور گورکھ ناتھ کا بار بار ذکر آتا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے سال میں ایک مرتبہ یہاں ایک بڑا تہوار منایا جاتا تھا جس میں شرکت کے لئے ہندوستان بھر کے جوگی اکھٹے ہوتے تھے۔ بقول ابوالفضل ایک دفعہ جلال الدین اکبر بھی ٹلّہ آیا تھا اور جوگیوں سے باتیں کر کے متاثر ہوا تھا۔ پوُرن بھگت اور ہیر رانجھا کے لوک قصوں میں ٹلّہ جوگیاں کا ذکر بار بار آتا رہا ہے۔

جنرل کننگھم نے "ہندِ قدیم کا جغرافیہ" میں لکھا ہے کہ جس ٹلّہ جوگیاں (ضلع جہلم) کو گورو گورکھ ناتھ کا ٹلّہ کہتے ہیں اُس کا قدیم نام بالناتھ کا ٹلّہ تھا۔ ٹلّہ ناتھ جوگیوں کا تیرتھ تھا جہاں ایک روایت کے

مطابق رانجھے نے جوگ لیا تھا پہلے پہل یہاں سورج دیوتا کی پوجا بالناتھ کے نام سے شروع ہوئی تھی پھر مچھندر ناتھ کے چیلے گورکھ ناتھ نے شیو کی پوجا کو رواج دیا جو شیو مہادیو کا اوتار تھا اور ناتھ پنتھ قائم کیا۔

یہاں ہر سال شیوراتری کا تہوار منایا جاتا تھا کسی زمانے میں ٹلہ کن پاٹے جوگیوں کا گڑھ تھا۔ ناتھ جوگیوں کے دو فرقے تھے، اوگر اور کن پاٹے۔ کن پاٹے گورکھ ناتھ کو اپنا گرو مانتے تھے۔ وہ اپنے کان پھڑوا کر ان میں مُندرے ڈالتے تھے۔ گیروا لباس پہنتے تھے۔ بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ میں کھپری رکھتے تھے گلے میں سیلی پہنتے تھے اور سنکھ (ناد) پورتے تھے۔ ناتھ پنتھ نے پنجاب کی سرزمین سے جنم لیا لیکن اس کے اثرات بنگال اور دکن تک پھیل گئے۔ ناتھ جوگیوں نے ذات پات کی تفریق کو رد کر دیا اور انسانی مساوات کا درس دیا۔

ان میں سے اکثر جوگی عوام سے اُٹھے تھے۔ وہ جتی ستی رہتے تھے اور لوبھ (لالچ) موہ (دنیا کی کشش) کام (جنسی خواہش) کرودھ (غصہ) آہنکار (خودی) سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ سادہ بھاشا میں پنجابی شاعری کے سب سے پہلے نمونے ملتے ہیں۔ وہ ایک ترقی یافتہ زبان تھی۔ ایک بلند پایہ شاعر چرپٹ نے اپنے کلام میں برہمنوں کا تمسخر اُڑایا ہے اور سماج کی اپرادھی قدروں کو رد کیا ہے۔ جلندھری ناتھ اور چورنگی ناتھ نے عوام کے دلوں کو شعر کی زبان عطا کی۔ گورو گورکھ ناتھ کے بارہ چیلے تھے، سنت ناتھ، رام ناتھ، بیرنگ ناتھ، دھرم ناتھ، بیراگ ناتھ، دریا ناتھ، لیک ناتھ، گنگائی ناتھ، دھجا ناتھ، جلندھری ناتھ، نیم ناتھ اور ناگ ناتھ۔ ان سے بارہ پنتھ جوگیوں کے جاری ہوئے۔ تیرھواں پنتھ مست ناتھیہ شروع ہوا۔

مسلمانوں میں جوگیوں کا ایک پنتھ جعفریہ جوگیوں کا ہے جو جعفر پیر سے یادگار ہے۔ آج کل انہیں راول کہتے ہیں اور یہ دیہات میں آنکھوں کے آپریشن کرتے ہیں اور جن نکالتے ہیں۔ جوگی نعش کو دو زانو بٹھا کر دفن کرتے تھے یا پانی میں بہا دیتے تھے۔ پنجاب کی لوک کہانیوں میں لکھا پیر بھی گورو گورکھ ناتھ سے ارادت رکھتا تھا۔ ٹلہ جوگیاں آج کل ویران پڑا ہے۔

ثنویت

ثنویت یا دُوئی۔ مجوسیت کی رُو سے کائنات میں دو اُصول کار فرما ہیں: خیر، جس کا نمائندہ اہورا مزدا ہے اور شر جس کا نمائندہ اہرمن ہے۔ اِن دونوں میں ابتدائے آفرینش سے کشمکش ہو رہی ہے۔ آخری فتح خیر یا اہورا مزدا ہی کی ہو گی۔ اسرائیلی مذاہب میں خدا اور شیطان کی ثنویت مجوسیت کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ چین کے تاؤمت میں یہ دوئی یانگ اور ین کی صورت میں موجود تھی۔ یانگ فعال ہے مذکر ہے، روشنی، سچائی اور حرکت کا نمائندہ ہے۔ ین تانیث، انفعالیت، تاریکی، دروغ اور جمود کی نمائندگی کرتا ہے۔ یانگ اور ین دونوں کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوتے۔ ہندوؤں میں ایشور خدائے خیر ہے اور وشوا کرما اُس کا دشمن یا شیطان ہے۔ مصرِ قدیم میں اوزائرس اور سیت خیر اور شر کی علامتیں بن گئے تھے۔ اس آفاقی دُوئی کی جڑیں غاروں کے قدیم دَور تک جا پہنچتی ہیں جب انسان روشنی اور اُس کے مبدء سورج کو خیر اور تاریکی کو شر کی علامت مانتا تھا۔ بعد میں روشنی اور تاریکی کی یہ دُوئی جادو، دیومالا اور مذاہب میں ہر کہیں نفوذ کر گئی۔ آج کل جب کہ مذاہب اور اُس کے ساتھ الٰہیات پر سے اعتقاد اُٹھ گیا ہے ایک نئی دُوئی کا تصوّر اُبھر کر سامنے آیا ہے: حادثے اور موقعے کی دُوئی۔ موقع خیر، سچائی، تعمیر اور ترقّی کا نمائندہ اور حادثہ موت، تخریب اور شر کی علامت سمجھا جاتا ہے گویا موقع انسان کا خیر خواہ اور ہمدرد ہے اور حادثہ اُس کا دُشمن اور بدخواہ ہے

ج

جاتک کہانیاں

مہایان بدھ مت کی رُو سے گوتم بدھ اور بودھی ستوا انسان کی بہتری اور فلاح کے لئے بار بار جنم لیتے ہیں اور پرندوں، حیوانات وغیرہ کے قالب بھی اختیار کرتے ہیں۔ جاتک کہانیاں انہی جنموں اور تجربوں کے واردات پر مشتمل ہیں۔ ان میں پرندے اور حیوان بھی انسانوں کی طرح باتیں کرتے ہیں، انہی کی طرح سوچتے ہیں اور سیاسیات کی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ کلیلہ دمنہ، کتھا سرت ساگر، سنگھاسن بتیسی وغیرہ میں اس قسم کی کہانیوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ بودھوں کی جاتک کہانیاں دُنیا بھر کی ادبیات میں نفوذ کر گئیں۔ ایسپ کی کہانیوں، الف لیلہ اور ولاتی کے گیتوں میں ان کا کھوج ملتا ہے۔

جاٹ

لغات میں لفظ جاٹ کا معنیٰ ہے نسل، قبیلہ، طریقہ، قسم۔ بالوں کی لٹ اور پشم کو بھی جٹ یا جت کہتے ہیں۔ جٹادھاری میں بھی یہی مفہوم ہے۔ آج کل بالائی سندھ میں ساربان یا چرواہے کو جاٹ کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے جاٹ کا اشتقاق جُستھا سے کیا ہے جس کا معنیٰ ہے قدیم۔ جاٹوں کا شمار آدی واسیوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ اکثر مورخین کے خیال میں جاٹ وسط ایشیا کے ایک طاقتور قبیلے جٹائی کی اولاد ہیں جس نے تیمور لنگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ یہی جٹائی جنہیں چینی یو-چی لکھتے تھے نقل مکان کر کے پنجاب اور سندھ میں آ گئے۔ عرب حملہ آوروں کا سندھ میں جاٹوں سے مقابلہ ہوا تھا اور وہ انہیں زط کہتے تھے۔ پنجاب کے جاٹوں نے برہمنوں کی برتری کو کبھی تسلیم نہیں کیا نہ انہیں دیوتا سمجھا۔ یہ بھی جاٹوں کے غیر آریائی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ برہمن شروع سے جاٹوں سے نفرت کرتے رہے ہیں۔ آج کل کے جاٹوں اور راجپوتوں میں نسلی پہلو سے فرق کرنا مشکل ہے البتہ تارڑ، وڑائچ، چیمے، چٹھے اور ساہی اصلاً جاٹ ہیں۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تاریخ میں پہلی بار جاٹوں کو راجپوتوں

پر سیاسی برتری حاصل ہوئی تھی ۔

جادو

جادو دو قسم کا ہے سفید یا مثبت اور کالا یا منفی ۔ کالا جادو دشمنوں کو آزار پہنچانے کے لئے کیا جاتا ہے اور سفید جادو سے کالے جادو کے مُضر اثرات کا ازالہ مقصود ہوتا ہے ۔ جادو کی ایک معروف قسم جادو بالمثل ہے ۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص کو جان سے مارنا مقصود ہو تو اُس کا مٹی کا پُتلا بنا کر اور منتر پڑھ کر اُسے بہتے پانی میں رکھ دیتے ہیں ۔ پُتلے کے گھلنے کے ساتھ وہ شخص بیمار پڑ جاتا ہے اور بالآخر مر جاتا ہے ۔ بعض جادوگر دشمن کا کپڑے کا پُتلا بنا کر اُس میں منتر پڑھ کر سوئیاں چبھوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ مر جاتا ہے ۔ اکثر ممالک میں بارش برسانے کے لئے تپتی ہوئی زمین پہ پانی اُنڈیلا جاتا ہے اور توقّع کی جاتی ہے کہ اسی طرح مینہ برسے گا ۔

ٹونوں ٹوٹکوں اور تعویذوں سے نظرِ بد کا دفعیہ کیا جاتا ہے ۔ کسی لڑکی کا پیار جیتنے کے لئے اُسے پانی یا شربت میں حُب کے تعویذ گھول کر پلائے جاتے ہیں ۔ ہندی میں انہیں پریم گٹکے کہتے ہیں ۔ عورتیں اپنے شوہروں پر قابو پانے کے لئے اُن کے سونے کے کمرے کے کسی کونے کھدرے میں تعویذ دبا دیتی ہیں ۔ بانجھ عورت کسی ننھے لڑکے کو کانسی کی چھُری سے ذبح کر کے اُس کے خون میں نہاتی ہے ۔ خیال یہ ہے کہ اس بچّے کی رُوح سے وہ حاملہ ہو جائے گی ۔ جادو وحشی اور پسماندہ قبائل تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ نام نہاد مُہذّب و مُتمدّن ممالک میں بھی پایا جاتا ہے ۔ جادوگروں کا عقیدہ ہے کہ کسی شخص کے ناخن ، سر کے بال اور پاؤں تلے کی مٹی اُس سے الگ ہونے کے باوجود اُس کی ذات کا لازمی جُزو رہتی ہے چنانچہ جس شخص کو ایذا پہنچانا مقصود ہو اُس کے ناخنوں اور بالوں پر منتر پڑھتے ہیں ۔ اسی سبب قدامت پسند عورتیں اور مرد اپنے ناخنوں اور بالوں کو پھینکتے نہیں بلکہ محفوظ کر لیتے ہیں ۔ کالی بلّی کو قدیم زمانے سے جادوگرنی سمجھتے رہے ہیں ۔ یورپ میں جادوگرنیوں کی خُفیہ رسوم میں کالی بلّی کو ذبح کر کے اُس کا خون پیا جاتا ہے ۔ ہمارے ہاں کالے مُرغے کا خون پیتے ہیں ۔ جادوگرنیاں قبرستانوں میں مادرزاد برہنہ جاتی ہیں اور بچوں کی نعشیں نکال کر کھاتی ہیں یا کسی نعش پر بیٹھ کر

اپنی مالا جپتی ہیں جس کے منکے مُردوں کی ہڈیوں کے بنے ہوتے ہیں۔

جادو کے آغاز، اِس کے نفوذ اور ماہیئت کے بارے میں جارج فریزر، میلی نوسکی اور فرنزی نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اُن کی تحقیق کی رُو سے جادو کی تہ میں یہ عقیدہ کار فرما ہے کہ جادو کی رسوم سے ہم واقعات کے دھارے کو بدل سکتے ہیں یعنی ہماری خواہشات جادو کے ٹوٹکوں کے سبب گردوپیش پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ میلی نوسکی کے خیال میں جادو کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اُمید ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے اور خواہش سدا ثمر آور ہوتی ہے۔ فرنزی کے بقول جادو کا آغاز اس وقت ہوا جب اِنسان ذہنی و فکری لحاظ سے طِفلی کے دَور میں تھا۔ شیر خوار بچے کو خارجی عالم کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا اور وہ سمجھتا ہے کہ اُس کی خواہشات بھوک، پیاس وغیرہ خارجی عالم کو اُس کے حسبِ مرضی چلا رہی ہیں۔ اِسی طرح ماقبل تاریخ کا اِنسان جس کی فکری نشوونما شیر خوار بچے جیسی ہی تھی یہ خیال کرنے لگا کہ وہ اپنی خواہشات سے کارخانۂ قدرت کو حسبِ منشا چلا سکتا ہے۔ اِس مقصد کے لیے جو تجربات اُس نے کئے اُنہیں آج کل کی زبان میں ٹونے ٹوٹکے کہا جاتا ہے۔ انہی طِفلانہ تجربات نے بعد میں تجربی سائنس کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ جادو اور سائنس میں فرق اِسی بات کا ہے کہ جادو کے تجربات ناکام رہتے ہیں اور سائنس کے تجربات کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جارج فریزر کی تحقیق کے مطابق جادو کا آغاز مذہب اور سائنس سے پہلے ہوا تھا اور سائنس اور مذہب نے جادو ہی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ جب اِنسان کو سلسلۂ سبب و مسبّب کا علم ہوا تو اُس نے سائنس کے تجربے شروع کئے اور جب وہ ٹونوں ٹوٹکوں سے مظاہرِ قدرت سورج، چاند وغیرہ کو اپنے حسبِ مرضی چلانے میں ناکام رہا تو اُنہیں راضی رکھنے کے لئے اُن پر چیزیں بھینٹ کرنے لگا اور اُن کی پُوجا کرنے لگا جس سے قدیم مذہب صُورت پذیر ہوا تھا۔

جامِ جمشید

ایرانِ قدیم کے ایک افسانوی بادشاہ جمشید کا پیالہ تھا جسے بادشاہ کے سوا کوئی شخص لبالب بھرا ہوا پی نہیں سکتا تھا۔

جامِ کیخسرو: اِسے جامِ جہاں نما بھی کہتے ہیں۔ شاہِ ایران کیخسرو کا پیالہ جس میں روایت

کے مطابق وہ دُنیا بھر کے احوال دیکھ لیا کرتا تھا۔

جپسی

خانہ بدوش قبیلہ جس کے اصل وطن کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں جپسی کا لفظ اِجپٹ (مصر) کی بدلی ہوئی صورت ہے اور اِن کا اصل وطن مصر تھا۔ لیکن جدید تحقیق کی رُو سے جپسی شمال مغربی ہندوستان سے نکل کر دُنیا بھر کے ممالک میں پھیل گئے۔ کیوں کہ اِن کی زبان میں کئی الفاظ ایسے ہیں جو پنجابی میں بھی ملتے ہیں۔ اِن کی شادی بیاہ کی رسموں سے بھی اِس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے۔ اُن کا اصل نام روسینی یعنی 'آدمی' ہے اور اُن کی زبان رومنی ہے جو سندھی اور پنجابی سے ملتی جُلتی ہے۔ رومانیا میں آج بھی جپسیوں میں ذات پات کی تمیز موجود ہے۔ وہ سنساری مائی کو پوجتے ہیں جو چوروں اور اُٹھائی گیروں کی سرپرست دیوی ہے۔ فرانس میں اُنہیں بوہیمین کہتے ہیں کہ کیوں کہ وہ مُلک بوہیمیا سے پیرس کو آئے تھے۔ انگریزی میں غیر ذمّے دار لااُبالی شخص کو بوہیمین کہا جاتا ہے۔ جپسی گھوڑے، گدھے، بکریاں، کُتّے اور مُرغیاں پالتے ہیں اور اُٹھائی گیرے سمجھے جاتے ہیں۔ اِن کی عورتیں تاش کے پتوں سے غیب کا حال بتاتی ہیں۔ یہ لوگ مِرگی، مالیخولیا، ضعفِ باہ وغیرہ کے علاج کے لئے دوائیں دیتے ہیں، اِن کے نسخوں میں جانوروں کی ہڈیاں، کیڑے مکوڑے، ٹِڈے وغیرہ مِلائے جاتے ہیں۔ یہ آسیب اُتارنے کا دھندا بھی کرتے ہیں اور پیار محبت کے مشروب بھی بناتے ہیں اِس لئے نوجوان لڑکوں لڑکیوں میں بڑے مقبول ہیں۔ ان کا گانا اور ناچ نہایت دلکش ہوتا ہے اور دُھنیں ایسی جوشیلی کہ سننے والے بے اختیار تھرکنے لگتے ہیں۔ اِن کی عورتوں میں عجیب قسم کی ترغیب آور جنسی کشش ہوتی ہے اور وہ اپنے عشوہ و ادا سے نوجوانوں کے دل موہ لیتی ہیں۔ اِن کے ہاں ایک عجیب رسم یہ ہے کہ جب دو لڑکیاں ایک ہی نوجوان سے شادی کی خواہش کریں تو اُنہیں قبیلے والوں کے سامنے کُشتی لڑنا پڑتی ہے، جو غالب آجائے وہی دلہن بنتی ہے۔ جپسی زود اشتعال اور جذباتی ہوتے ہیں اور قاتلانہ حملہ کرنے میں بے باک سمجھے جاتے ہیں۔ مختلف حکومتوں نے اُنہیں بستیاں بسا کر رہنے کی ترغیب دی ہے لیکن یہ اپنے خیموں میں آزادانہ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آج کل ہسپانیہ میں اِن کی اکثریت دکھائی دیتی ہے۔

جبر و اختیار

فلسفے کا ایک نزاعی مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یا مختار ہے۔ ارسطو، نظامؔ، لائب نٹز اور برگساں انسان کو مختار مانتے ہیں اور ایپک ٹیٹس، شنکر اچاریہ، ابن عربی اور شوپنہار اُسے مجبور محض سمجھتے ہیں۔ جدید نفسیات میں فرائڈ جبرِ مطلق کا قائل ہے جب کہ ایڈلر قدر و اختیار کا حامی ہے۔ سائنس سلسلۂ سبب و مُسبّب کے اصول پر مبنی ہے یعنی اِس کی رُو سے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ کوئی مُسبّب بغیر سبب کے معرضِ وجود میں نہیں آسکتا۔ یہ صریحاً جبر ہے۔ مذہب میں کئی واقعات بغیر سبب کے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں جنہیں اِصطلاح میں معجزات کہا جاتا ہے۔ اِس سے سائنس کے سلسلۂ سبب و مُسبّب کا اِنکار لازم آتا ہے اور اُس کے جبر کی نفی ہوتی ہے۔ جو لوگ تحقیقِ علمی میں سبب و مُسبّب کے قانون کو مانتے ہیں وہ لازماً جبری ہوں گے لیکن اِس جبر میں ایک نوع کا اختیار بھی مخفی ہے۔ جب سائنس دان فطرت کے کسی قانون کو دریافت کر لیتے ہیں تو وہ نئی نئی ایجادات پر قادر ہو جاتے ہیں مثلاً جب اُنہوں نے بادلوں کی چمک کا راز پا لیا تو اُنہوں نے برقی قوّت پر قابو پا لیا۔ اِسی طرح جب اُن پر ایٹم کے تجزیے کا بھید کُھلا تو وہ جوہری توانائی سے مختلف کام لینے میں کامیاب ہو گئے گویا فطرت کے قوانین کی دریافت کے ساتھ جو سلسلۂ سبب و مُسبّب پر مبنی ہیں انسان علمی تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے کے قابل ہو گیا ہے۔ یہی حال معاشرۂ اِنسانی کا ہے جو ایک خاص طبیعی ماحول میں صورت پذیر ہوا ہے۔ اِنسان اِن طبیعی احوال میں زندگی گذارنے پر مجبور ہے لیکن جبر کے اِس دائرے میں رہ کر وہ معاشرۂ اِنسانی میں ایسی تبدیلیاں کرنے پر قُدرت رکھتا ہے جن سے معاشی و عمرانی عدل و انصاف کا قیام ممکن ہو سکے۔ دوسرے الفاظ میں جبر کے شعور ہی سے قدر و اختیار ارزانی ہوتا ہے۔

جبلّتیں

جبلّتیں وہ مُحرّکاتِ عمل ہیں جو انسانی سرشت میں پیدائشی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ہر جبلّت کے ساتھ ایک جذبہ بھی وابستہ ہوتا ہے مثلاً نفرت کی جبلّت کے ساتھ بیزاری کا جذبہ، جنسی جبلّت کے

ساتھ پیار کا جذبہ، کھانے کی جبلّت کے ساتھ اشتہا کا جذبہ، لڑنے کی جبلّت کے ساتھ غصّے کا جذبہ، پدری جبلّت کے ساتھ شفقت کا جذبہ، مادری جبلّت کے ساتھ مامتا کا جذبہ وغیرہ۔ جذبے کے علاوہ شعور اور عمل بھی جبلّت میں مشمول ہیں۔ اِس کی مثال یہ ہے کہ ایک نوجوان کو کسی لڑکی کی جنسی کشش کا شعور ہوتا ہے جو پیار کے جذبے کو اُبھارتا ہے اور وہ اُس لڑکی سے تمتّع کرنے کے لئے عملی اقدام بھی کرتا ہے۔ خوراک اور جنس کی جبلّتیں اِنسان کی سرشت میں بُنیادی حیثیّت رکھتی ہیں کہ اِن کی تشفی کے بغیر وہ اپنی جسمانی و ذہنی صحت کو بحال و برقرار نہیں رکھ سکتا۔ پدری اور مادری جبلّتیں انسانی ہمدردی، مروّت، ایثار، بے نفسی، خود فراموشی اور قربانی کے جذبات کو تقویّت دیتی ہیں لہٰذا سب سے اہم تعمیری اور مثبت جبلّتیں سمجھی جاتی ہیں۔

جدلیاتی مادیّت

کارل مارکس کا یہ فلسفہ مادیّت پسندی اور جدلیات کے اِمتزاج سے صُورت پذیر ہوا تھا۔ مادیّت پسندی کی رُو سے مادہ حقیقی ہے اور ذہن مادے کی پیداوار ہے۔ مادیّت پسندی کا آغاز طالیس یونانی سے ہوا تھا جس نے مظاہرِ کائنات کی علمی توجیہہ کرنے کی کوشش کی تھی اور دیو مالائی قصّے کہانیوں کو رَد کر دیا تھا۔ مادیّت پسند کہتے ہیں کہ انسان اِس لئے سوچتا ہے کہ وہ مغزِ سر رکھتا ہے۔ خیال مغزِ سر ہی کا فعل ہے اور مغزِ سر مادی ہے۔ جسم اور مغزِ سر کے بغیر کسی نوع کی سوچ بچار ممکن نہیں ہے لیکن مادے کو اپنے وجود کے لئے کسی ذہن کی ضرورت نہیں ہے؛ وہ معروضی صورت میں موجود ہے۔ خیالات و افکار اشیاء کو پیدا نہیں کرتے بلکہ اشیاء خیالات و افکار کی تشکیل کرتی ہیں۔ مادیّت پسندوں کے خیال میں کائنات کو کسی باشعُور ہستی نے پیدا نہیں کیا بلکہ خدا خود ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ اِس کے برعکس مثالیت پسند کہتے ہیں کہ ذہن مادے کا خالق ہے اور مادہ ذہن سے الگ اپنا کوئی وُجود نہیں رکھتا۔ مادیّت پسندی کی طرح جدلیات کی تدوین بھی فلاسفۂ یونان نے کی تھی۔ اِصطلاح میں اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے اضداد کا مجموعہ ہے یعنی ہر شے کے بُطون میں اُس کی ضِد موجود ہے اور اُس میں مثبت اور منفی کی آویزش جاری رہتی ہے۔ متضاد قوتوں کی اِسی آویزش سے عالم میں حرکت و تغیّر پیدا ہوتا ہے، گویا

تضاد ہی جدلیات کا بُنیادی قانون ہے۔ ہیرقلیتس یُونانی جدلیات کا مشہور شارح تھا۔ اُس کا قول ہے "کوئی شے ساکن نہیں ہے، ہر شے تغیّر پذیر ہے، کوئی شخص ایک ہی ندی میں دو بار غسل نہیں کرتا۔"

افلاطون کی مثالیت اس قدر مقبول ہوئی کہ جدلیات کو فروغ نہ ہو سکا۔ ۱۹ صدی میں ہیگل نے اس کا احیاء کیا اور کہا کہ کائنات میں ہر کہیں تغیّر و حرکت کی کار فرمائی ہے اور کوئی شے دوسری اشیاء سے علاحدہ اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی، سب اشیاء ایک دوسری سے مربوط ہیں لیکن ہیگل نے جدلیات کو مثالیت کے تابع کر دیا اور کہا کہ ذہن میں جو تغیرات واقع ہوتے ہیں وہی مادی عالم میں بھی رُونما ہوتے ہیں اس نے جدلیاتی عمل کے چند قوانین وضع کئے جو بعد میں کارل مارکس نے بھی اپنا لئے۔ اُس کی جدلیات کے تین پہلو ہیں (۱)۔۔۔ اثبات (۲)۔۔۔ نفی (۳)۔۔۔ نفی کی نفی یا اتحاد۔ وہ پھول کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ پھول میں نشوونما کی قوّت اثباتی ہے لیکن یہی نشوونما اُسے بیج میں بدل دیتی ہے جو پھول کی نفی کر دیتا ہے، پھر اس بیج سے اَکھوا پھوٹتا ہے جس سے نفی کی نفی ہو جاتی ہے البتہ اس اَکھوے میں پھول اور بیج دونوں کا جوہر محفوظ رہتا ہے۔ اس آخری عمل کو ہیگل نے "قدروں کا تحفّظ" کہا ہے کیوں کہ نفی کی نفی یا اتحاد کی صورت میں مثبت اور منفی دونوں صلاحیتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ کمیت کیفیت میں بدل جاتی ہے مثلاً جب پانی اپنی اصل صورت میں بہتا ہے یا مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے تو اس کی کمیت کی تبدیلی ہوگی لیکن وہ گیسوں میں بدل جائے گا تو یہ اُس کی کیفیت کی تبدیلی ہوگی۔ یہ عمل ساری کائنات میں اسی طرح جاری ہے۔

ہیگل کے فلسفے پر لڈوگ فوئر باخ نے جرح و تنقید کی، فرانسیسی قاموسیوں کی طرح الٰہیات اور مذہب کی تردید میں قلم اُٹھایا اور کامل مادیت کا دعویٰ کیا۔ کارل مارکس نے ہیگل کی مثالیت سے قطع نظر کر کے اُس کی جدلیات کو مادیت میں منتقل کر دیا اور اپنے فلسفے کو جدلیاتی مادیت پسندی کا نام دیا۔ اُس نے کلاسیکی مادیت کو میکانکی کہہ کر رد کر دیا اور کہا کہ جدید سائنس کی رُوح جدلیاتی ہے، اس لئے جدلیات ہی کی بُنیاد پر مادیت کو نئے سرے سے مرتّب کیا جا سکتا ہے۔

کارل مارکس نے کہا کہ جو قوانین عالمِ مادی میں کار فرما ہیں وہی انسانی معاشرے پر بھی اثرانداز

ہو رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اُس نے تاریخی مادیت کا نظریہ پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ جو تضادات مادی عالم کے ارتقاء کا باعث ہو رہے ہیں وہی معاشرۂ انسانی کے ارتقاء کا سبب بھی ہیں علاوہ ازیں مارکس نے ہیگل کی تصوراتی پیکار کو طبقاتِ معاشرہ کی کشمکش میں منتقل کر دیا۔ اُس نے کہا ہیگل کا یہ خیال درست ہے کہ کائنات اور فکرِ انسانی ہر لمحہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن اُس کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ذہن میں جو تغیرات ہوتے ہیں وہی عالم مادی میں بھی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ تصورات اشیاء کے عکس ہیں اور اشیاء کے تغیّر کے ساتھ ساتھ تصورات میں بھی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ اِس طرح "اُس نے ہیگل کی جدلیات کو جو سر کے بل کھڑی تھی دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔" مارکس نے کہا "جرمن فلسفہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے، ہمارا فلسفہ زمین سے آسمان کی طرف جاتا ہے۔"

جدلیاتی مادیّت پسندی کی رُو سے کائنات میں دو اشیاء ہیں (۱)۔ مادہ یا وجود (۲)۔ فکر۔ فکر وہ ہے جو ہم مادی اشیاء سے جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں، اخذ کرتے ہیں۔ وجود یا مادہ وہ ہے جس کا اِدراک ہم اپنی حسیات سے کرتے ہیں مثلاً کاغذ کو مادہ کہا جائے تو اُس کے سفید ہونے کا خیال اِدراک سے پیدا ہوگا۔ اِس طرح مادے کا وجود فکر و خیال پر مقدّم ہے۔ جدلیاتی مادیّت پسندی کے بُنیادی اصول درج ذیل ہیں۔

(۱) کوئی شے قطعی یا حکمی یا مُطلق نہیں ہے، سب اشیاء ہر وقت حرکت و تغیر میں ہیں۔

(۲) کائنات میں اشیاء ایک دوسری سے علاحدہ کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ ہر شے دوسری پر اثر انداز ہو کر اُس میں تغیر پیدا کر رہی ہے۔

(۳) ہر اِثبات میں نفی موجود ہوتی ہے اور ہر نفی کی نفی ہو جاتی ہے جس سے اِثبات کا عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ اِس عمل کی معاشرتی ترجمانی یوں ہوگی کہ زرعی انقلاب کے بعد جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ہوا جن سے محنت مشقت کا کام لینے لگے۔ وسائل پیداوار کی تبدیلی کے ساتھ جاگیرداری نظام صورت پذیر ہوا جس میں غلاموں کی جگہ مزارعوں نے لے لی۔ مرورِ زمانہ سے تاجروں نے بادشاہوں سے مِل کر جاگیرداروں کی طاقت کو کُچل دیا کیوں کہ توپوں اور گولہ بارود کی ایجادات کے باعث جاگیردار اپنے قلعوں میں غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ اَب طاقت تاجروں اور بورژوا کے ہاتھوں میں

آ گئی۔ صنعتی انقلاب کے بعد کارخانے کھل گئے جن میں محنت کشوں نے معمولی اُجرت پر کام کرنا شروع کیا۔ جاگیرداروں کی نفی بورژوا نے کی تھی بورژوا کی نفی مزدور کریں گے۔ اِس طرح نفی کی نفی ہو جائے گی اور معاشرۂ اِنسانی ترقّی کی راہ پر ایک قدم اور آگے بڑھ جائے گا۔

ہم نے دیکھا کہ جدلیاتی مادیت پسندی کی رُو سے کائنات مادّے سے وُجود اور فکر و خیال پر مُشتمل ہے۔ اِس نظریّے کا اِطلاق معاشرۂ اِنسانی پر کیا جائے تو معاشرے کے مادی یا معاشی احوال کو وجود سمجھا جائے گا اور سیاسیات، مذہب، اخلاق اور عُلوم و فنُون اِس کے فکری عکس ہوں گے جو قدرتاً اپنی اصل یا معاشی احوال سے وابستہ ہوں گے۔ جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی مثال ہمارے سامنے ہے اِس معاشرے میں پیداوار کے وسائل نے مختلف طبقات کے مابین علائقِ پیداوار خلق کئے ہیں جو شخصی املاک کے تصوّر اور اِستحصال پر مبنی ہیں چنانچہ اِس معاشرے کا سیاسی نظام انہی علائق سے صُورت پذیر ہوا ہے۔ بورژوا وسائلِ پیداوار کے مالک ہیں اِس لئے ریاست پر اُن کا قبضہ ہے جسے اُنہوں نے اپنے مفادات کے تحفّظ کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ سیاسیات کی طرح سرمایہ دارانہ معاشرے کے قانون، مذہب اور اخلاق، فلسفہ اور فن و ادب کی تشکیل اِس انداز میں ہوئی ہے کہ وہ بورژوا کے مفادات کی تقویت کے سامان بن گئے ہیں اور اُن کی مدد سے بورژوا محنت کشوں پر اپنا تصرّف و اِقتدار قائم رکھے ہوئے ہیں۔

اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" میں مارکس نے فاضل قدر کے قانون کی تشریح کی ہے جو اُس کی ایک عظیم دریافت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مزدور مقرّرہ اُجرت پر کام کرتا ہے۔ فرض کیجیے کہ یہ اُجرت دس روپے روزانہ ہے ایک دن میں جو کام وہ کرتا ہے وہ دس روپے سے کہیں زیادہ کا ہوتا ہے۔ اگر وہ پچاس روپے روزانہ کی محنت کرتا ہے تو اُس کی اُجرت کو منہا کر دینے سے وہ کارخانہ دار چالیس روپے روزانہ کا منافع دے گا۔ یہ فاضل قدر جمع ہو کر سرمایہ بن جاتی ہے اور سرمایہ دار کی تجوریاں بھر جاتی ہیں جب کہ مزدور ویسے کا ویسا کنگال رہتا ہے۔ یہ محنت کشوں کے اِستحصال کی بدترین صُورت ہے۔ مزدور اِسی جبر و اِستحصال سے نجات پانے کے لئے سرمایہ دارانہ ممالک میں کشمکش کر رہے ہیں۔ اِشتراکیت کا قانون ہے "جو کام کرے گا وہ کھائے گا"۔ ذاتی املاک اور اِستحصال کے خاتمے کے ساتھ

سرمایہ داروں کا طفیلی خوار طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور اشتراکی معاشرہ نمود پذیر ہوتا ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کی محنت کا استحصال نہیں کر سکتا اور ہر ایک کو یکساں ہر قسم کی آسائشیں میسّر آجاتی ہیں۔

جرائم

جرائم کے محرکات ہیں لالچ، حسد، انتقام، اُکتاہٹ، جذبۂ قومیت، بغیر محنت کے امیر بن جانے کی خواہش اور عاشقانہ رقابت۔ اِن میں جذبۂ قومیت کے تحت جو قتل یا اغوا جنگ کے دوران میں جاسوس کرتے رہتے ہیں اُنہیں اخلاق جرائم میں شمار نہیں کیا جاتا اور حُبّ الوطنی کے نام پر اُن کی معذرت خواہی کی جاتی ہے۔ جرائم اُس معاشرے میں پنپتے ہیں جس میں اِمارت اور اِفلاس کا تضاد نمایاں طور پر موجود ہو۔ اِس معاشرے میں دولت، عزّت اور وقار کا وسیلہ بن جاتی ہے اِس لئے ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد بڑے سے بڑا امیر بن جائے۔ انتقام بھی جرائم کا اہم محرک ہے۔ کوہستانیوں اور صحرائیوں میں انتقام لینے کو اپنا حق سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں سے معاشقے کرنے والے بھی رقابت کے جوش میں اپنے حریفوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ کئی امیر آدمی اور خاص طور سے امیر عورتیں دکانوں سے معمولی چیزیں چوری کرتی ہوئی پکڑی جاتی ہیں۔ اِس کا سبب اُکتاہٹ ہے۔ وہ لالچ کے لئے نہیں جنسی سنسنی کی خاطر چوری کرتی ہیں۔ کئی لوگ طبعاً محنت سے جی چُراتے ہیں اور جم کر کوئی کام نہیں کر سکتے اِس لئے وہ ڈاکے اور چوری کی چند وارداتوں سے راتوں رات امیر بن جانا چاہتے ہیں۔ علم الجرائم کے طلبہ نے جرائم کے دو بڑے اسباب گِنائے ہیں نفسیاتی اور معاشی۔ اُن کے خیال میں بعض عورتیں اور مرد پیدائشی جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ وہ فتورِ ذہن کے باعث جھٹ اشتعال میں آجاتے ہیں اور قاتلانہ حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ اِن لوگوں پر غصّے کا دورہ مرگی اور ہسٹریا کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ ضبط سے کام نہیں لے سکتے۔ دوسرا سبب معاشی زیادہ اہم ہے کہ اِس کے باعث اچھے بھلے صحیح الدماغ لوگ جرائم کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ انسان ابتدائے تاریخ سے شخصی املاک کے حصول اور دولت سمیٹنے کی ہوس میں بے دریغ دوسروں کا خون بہاتا رہا ہے۔ تاریخِ عالم کی بڑی بڑی جنگوں کی تہ میں بھی معاشی عوامل ہی کار فرما رہے ہیں۔ جب ایک شخص کسی دوسرے کی املاک چھین لے تو اُسے

ڈاکو کہتے ہیں لیکن جب ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ کر کے اُس کی دولت پر قبضہ کرے تو اُسے فتح ونصرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بنظرِ غور سے دیکھا جائے تو سکندر، جولیس سیزر، ہنی بعل، چنگیز، تیمور، نپولین وغیرہ ڈاکو ہی تھے اتنا ضرور ہے کہ وہ نہایت وسیع پیمانے پر منظّم ڈاکے ڈالتے تھے۔ اقوامِ عالم میں بغاوت، بدکاری، چوری اور ڈاکے کی سزا موت رہی ہے کیوں کہ اِن جرائم سے کسی بادشاہ یا کسی فرد کی ذاتی املاک پر زد پڑتی ہے۔ عورت کو بھیڑ بکری گائے بیل کی طرح ذاتی املاک میں شمار کیا جاتا تھا اِس لئے اُس کے آقا کا حقِ املاک محفوظ رکھنے کے لئے بدکاری کی سزا موت رکھی گئی تھی اور شوہر کو اِس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ عورت اور اُس کے آشنا کو ناگفتہ بہ حالت میں دیکھ کر دونوں کو قتل کر سکتا تھا۔

قوانین خواہ کتنے ہی کڑے ہوں اور سزا خواہ کتنی ہی سخت ہو اِن سے جرائم کا انسداد ممکن نہیں ہے۔ جرائم کے انسداد کیلئے ایسا معاشرہ قائم کرنے کی ضرورت ہے جو معاشی عدل و انصاف پر مبنی ہو اور جس میں لوگ ذہنی سکون اور معاشی تحفّظ کے باعث نفسیاتی صحت مندی کی زندگی گذار رہے ہوں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اشتراکی ممالک میں ڈاکہ، چوری، قتل، زنا بالجبر کی وارداتیں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں جب کہ "آزادیٔ عمل" اور اخلاقی قدروں کے سب سے بڑے "علم بردار" اضلاع متحدہ امریکہ میں مجرموں کی تعداد دنیا بھر کے مجرموں سے زیادہ ہے۔

جلالی

سندھ کے بے قید اور بے شرع فقیر جلالی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ سر پہ تاج ــــ ایک قسم کی اُونی ٹوپی ــــ اوڑھتے ہیں، سیاہ پشم سے بُنی ہوئی الفی یا کفنی پہنتے ہیں جس کی آستین نہیں ہوتی اور کفن کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ ان کے پاس عصا، تسبیح اور بیراگن ــــ ایک لکڑی جس پر سر رکھ کر مراقبہ کرتے ہیں ــــ ہوتی ہے۔ اِن کا کمر بند سیاہ اُون کا بٹا ہوا ہوتا ہے۔ گلے میں گانی پہنتے ہیں جو سیاہ اُون سے بُنی جاتی ہے اور جس میں سُرخ رنگ کے ریشمی تار ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں کھپری ــــ کھوپڑی کی بدلی ہوئی صُورت ــــ ہوتی ہے جس میں کھانے کی چیزیں رکھتے ہیں اور پانی پینے کے لئے ان کے پاس تومبی ہوتی ہے۔ ان کے پاس سینگ یا ناد ہوتا ہے جسے بھیک مانگتے وقت لوگوں کے دروازے پر کھڑے ہو کر بجاتے ہیں۔

جمالیّات

فلسفے کی ایک شاخ ہے جس میں حُسن کی ماہیت سے بحث کی جاتی ہے اور فنونِ لطیفہ کی جمالیاتی اساس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اِس ایستھیٹکس (جمالیات) کی ترکیب بام گارٹن نے ۱۷۵۰ء میں وضع کی تھی۔ بام گارٹن کے خیال میں جمالیات وہ صنفِ علم ہے جو منطق کی طرح صداقت سے بحث نہیں کرتی بلکہ حِسیاتی تاثرات کو معرضِ بحث میں لاتی ہے۔ ہیگل نے ۱۸۲۰ء میں اپنے ایک مقالے میں بام گارٹن کی یہ ترکیب برتی اور پھر عام رواج پاگئی۔ حُسن کی ماہیت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔

——— "حُسن مسرّت کا وعدہ ہے۔" (ستاں دال)

——— "حُسن جہاں کہیں بھی دکھائی دے اور جس صورت میں دکھائی دے وہ حُسنِ ازل ہی کا پرتو ہے۔" (فلاطینوس)

——— "حُسن اظہار ہے۔" (کروچے)

——— "حُسن جنسی خواہش کی تخلیق ہے۔" (فرائڈ)

——— "حُسن توافق و تناسب ہے۔" (ول ڈیوراں)

——— "حُسن وہ ہے جو نیکی کی طرف مائل کرے۔" (ٹالسٹائے)

اِن اقوال میں جمالیات کے چند اہم نظریات مخفی ہیں جو مختصراً درج ذیل ہیں۔

——— عقلیاتی نظریّہ: کانٹ اور اُس کی پیروی میں کولرج نے پیش کیا۔ کانٹ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ہیوم کے اِس قول کے برعکس کہ حُسن سے جو آسودگی حاصل ہوتی ہے وہ حِسّیاتی ہے یہ آسودگی عقلیاتی ہوتی ہے۔

——— اظہاری نظریّہ: کروچے سے منسوب ہے جس نے کہا تھا کہ جمالیاتی فعل داخلی ہے اور اظہارِ ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ تمثالی پیکر کے کسی فن کار کے ذہن میں اُبھر آنے سے فنی تخلیق کا عمل مکمل ہو جاتا ہے لہٰذا اظہار ہی حُسن ہے۔

——— جذباتی نظریہ: شوپنہاور اور نیٹشے کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حُسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے اُس شئے سے جذباتی لگاؤ کا ترک کرنا ضروری ہے جس میں حُسن پایا جائے۔

——— تجرباتی نظریہ: حُسن کا تجربہ ہیگل کے خیال میں تجرباتی ہے اور ہماری ذات کے عملی پہلو کے مخالف ہے۔ ہیگل فطرت کو حسین نہیں سمجھتا اور جمالیات کو فنونِ لطیفہ کا فلسفہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حُسن ہر حالت میں اِنسانی ذہن ہی کی پیداوار ہے۔ نتیجتہً وہ آرٹ پر فلسفے کی برتری کا قائل ہے۔

——— وجودی نظریہ: فلاطینوس کے خیال میں کائنات کے تمام مظاہر میں حُسنِ ازل ہی جلوہ افروز ہے۔ حُسن خواہ کسی رُوپ میں ہو وہ حُسنِ ازل ہی کا عکس ہے۔ وجودی صوفی شُعراء حافظ شیرازی، عراقی، بُلھے شاہ، خواجہ غلام فرید، میاں محمد بخش وغیرہ کا جمالیاتی نظریہ نو فلاطونی ہی ہے۔

——— اِخلاقی نظریہ: افلاطون، لیوٹالسٹائے اور رسکن کا ہے۔ اِن کے خیال میں حُسن خواہ وہ موسیقی کے توافق میں ہو یا کسی شخص کے تناسبِ اعضا میں ہو اُسے اِنسان کو نیکی کی طرف مائل کرنا چاہیے۔

یہ سب نظریات یا موضوعی ہیں اور یا معروضی: موضوعی نظریہ یہ ہے کہ حُسن ہمیشہ دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے اور معروضی نظریہ یہ ہے کہ حُسن اپنی ذات میں موجود ہے اور کسی شاہد یا موضوع کا محتاج نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں قُدمائے یُونان کا یہ خیال درست ہے کہ حُسن توافق و تناسب میں ہے جو موضوع اور معروض کے مابین تخلیقی رشتہ قائم ہونے سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔

جمہوریت

جمہوریت کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ یہ عوام کی حکومت ہے عوام کے لئے۔ اِس طرزِ حکومت کا آغاز یُونانِ قدیم کی ریاست ایتھنز سے ہوا جب وہاں کے شہریوں نے بادشاہ کو مُلک بدر کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اِن شہریوں کی اکثریت تاجروں پر مشتمل تھی۔ یاد رہے کہ سیکڑوں برسوں کے بعد برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی تاجروں اور ساہوکاروں ہی نے بادشاہوں کے اِقتدار کا خاتمہ کیا تھا۔ یُونانی ریاستوں میں جس جمہوریت کی داغ بیل ڈالی گئی وہ غلامی کے ادارے پر مبنی تھی۔ غلام شہری حقوق سے محروم تھے۔ ارسطو نے اپنی "سیاسیات" میں ریاست کی فلاح کے لئے غلاموں کے وجود کو لازم قرار دیا تاکہ

حکام اور مفکّرین کو نظم و نسق اور فکر و تدبّر کے لئے فراغت کے اوقات میسّر آسکیں۔ جمہوریّت کا دائرہ اثر شہری ریاست کی چار دیواری تک محدود تھا۔ انتخابات کے موقع پر تمام شہری ایک میدان میں جمع ہو جاتے اور کھڑے کھڑے رائے شماری کرا لی جاتی تھی۔ حکومت پر چند متموّل خاندان قابض تھے اس لئے اس نوع کی جمہوریّت کو اشرافیہ کا نام دیا گیا۔

نئی جمہوریّت کا آغاز انگلستان میں ہوا جب جاگیرداروں نے شاہ جان کو مجبور کر کے اُس سے قرطاسِ اعظم پر دستخط کروائے اور اُس کے اختیارات کو محدود کر دیا۔ بادشاہ نے رعایا کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ وہ بغیر مقدمہ چلائے کسی شخص کو قید نہیں کر سکتا۔ جاگیرداروں کا خاتمہ صنعتی انقلاب کے ساتھ ہوا جب سائنس دانوں نے کلیں ایجاد کیں تو صنعت و حرفت کے طریقے بدل گئے۔ صنعت کاروں نے سُوت کاتنے اور کپڑا بُننے کے کارخانے لگائے جن میں ہزاروں مزدور کام کرنے لگے جس سے اقتصادی نظام بدل گیا اور زرعی معاشرہ متنزلزل ہو گیا۔ پیداوار کے طریقے بدل جانے سے پیداوار کے علائق بھی بدل گئے اور جاگیرداروں اور مزارعوں کی کشمکش صنعت کاروں اور مزدوروں کی آویزش میں بدل گئی۔ اِس اقتصادی تناظر میں جدید وضع کی پارلیمانی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں دار الاُمراء کا قیام رجعت پسندوں کو تقویّت دینے کے لئے عمل میں لایا گیا۔ پارلیمنٹ میں وہی لوگ منتخب ہو کر آ سکتے ہیں جن کے پاس وافر سرمایہ ہو یا سرمایہ داروں کے مُعاشی مفادات کے تحفّظ کا ذمہ لیں۔ علاوہ ازیں انتخاب میں کامیاب ہونے کے لئے کسی نہ کسی جماعت سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔ یہ سیاسی جماعتیں تاجروں اور ساہوکاروں کے مفادات کی پرورش کرتی ہیں کہ انہیں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہیں مثلاً اضلاع متحدہ امریکہ میں دو پارٹیوں کا اقتدار ہے ڈیماکریٹ اور ری پبلکن اور یہ دونوں بڑے بڑے اجارہ داروں، صنعت کاروں اور ساہوکاروں کی نمائندگی کرتی ہیں چنانچہ سینٹ اور کانگرس پر انہی کا تصرّف ہے۔ پارلیمانی جمہوریّت میں انتخابات کا ڈھونگ رچا کر عوام کو اِس خوش آئند فریب میں مُبتلا کیا جاتا ہے کہ حکومت اُن کی اپنی ہے اور اُن کی مرضی سے بنائی گئی ہے۔ لیو ٹالسٹائے نے سچ کہا تھا۔

"مملکت سرمایہ داروں کی جماعت کا نام ہے جو محتاجوں اور ضرورت مندوں سے اپنی املاک کو محفوظ رکھنے کے لئے ایکا کر لیتے ہیں۔"

جنّ

جنّوں کا تصوّر قدیم بابل میں بھی موجود تھا۔ نیک جنّوں کو لماسو اور بد کو اولّو کہتے تھے۔ اوستا میں انہیں جینی کہا گیا ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ جنّ ویران جگہوں، کھنڈروں اور پرانے درختوں کے نیچے بسیرا کرتے ہیں اور ان جگہوں کو بول و براز سے آلودہ کرنے والوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ جس عورت یا مرد کو جنّ پکڑ لے اُسے مرگی کی قسم کے دورے پڑنے لگتے ہیں، ذہن میں فتور آجاتا ہے اور وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جنّ نکالنے کے لئے عامل (ایران میں انہیں جن گیر کہا جاتا ہے) جھاڑ پھونک کرتے ہیں، اِس مقصد کے لئے بعض اوقات سُرخ مرچوں کا دھواں دیا جاتا ہے اور بے رحمی سے پیٹا جاتا ہے۔ اِس مار پٹائی سے کئی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ بعض مکّار عورتیں جنہیں اپنے آشناؤں سے ملاقات کا موقع نہیں ملتا جنّ کی پکڑ کا ڈھونگ رچاتی ہیں اور ماں باپ یا سسرال والوں کو نچّے دیتی ہیں۔ جنّ کو قابو کرنے کے لئے جِسے اصطلاح میں تسخیرِ جنّ کہتے ہیں، پیرزادے کسی غار میں چلّہ کاٹتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِس دوران میں جنّ خوفناک شکلیں بنا بنا کر اُنہیں ڈراتے رہتے ہیں تاکہ وہ اِس اِرادے سے باز رہیں لیکن وہ ثابت قدم رہیں تو جن اُن کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ اِن پیرزادوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے جنّ کی مدد سے سر کام لے سکتے ہیں۔ جنّوں کو چوری کا سراغ لگانے، بچھڑے ہوئے دوستوں، آشناؤں کو ملانے اور خفیہ خزائنے معلوم کرنے کے لئے حاضر کیا جاتا ہے۔ حاضرات کا یہ عمل اکثر مشرقی ممالک میں پایا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق جنّ اور فرشتے میں فرق یہ ہے کہ جنّ کھاتے پیتے ہیں اور طبعی عمر کو پہنچ کر مر جاتے ہیں۔ عاملوں کے خیال کے مطابق جنّ روشنی، حرمل کی دھونی، حِنا اور دُوسری خُوشبوؤں سے دُور بھاگتے ہیں۔ لفظ جنّ کا معنیٰ ہے چھُپی ہوئی مخلوق۔ سر سیّد احمد خاں نے اِس کی تاویل کرتے ہوئے کہا ہے کہ بیماریوں کے ننھّے جراثیم ہی جنّ ہیں۔

جنگم

جَین فرقے کا سادھو۔

جینو

جینو بٹا ہوا دھاگا ہے جو اُونچی ذات کے ہندو پہنتے ہیں۔ جینو پہنانے کی رسم پر پنڈت گائتری منتر پڑھتے ہیں۔ اُسی وقت سے لڑکے پر صبح، دوپہر اور شام کی پُوجا پاٹھ فرض ہو جاتی ہے۔ مجوسی جینو کو کُستی کہتے ہیں۔

جنائی

یُونانی زبان میں اس کا معنیٰ ہے بچہ جننے والی یعنی عورت۔ پنجابی زبان میں دایہ کو جنائی کہتے ہیں جو بچہ جننے میں مدد دیتی ہے۔

جوان

یہی لفظ لاطینی زبان میں جووِن، ہسپانوی زبان میں لیوآن اور سنسکرت میں یُو ہے۔

جوق

ترکی زبان میں فوج کے بڑے دستے کو جوق کہتے ہیں۔ جوق در جوق کا مطلب ہوا گروہ در گروہ۔

جوانمردی کی تحریک

اس تحریک کو فرسیّت (فرس، گھوڑا یعنی شہسواری کی تحریک) اور فتوّت (فتیٰ سے بہ معنیٰ جوان) بھی کہتے ہیں۔ یہ تحریک عرب سے اُٹھی اور شام اور ہسپانیہ کے راستے فرانس اور دوسرے مغربی ممالک میں پھیل گئی جہاں اسے شولری (شوَل کا معنیٰ فرانسیسی زبان میں شہسوار ہی کا ہے) کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کی داغ بیل اسلام سے پہلے کے عرب جوانمردوں اور شہسواروں عنترہ بن شدّاد اور مہلہل تغلبی نے ڈالی تھی جنہوں نے شجاعانہ کارنامے انجام دینے، خطرناک مہمات پر جانے، مظلوموں اور قیدی حسیناؤں کی مدد کو پہنچنے کی روایات قائم کی تھیں۔ عنترہ بن شدّاد نے عورتوں کی حفاظت میں مردانہ وار لڑتے ہوئے جان دی تھی۔ صدرِ اسلام میں امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب کو فتوّت کا مثالی نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ شجاعت،

حماست، ایثار و مروت کے پیکر تھے۔ فلپ حتیّ کے الفاظ میں "مشورے کے وقت صائب الرائے، فصیح و بلیغ، دوستوں کے وفادار، دشمنوں کو درگذر کرنے والے علیؑ اسلامی شرافت اور فتوت کے مثالی نمونے تھے۔ بعد میں جب تحریکِ فتیان نے مختلف رسوم اور شعائر اختیار کیے جو ازمنۂ تاریک کی تحریکِ جوانمردی اور جدید سکاؤٹ تحریک سے ملتے جلتے تھے تو علیؑ کو اس تحریک نے اپنا پہلا فتیٰ اور جوانمردی کا اعلیٰ نمونہ تسلیم کر لیا۔" جنابِ امیر ہمیشہ پہلے وار کا اختیار حریف کو دیتے تھے اور اپنی شہامت، عالی حوصلگی اور ضبطِ نفس کے باعث بڑے سے بڑے دشمن پر قابو پا کر امان طلب کرنے پر اُس کی جان بخش دیتے تھے اور دشمن کی عورتوں سے لطف و کرم کا برتاؤ کرتے تھے۔ الناصر عباسی اور صلاح الدین ایوبی فتوت کے علم بردار تھے۔ سب سے پہلے مصر کے ممالیک نے اپنی ڈھالوں اور خودوں پر اپنے مخصوص نشانات کندہ کروائے جن کی تقلید میں اہلِ مغرب نے علاماتِ خانوادگی کو رواج دیا۔ عرب اور ممالیک ایک فوجی کھیل دوران کھیلتے تھے جس میں گھوڑ سوار دائرے میں گھوڑا مارتے ہوئے ایک دوسرے پر کھجور کی چھڑیاں پھینکتے تھے۔ یورپ میں یہی کھیل ٹورنامنٹ (یہ لفظ دوران ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے) کے نام سے رواج پا گیا۔ ابن الخطیب لکھتا ہے کہ ہسپانیہ کے جوان فوجی کھیلوں اور مقابلوں میں اپنی ڈھالوں اور بازوؤں پر اپنے خاص نشانات لگا کر اکھاڑے میں اترتے تھے اور اپنی محبوبہ کا دیا ہوا رومال اپنے خود سے لہرا کر نیزہ بازی کے مقابلے میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے شجاعانہ کارناموں کو طراب (فرانسیسی زبان کا لفظ تروویر اور انگریزی کا لفظ ٹروبے دور اسی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں) نظم کر کے محفلوں میں گاتے تھے۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں یہ رسوم اہلِ مغرب میں بھی رائج ہو گئیں۔ ترکی میں فتیان نے جا بجا مہمان خانے کھول رکھے تھے جہاں مسافروں کی خاطر تواضع کی جاتی تھی۔ ابن بطوطہ نے ترک فتیان کی مہمان نوازی کی بڑی تعریف کی ہے۔

جوُدی

کوہ جودی کوہستان نمک کا پرانا نام ہے جو بابر نے بھی اپنی تزک میں لکھا ہے۔ یادو قبیلے کے نام پر اس کا نام جودی پڑ گیا تھا۔ کرشن اسی قبیلے سے تھا۔ اس کوہستان کے دامن اور نواحی

علاقوں پر قدیم زمانے سے گکھڑوں کی حکومت رہی ہے۔ کچھ علاقے جنجوعہ راجپوتوں اور آوانوں کے قبضے میں بھی رہے ہیں۔ اِس پہاڑ کے دامن میں بڑے قدیم آثار پائے جاتے ہیں۔ سکندر مقدونی گھنڈر (غالباً الگزنڈر کی بدلی ہوئی صُورت ہے) کے راستے کرچھاک آیا اور دریائے جہلم کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ کرچھاک آج کل کے جلال پور شریف کا پُرانا نام تھا۔ اِس قصبے کے شمال مغرب کی طرف منگلا ڈُو کی چوٹی کے سائے میں ہندوؤں کا مشہور دیوی استھان تھا جہاں کالی دیوی کی مُورتی رکھی گئی تھی اِس کے ساتھ ایک صُوفی بزرگ میراں شاکر شاہ کی خانقاہ ہے جو اِس علاقے کی مشہور زیارت گاہ ہے کرچھاک سے چند میل مشرق کی جانب سکندر کے رسالے نے کُٹھر اسے دریا عبور کیا اور چیلیانوالہ کے قریب جہاں آج کل مونگ کا قصبہ آباد ہے، اُس کی جنگ راجہ پورس سے ہوئی۔ انگریز مورخین کی تحقیق کے مطابق سکندر نے دو شہر بسائے تھے ایک اپنے پڑاؤ کے قریب جس کا نام آج کل جلال پور شریف ہے اور دوسرا میدانِ جنگ کے قریب جسے آج کل مونگ کہتے ہیں۔ مونگ کا نام اُس نے نکایا (فتح) رکھا تھا۔ جلال پور شریف کے قریب مقام اں والا میں اُس کے گھوڑے بوسی فیلس کی قبر بھی ہے۔ کسی زمانے میں پنڈدادن خان اور خوشاب کے نواحی علاقے نہایت سرسبز اور شاداب تھے اور چاروں طرف باغات پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں پُرانے زمانے کے قلعوں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ باغانوالہ کا قدیم قلعہ اور مندر جنجوعہ راجپوتوں کی اِملاک میں تھا۔ باغانوالہ میں پانی کے چشمے ہیں جن سے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔ اِس کے شمال کی طرف آرڑا کے قریب وہ مُسطح میدان آج بھی موجود ہے جہاں ابوریحان البیرونی نے کرۂ ارض کی پیمائش کی تھی۔ البیرونی کئی سال باغانوالہ میں مقیم رہا اور یہاں کے پنڈتوں سے سنسکرت زبان سیکھی۔ چوآ، کُسک اور دلور کے قلعے چٹانوں پر تعمیر کیے گئے تھے۔ قلعہ کُسک میں رنجیت سنگھ نے چھ ماہ تک جنجوعہ قوم کے آخری سلطان کا محاصرہ جاری رکھا حتیٰ کہ پانی کی فراہمی نہ ہونے کے باعث اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پنڈدادنخان سے سولہ میل کی مسافت پر کٹاس کی مشہور جھیل ہے جو کوروکھیشتر اور پُشکر کی طرح ہندوؤں کے مقدّس ترین تیرتھوں میں شمار کی جاتی ہے۔ تقسیمِ مُلک سے پہلے یہاں سال میں ایک بار ایک بہت بڑا تہوار منایا جاتا تھا جس میں ہندوستان بھر کے ننگے سادھو آتے تھے۔

کٹاس کو مہابھارت میں "چشمِ عالم" کہا گیا ہے۔ روایت ہے کہ جب شیو کی زوجہ ستی نے آگ میں جل کر خودکشی کی تھی تو شیو کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہنے لگے جن سے پشکر (نزد اجمیر) اور کٹاس کی جھیلیں بن گئیں۔ پانڈو بھائیوں نے کٹاس ہی میں بن باس کاٹا تھا۔ کٹاس کی جھیل کے گرد بودھوں کے ستوپوں اور دیہاروں کے کھنڈر پھیلے ہوئے ہیں اور چھ ق م سے ۹۲۹ء بم تک کے پرانے ہیں۔ اس کی نچلی طرف وادی میں ست گھرا یا سات مندر ہیں جو کننگھم کے خیال میں تعداد میں بارہ تھے۔ اِن کا طرزِ تعمیر وہی ہے جو کشمیر کے مندروں کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر پانڈو بھائیوں نے تعمیر کرائے تھے۔ کٹاس کسی زمانے میں راجہ سنہاپور کی راجدھانی تھی جہاں چینی سیاح ہیون سانگ ساتویں صدی میں آیا تھا۔ اِس سے ایک میل کی مسافت پر چوآ سیدن شاہ مسلمانوں کی زیارت گاہ ہے۔ یہاں کے چوآ (چشمہ) کے پانی سے گلاب کے باغ سیراب ہوتے ہیں۔ بہار کے موسم میں چوآ کا مشہور میلا لگتا ہے اور لوگ عرقِ گلاب کے کنستر بھر بھر کے لے جاتے ہیں۔ کٹاس کے جنوب مشرق میں بارہ میل کی مسافت پر ملوٹ واقع ہے جہاں کے مندروں میں یونانی طرزِ تعمیر کے ستونوں کے عمدہ نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ستون کم ازکم دو ہزار برس کے پرانے ہیں ملوٹ ایک عمودی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اِس کے قریب جنجوعہ سرداروں کا قلعہ ہے۔ ٹلہ جوگیاں کے نواح میں بھی قدیم زمانے کے قلعوں اور مندروں کے آثار دکھائی دیتے ہیں جہلم کا شہر جس کا ذکر مہابھارت میں بھی آیا ہے نہایت قدیم ہے۔ یہیں سے سکندر کا بیڑا سندھ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ شیر شاہ سوری نے گکھڑوں کی سرکوبی کے لئے نالہ کہان کے قریب رہتاس کا مشہور قلعہ تعمیر کروایا تھا جس کی نگرانی پر ٹوڈرمل کھتری مامور تھا۔ یہ قلعہ نہایت عظیم الشان ہے اور یوں لگتا ہے جیسے دیوؤں نے اِسے تعمیر کیا تھا۔ اِس میں ایک بہت بڑی باؤلی تھی جہاں ایک ہی بار ایک سو آدمی پانی پی سکتے تھے۔ اِس کے صدر دروازے کی حالت اچھی ہے لیکن فصیلیں شکستہ ہوگئی ہیں۔ ہمایوں نے اِس کے اندر کا محل مسمار کرا دیا تھا۔ روات کے ریلوے سٹیشن سے چار میل کی دوری پر گندھارا مانکیالہ۔ پرانا نام مانک پور تھا ــــ کے ستوپوں کے کھنڈر ہیں جن کا کھوج رنجیت سنگھ کے اطالوی جرنیل

وان ٹوڑا نے لگایا تھا۔ یہ ستوپے کنشک نے بیس قبل مسیح میں تعمیر کروائے تھے۔ یہ آثار فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے بڑے اہم ہیں۔ لوک بت کہاوٴ کے مطابق یہاں سات راکھشس رہتے تھے جو ہر روز ایک آدمی کھا جاتے تھے۔ انہیں سیالکوٹ کے راجہ سالبوان کے بیٹے راجہ رسالو نے قتل کیا تھا ایک راکھشس اُس کے ہاتھ سے زندہ بچ رہا اور کہتے ہیں کہ آج بھی وہ گندھارا کے غار میں موجود ہے۔ روات میں گکھڑوں کا وسیع خاندانی قبرستان موجود ہے۔

کوہستان نمک میں جابجا چشمے بہتے ہیں جن کے کنارے گاؤں آباد ہوگئے ہیں اور پھل دار درختوں کے باغات ہیں جو چشموں کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ کلّر کہار (بابر نے اِسے کلدا کہار لکھا ہے) کی جھیل بڑی پُرفضا ہے۔ اِس میں ایک چشمے کا پانی گرتا ہے۔ جاڑے میں یہاں مُرغابیاں آتی ہیں اور شکار کے شوقین اِدھر کا رُخ کرتے ہیں۔ یہاں بابر نے باغ صفا لگوایا تھا جس کے کچھ درخت باقی رہ گئے ہیں۔ پہاڑی کی چٹان سے تراشا ہوا تختِ بابری بھی موجود ہے جس پر بیٹھ کر بابر جھیل کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ کھیوڑے کی کان نمک دنیا بھر میں مشہور ہے اور پولینڈ کی کان نمک کے بعد اپنی نوعیت کی دُنیا کی سب سے بڑی کان ہے۔ ہر سال دُور دراز کے مُلکوں کے سیاح اِسے دیکھنے آتے ہیں۔ یہ علاقہ کسی زمانے میں کھوکھر راجپوتوں کی ملکیّت میں تھا۔ مشہور مسلم لیگی رہنما راجہ غضنفر علی خان اِسی خانوادے کے ایک ممتاز فرد تھے۔ کوہستانِ نمک میں بڑے بڑے پُرفضا مقامات ہیں جہاں سیرگاہیں تعمیر کی جاسکتی ہیں اور پھلوں کے باغات لگوائے جاسکتے ہیں۔ اِس علاقے میں جابجا خوبانی، آڑو، لوکاٹ اور بادام کے پیڑ دکھائی دیتے ہیں۔

جھاڑ پھُونک

بد ارواح یا آسیب کا سایہ اُتارنے کے لئے جھاڑ پھونک کرتے ہیں۔ آسیب زدہ کے سر پر چھاج پھٹکتے ہیں۔ جھاڑ پھُونک کو نچھاور بھی کہتے ہیں۔

جھَلّ

دریا کے کنارے سرکنڈے اور نرکل کے گھنے جنگل کو پنجابی میں جھَلّ کہتے ہیں۔ فارسی کا نیستان۔

جہلم

دریائے جہلم کو کشمیر میں ویتھ اور پنجاب میں ویہت کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اس کا نام وِتستا ہے جس کا معنیٰ ہے بکھرا ہوا، کھلا ہوا۔ اِس کا ذکر رِگ وید کے ایک منتر میں آیا ہے۔ یونانیوں نے اسے ہائیڈا سپس بنا لیا۔

جھُمّر

پنجابی دیہات کا لوک ناچ جسے چاندنی رات میں ڈھول کے گرد چکّر کھاتے ہوئے ناچتے ہیں۔ ساتھ ساتھ گیت بھی الاپے جاتے ہیں۔

جھَنڈ

بچّے کے پہلے بال جو محفوظ کر لئے جاتے ہیں تاکہ اِن سے جادو کر کے کوئی بچّے کو ضرر نہ پہنچا سکے۔

جِیا

یونانی دھرتی ماتا کو جِیا یا جے کہتے تھے۔ جیاگرافی یا جیالوجی کی تراکیب اِسی سے بنی ہیں۔

جَین

مہاویر کے پیرو۔ یہ لوگ خُدا کی ہستی کے مُنکر ہیں اور کہتے ہیں کہ مادے میں ایک ایسی خاصیّت ہے کہ وہ خود بخود اشیاء کی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ جین ارھنت (ولی) کو پوجتے ہیں۔ اُن کے خیال میں کُل چوبیس ارھنت ہوئے ہیں جن میں رِشَب جی کو جو پہلے، پارس ناتھ کو جو تیئسویں اور مہاویر کو جو چوبیسویں ارھنت ہیں، بڑی عقیدت سے پُوجتے ہیں۔ جینوں کے پجاریوں کو جتی (مجرّد) کہتے ہیں اور سب ذاتوں کے ہوتے ہیں۔ جینوں کے دو فرقے مشہور ہیں دِگمبر اور سوتیمبر۔ دِگمبر اپنی مورتیوں کو ننگا رکھتے ہیں اور خود بھی ننگے رہتے ہیں۔ انہیں سراوگی بھی کہتے ہیں۔ سوتیمبر سفید لباس پہنتے ہیں۔ سویت سنسکرت میں سفید کو کہتے ہیں۔

چاک

(۱) بھینس چرانے والا۔ چاکر کا مخفف ہے۔ تاتاری میں چاکر بادشاہ کے نجی خادم کو کہتے تھے۔
(۲)۔ لکڑی کا چاک جسے گھما کر کمہار اُس پر مٹی کے برتن بناتے ہیں۔

چارواک

سنسکرت میں چارواک کا معنیٰ ہے چالاک، تیز طرّار۔ اس نام کا ایک وِدوان بھی ہوا ہے جس کی پیروی کرنے والوں کو چارواک کہا گیا۔ بعض اہلِ تحقیق کے خیال میں چارواک برہسپتی کے پیرو ہیں۔ بہرصورت قدیم ہند میں چارواک مادہ پرست اور مُلحد تھے۔ اُنہوں نے خدا کی ہستی، حیات بعد موت، رُوح کے وجود، ویدوں کی صداقت، برہمنوں کی برتری اور سنسار چکّر سے اِنکار کیا۔ وہ کہتے تھے کہ وید خود برہمنوں نے لکھے ہیں اور یگیہ، ہوم شرادھ اور پُوجا پاٹھ کے رُسوم بھی برہمنوں نے بنائے ہیں تاکہ وہ سادہ لوح عوام کو فریب دے کر زر و دولت سمیٹتے رہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ رُوح مغزِ سر ہی سے متعلق ہے اور اس کے معطّل ہونے پر مر جاتی ہے۔ مَوت کے بعد اِنسان عناصر میں تحلیل ہو کر مِٹ مٹا جاتا ہے۔ سوَرگ، نرک اور جزا سزا محض واہمے ہیں۔ عُقلاء اِس چار روزہ زندگی میں حسبِ توفیق مسرّتیں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گوتم بدھ نے بھی چارواک ہی سے مُتاثر ہو کر خدا کی ہستی اور رُوح کی بقا سے اِنکار کیا تھا۔

چُٹکلا

جنوبی ہند میں بیوہ عورت کے دوسرے شوہر کو چُٹکلا کہتے ہیں۔ موسیقی کی اصطلاح میں جونپور میں گائے جانے والے عشقیہ گیت کو یہ نام دیا جاتا ہے۔

چڑیل

اُس عورت کا پریت ہے جو زچگی میں مر جائے ۔ کہا جاتا ہے کہ چڑیل سامنے سے گوری اور پیچھے سے کالی ہوتی ہے ۔ اُس کے پَیر پیچھے کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی لئے پنجابی میں منوس عورت کو پچھ پَیری کہتے ہیں ۔ چڑیل نوجوانوں کو ورغلا کر لے جاتی ہے اور اُن کا رس نچوڑ کر انہیں واپس بھیج دیتی ہے جب اُن کے سر کے بال سفید ہو چکے ہوتے ہیں ۔ چڑیل ایک آوارہ بدروح ہے جو بعض اوقات کسی مُردے کے قالب میں گھس جاتی ہے ۔ سب سے خوفناک چڑیل لُوناں چماری (لُون = نمک) ہے جس کے نام پر اُودھ کے دریائے لونی کا نام رکھا گیا ہے بچّے کی پیدائش پر عورتیں کھانے پینے کی چیزیں اس کی بھینٹ کرتی ہیں تاکہ وہ خوش رہے اور نومولود کو ضرر نہ پہنچائے ۔

چاند

سُورج کی طرح چاند بھی اِنسان کا قدیم دوست ہے ۔ جب وہ غاروں میں رہتا تھا تو اُس کی بھیانک راتیں چاندنی سے جگمگا اُٹھتی تھیں اور ہولناک تاریکیوں میں سر اُٹھانے والے خدشات اور واہمے دُور ہو جاتے تھے ۔ اِس لئے چاند کی پُوجا ذوق و شوق سے کی جاتی تھی ۔ اقوامِ عالم کی دیو مالا میں چاند بار آوری کا دیوتا بن گیا ۔ عورتوں کا خیال تھا کہ چاند اُن کے ایاّم لاتا ہے ۔ ماہواری کی ترکیب اِسی خیال سے یادگار ہے ۔ چاند وقت کا پیمانہ بن گیا لوگ شب و روز ، ہفتہ اور مہینہ (ماہ ، مہینہ : چاند) کا حساب اُس کے گھٹنے بڑھنے سے کرنے لگے ۔ قمری سال اُسی دَور سے یادگار ہے ۔ مشرقِ وُسطیٰ میں چاند کی پُوجا سِن دیوتا کے نام پر کی جاتی تھی ۔ سینائی دوادی کا نام سِن ہی پر رکھا گیا تھا ۔ لوگ چاند کی سطح پر کے دھبوں کی عجیب و غریب توجیہات کرتے رہے ہیں ۔ ہمارے لوگ بُت کہاؤ میں ایک بُڑھیا چاند میں بیٹھی چرخا کات رہی ہے ۔ ہندو دیو مالا میں کہا گیا ہے کہ چاند نے رشی گوتم کی زوجہ کو ورغلا لیا تو رشی نے خفا ہو کر اپنی کھڑاؤں اُسے دے ماری جس سے یہ دھبے پڑ گئے ۔ ہندوؤں کے یہاں چاند کو سوم بھی کہتے ہیں ۔ سومناتھ (چاند : سوم ، ناتھ : آقا) کا عظیم مندر اُس کی پُوجا کا مرکز تھا جہاں اُس کے لِنگ کی پُوجا کی جاتی تھی ۔ چاند گرہن پر حاملہ عورتیں پھرتی سے کوئی شے نہیں

کا مِتیں مبادا جنین کے بدن پر داغ پڑ جائے۔ اِس موقع پر حاملہ گائے کے سینگوں پر سیندور رَل دیتے ہیں اور اچار چٹنیاں چھپا دی جاتی ہیں کہ خراب نہ ہو جائیں۔ قدیم زمانے کے صابئین اپنے خودوں پر ہلال کا نشان پہنتے تھے جس کے دونوں سِرے اوپر کی طرف اُٹھے ہوتے تھے۔ آج بھی بعض اقوام کے پھریروں پر ہلال کا نشان موجود ہے۔ چاند کے بارے میں ایک توہّم یہ ہے کہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے آدمی فتورِ ذہن میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ پاگل کے لئے LUNATIC کا لفظ ہے، (چاند کو لاطینی میں LUNA کہتے ہیں۔) کیمیاگروں کی اصطلاح میں چاندی کو قمر کہتے ہیں اور سونے کو شمس کا نام دیتے ہیں۔ اکثر اقوام کے علم نجوم میں چاند کو نحس مانا گیا ہے۔

چاندنی

فرشِ چاندنی ملکہ نورجہاں کی ایجاد ہے۔

چٹھ

نئے مکان میں بسیرا کرنے سے پہلے جو دعوت دی جاتی ہے اُسے پنجابی میں چٹھ کہتے ہیں۔

چراغ

چراغ اور عربی کا سراج شامی زبان کا شراگا کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

چراغی

ہر جمعے کو بچے اپنے اُستاد کے لئے کچھ رقم لاتے تھے اُسے چراغی یعنی چراغ کا خرچ کہا جاتا تھا۔ کسی بزرگ کے مزار پر چراغی کے نام پر رقم چڑھائی جاتی ہے۔ جوئے خانے کا مالک جواریوں سے کچھ رقم بطور چراغی وصول کرتا ہے۔

چغتائی

چغتائی تاتاری زبان میں جنگلی گھوڑے کو کہتے ہیں۔ چنگیز خاں کے ایک بیٹے کا نام تھا۔

چک

کنواں کھودا جائے تو ٹوبھا (غوطہ خور) غوطہ لگا کر پانی کی سوتوں کی نشاندھی کرتا ہے۔ اس کے بعد

لکڑی کا بنایا ہوا گول چک کنویں میں ڈال دیتے ہیں جس پر اینٹوں کی چنائی کی جاتی ہے۔ جب نہریں نکالی گئیں اور بار کے علاقے آباد ہوئے تو بستی بسانے سے پہلے کنواں کھودا جاتا تھا جس میں حسب معمول چک رکھتے تھے اس لئے ان بستیوں کو چک کہنے لگے۔

چکور

ایک پرندہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ چاند پر عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ چودھویں کے چاند کی طرف اڑانیں بھرتا ہے گویا اس تک پہنچنا چاہتا ہے حتیٰ کہ بے دم اور نڈھال ہو کر گرتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے۔ لوگ شاعری میں سچے عاشق کو چکور سے تشبیہہ دیتے ہیں۔

چکوا چکوی

سُرخ رنگ کے آبی پرندوں کا جوڑا جس کے نر اور مادہ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ جب ایک مر جائے تو دوسرا کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور بھوکا پیاسا مر جاتا ہے۔ لوگ بٹ کہاؤ میں ان کا پیار مثالی سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

چلغوزہ

غوزہ کا معنیٰ ہے مغز یعنی (ایک قسم کی) چیل کا مغز۔

چائے

چین میں چا؛ اُس پانی کو کہتے ہیں جسے کھولا کر عرق نکالتے ہیں۔ پتیوں کو چائے کہتے ہیں۔ عربی میں یہ لفظ شائ بنا، ترکی، روسی اور پُرتگالی زبانوں میں چائے ہے۔ فرانسیسی میں تے اور انگریزی میں ٹی۔ ہمارے ہاں کا لفظ چا؛ چین کا اصل لفظ ہے۔ پہلے یورپین نے ۱۵۴۵ء میں ایک ایرانی تاجر حاجی محمد سے چاء پینا سیکھا تھا اور پھر اسے مغرب میں رائج کیا۔

چشتیہ

صُوفیہ کا ایک مشہور فرقہ ہے۔ چشت ایران کا ایک قصبہ تھا جہاں آکر ابو اسحاق شامی نے جو شیخ العلو دینوری کے مُرید تھے قیام کیا۔ اُنہیں چشتیہ صُوفیہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ خواجہ معین الدین حسن

سجز میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ خواجہ عثمان چشتی کے مُرید تھے، ہندوستان میں آکر اجمیر میں مقیم ہوئے اور چشتیہ سلسلے کو پھیلایا۔ شیخ فریدالدین گنج شکر کے خلیفہ نظام الدین اولیاء اور اُن کے خلفاء نے اس سلسلے کو ہندوستان بھر میں پھیلا دیا۔ دہلی میں شیخ نصیرالدین محمد چراغ، امیر خسرو، اُجین میں شیخ اخی سراج، گجرات میں شیخ حسن، گلبرگہ میں سید محمد گیسو دراز، پنجاب میں خواجہ سُلیمان تونسوی، خواجہ شمس الدین سیالوی، سید حیدر علی شاہ جلالپوری، پیر مہر علی شاہ گولڑوی وغیرہ نے اس کی اشاعت کی۔ اس سلسلے کے صوفیاء وحدت الوجود کے قائل تھے اور صُلح کل وسیع المشرب تھے۔ ہندوؤں کی اکثریت نے انہی کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا۔ چشتیہ میں سماع جائز ہے اور ان کی مجالس میں وجد و حال کے روح پرور نظارے دیکھنے میں آتے ہیں۔

چَندن

ایک خوشبودار سفیدی مائل زرد لکڑی جسے اگر اور عود میں ملا کر دُھونی بناتے ہیں۔ عربی میں اسے صندل کہا جاتا ہے۔ پنجابی کے شاعر محبوب کی گدرائی ہوئی فربہ رانوں کو "چندن دیاں گیلیاں" کہتے ہیں۔

چَنڈال

جس کی ماں برہمنی اور باپ کسی نیچ ذات کا ہو اُسے چنڈال کہتے ہیں۔ ہندو سماج میں اسے سخت نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس سے مُردے اُٹھانے یا جلاد کا کام لیتے ہیں۔

چُوچک

تُرکی زبان میں چُوچک کا معنیٰ ہے رخسار یا رخسار کا تِل۔ ہمایوں کی ایک بیوی کا نام ماہ چُوچک تھا یعنی چاند سے رخساروں والی۔ سنسکرت میں سرِ پستان کو چُوچک کہا جاتا ہے۔

چَوکی بھرنا

پنجاب میں کسی عورت نے کسی بزرگ کے مزار پر منت مانی ہو اور اُس کی مُراد پوری ہو جائے تو وہ ایک دن رات مزار پر حاضری دیتی ہے۔ اسے چوکی بھرنا کہتے ہیں۔

چَوماسا: چار مہینے برسات کے یعنی ساون، بھادوں، اسوج، کاتک۔

چوہڑا

چوہڑا مسلمان ہوجائے تو اِسے دیندار کہتے ہیں اور سکھ بنے تو مذہبی سکھ کہلاتا ہے۔

چوہڑیٹی

پنجابی شاعری کی ایک صنف جس میں شاعر اپنے آپ کو چوہڑی فرض کر کے خدا کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ وارث شاہ کی چوہڑیٹی مشہور ہے۔

چھاپہ

بلاک کی چھپائی چینیوں کی عظیم ایجاد ہے جس نے جنوبی سُونگ خاندان (۱۲ ویں صدی عیسوی) کے عہدِ حکومت میں رواج پایا۔ دُنیا کی سب سے پہلی کتاب جو چھاپی گئی ہیرا سُوتر ہے جو ۱۱ مئی ۸۶۸ء کو ایک بودھ سوامی وانگ چی ہی نے چھاپی تھی۔ اِس کے ساتھ تاش کے چھپے ہوئے پتّوں کا کھیل مقبول ہوا جو یورپ میں چودھویں صدی میں پہنچا۔ ۱۲۹۴ء میں ایرانی بلاک کی چھپائی سے آشنا ہوئے۔ مغرب میں گٹن برگ نے چھاپے کی مشین بنائی تھی۔

چھتری

بُدھ مت میں جو بڑے سوامی ہو گذرے ہیں اُن کے چیلے اُن کی ہڈیاں، بال، دانت، ناخن وغیرہ تبرّک کے طور پر محفوظ کر لیتے اور اُن پر چھتری نام کی عمارت تعمیر کرتے تھے۔

چھٹی

بچّے کی پیدائش کے چھٹے دن خوشی کی یہ تقریب منائی جاتی تھی۔ زچّہ کو جڑی بوٹیوں سے معطّر کئے ہوئے پانی میں نہلایا جاتا تھا۔ بچّے کو کسی بوڑھے کے کپڑوں سے بنا ہوا کُرتا پہناتے تھے تاکہ اُس کی عمر دراز ہو۔ زچّہ اپنے کمرے سے قرآن ہاتھ میں لئے آنکھیں میچ کر باہر نکلتی اور سات بار آسمان کی طرف دیکھتی تھی۔ پھر اُسے ست اناجہ کھلایا جاتا جس سے سات سُہاگنیں ایک ایک لقمہ لیتی تھیں۔

چھلّڑ : سِکھ چاندی کے روپے کو چھلّڑ کہتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں چھلڑا کہا جاتا ہے۔

چھُری کانٹا

سترھویں صدی میں فرانس کے ڈیوک مونتا سیر نے چھُری کانٹے سے کھانا کھانے کو رواج دیا۔ اُس سے پہلے وینس کے ایک حاکم کی نازک مزاج بیوی سونے کے کانٹے سے کھانا کھاتی تھی جس کے ساتھ وہ سونے کا چمچ بھی استعمال کرتی تھی۔ ڈیوک مونتا سیر نے کانٹے کے ساتھ چھُری کا استعمال شروع کیا۔

چھند

دکن کے عشقیہ گیت جو لوک گیتوں سے لئے گئے ہیں۔ چھند کے چار مصرعے ہوتے ہیں۔ تلنگہ اور کرناٹک میں انہیں دھرودا کہتے ہیں، جونپور میں چٹکلا، دلّی میں قول اور ترانہ گایا جاتا ہے اور متھرا میں بشن پد جس میں وشنو کی مناجات کی جاتی ہے اور بندھ میں کامی جسے کانی بھی کہتے ہیں۔

چکلا

سلاطین مغلیہ کے عہد میں صوبے کو سرکاروں یا چکلوں میں تقسیم کرتے تھے اور سرکار کو پرگنوں میں۔ بعد میں لفظ چکلا رنڈیوں کے بازار کے مفہوم میں برتا جانے لگا۔

چھجّو کا چوبارہ

چھجّو بھگت کا چوبارہ شاہ عالمی دروازے کے باہر لالہ رتن چند داڑھی والا کی سرائے کے قریب تھا۔ چھجّو بھگت شاہ جہان کے عہد میں ہوا۔ ساری عمر تجرّد کی حالت میں گذار دی۔ یہ کہاوت اُسی سے منسوب ہے "جیہڑا سُکھ چھجّو دے چوبارے نہ بلخ نہ بخارے۔"

ح

حرام

لفظ حرام میں امتناع اور احترام ہر دو مفہوم موجود ہیں۔ جن جانوروں اور پرندوں کا گوشت کھانا منع ہے اُنہیں حرام کہتے ہیں۔ دوسری طرف مسجد الحرام اور محرّم الحرام میں احترام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ حرام طَبُو کا صحیح مُترادف ہے۔

حسب نسب

حسب جو ورثے میں ملے اور نسب جو ذاتی خوبیوں پر مشتمل ہو۔

حُقّہ

حُقّہ اُس گولے کو کہتے ہیں جو مداری ہوا میں اُچھالتے ہیں۔ فارسی کے شاعروں نے آسمان کو حُقّہ باز کہا ہے کیوں کہ وہ مداری کی طرح لوگوں کے جذبات سے کھیلتا ہے۔ اُن آتشی گولوں کو بھی حُقّے کہتے تھے جو قلعے کے اندر محاصرین پر پھینکے جاتے تھے۔ تمباکو نوشی کا رواج ہوا تو گولے میں پانی بھر کر اُس پر نڑی نیچہ کا اضافہ کر لیا گیا اور اِسے حُقّہ کہنے لگے۔

حقیقت نگاری

ادب و فن کی مشہور تحریک جس کا آغاز رُومان پسندوں کی رقیق جذباتیّت اور بے راہ رَو تخیل آرائی کے خلاف اِحتجاج سے ہوا تھا۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں عوام کی ہمہ گیر بیداری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ اِس زمانے کے اکثر اہلِ قلم نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو بالائی طبقات کے مُعاشی اور معاشرتی تصرّف سے نالاں تھا اِس لئے قُدرتاً اُنہیں عوامی زندگی سے ہمدردی پیدا ہو گئی اور جرمنی، فرانس، روس اور انگلستان کے اُدباء اور قصّہ نویس روزمرّہ کے شہری اور دیہاتی زندگی کی

ترجمانی کرنے لگے۔ اس طرح ادبیات میں حقیقت نگاری کو فروغ ہوا جو شدہ شدہ ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کرگئی۔ آج بھی جب کہ اس کے متوازی رمزیت، ماورا، واقعیت، نو رومانیت وغیرہ کی تحریکیں بن بن کر بگڑ رہی ہیں اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

انگلستان میں میریا اجورتھ نے سب سے پہلے دیہاتی زندگی کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کئے۔ جان گاؤ پاؤس اور میس فیلڈ نے اس رجحان کو آگے بڑھایا۔ ڈکنز کے قصوں میں اس دور کے نچلے طبقے کے مصائب و آلام کی سچی اور درد بھری تصویریں ملتی ہیں۔ ایڈورڈ کارپنٹر کو کسانوں سے دلی ہمدردی تھی۔ وہ خود کسان بن کر دیہات میں مقیم ہو گیا چنانچہ اُس کے قصوں میں جیتے جاگتے دیہاتی کردار ملتے ہیں۔ فرانس میں بالزک اور ستاں دال کے ناولوں میں یہ تحریک پروان چڑھی اور زولا کی فطرت نگاری میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اطالوی ادیب پیراں دلو نے اس کا رُخ اظہاریت کی طرف موڑ دیا۔ بیسویں صدی میں اشتراکی انقلاب کے بعد اس تحریک نے ترقی پسندی کا روپ دھار لیا۔ ترقی پسند شاعر اور قصہ نویس عوام کی روزمرہ کی زندگی کی عکاسی اور ترجمانی ہی نہیں کرتے بلکہ اُن کے انقلابی ولولوں کی آبیاری بھی کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں پریم چند ایک بڑا حقیقت نگار تھا جو اواخر عمر میں ترقی پسندی سے رجوع لایا۔ پریم چند کی اس روایت کو کرشن چندر نے بامِ کمال تک پہنچا دیا۔

حِکمت

بقول راغب اصفہانی حکمت کا معنیٰ ہے علم و عقل سے حق کو پالینا۔ یہ لفظ حکم سے ہے جس کا اصل معنیٰ ہے اصلاح کے لئے روک دینا۔

حلف

پُرانے زمانے کی اکثر اقوام میں یہ دستور تھا کہ حلف لیتے وقت لوگ ایک دوسرے کے خُصیتین پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اس طرح کی حلف ناقابلِ شکست سمجھی جاتی تھی۔

حُسنِ نسوانی

اقوامِ عالم کی شاعری، مصوّری اور بُت تراشی میں حُسنِ نسوانی کے مثالی نمونے ملتے ہیں۔ پُر شباب،

متناسب الاعضاء، کشیدہ قامت لڑکی کو جس کے چہرے کے نقوش ہموار اور موزوں ہوں ہر کہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندو، جرمن، روسی اور عرب غیر معمولی طور پر اُبھری ہوئی چھاتیوں اور بوجھل کولہوں پر فدا رہے ہیں۔ جرمن بھرے بھرے کولہوں کو ہنڑ باکن (پیچھے کے رخسار) کہتے ہیں۔ ہندو سنگ تراشوں نے اپسراؤں اور یکشینیوں کے جو مجسمے تراشے ہیں اُن میں چھاتیوں اور کولہوں کے اُبھار کو خاص طور سے نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے۔ اُن کی مثالی حسینہ پینا پیودھرا (بڑی بڑی سڈول اُبھری ہوئی چھاتیوں والی) اور پرتھو نیتم وینی (بوجھل کولہوں والی) ہے۔ الف لیلہ ولیلہ میں فربہ اندام حسیناؤں کی چال کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ مٹک مٹک کر چلتی ہیں تو اُن کے کولہے موجیں مارنے لگتے ہیں۔ پتلی کمر ہر کہیں دلکش سمجھی جاتی ہے کیوں کہ اس سے چھاتیوں اور کولہوں کے اُبھار زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ایرانی کشیدہ قامت عورت کو سروسہی سے تشبیہ دیتے ہیں اور اُس کی خوبصورتی پر مرتے ہیں بشرطیکہ اُس کے ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے اور گداز ہوں۔ چینی ننھے منے پاؤں پر جان چھڑکتے تھے اور اس مقصد کے حصول کے لئے بچیوں کے پاؤں کس کر باندھ دیتے تھے۔ مشرق میں لمبی سیاہ زلفوں، بڑی بڑی کٹوری دار سیاہ آنکھوں کا جن کی چمک دمک نوکدار گھنی پلکوں کے سائے میں ماند پڑ گئی ہو ذکر تعریف سے کرتے ہیں۔ آنکھوں کی خمار آلود خستگی کی کیفیت کے باعث انہیں چشمِ بیمار یا نرگسِ بیمار کہتے ہیں۔ پتلے اور محرابی ابروؤں، سیدھی ناک، لال رخساروں، ترشے ہوئے مدھ بھرے ہونٹوں کے گیت ہر کہیں گائے جاتے ہیں۔ لمبی اور گداز شمعی اُنگلیاں حُسن کا لازمہ سمجھی جاتی ہیں۔ سُریلی آواز کسی حسینہ کی کشش کو دوگونہ کر دیتی ہے۔ ایرانیوں نے ایک حسین عورت کے بدن میں پورا باغ کھلا دیا ہے۔ سرو قد، شمشاد قد، غنچہ دہن، سیب رخسار، نرگس چشم، گل رخ، انارپستان کی تراکیب اس بات پر شاہد ہیں۔ بھری بھری گردن، چاہِ ذقن اور سیمِ غبغب کو ہر کہیں پسند کیا جاتا ہے۔ متناسب اعضا، موزوں نقوش اور گدراہٹ کے ساتھ عشوہ و ادا بھی حُسن کے لوازم میں ہیں۔ اہلِ مغرب کشیدہ قامت، سُنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کو پُرکشش خیال کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں کہاوت ہے کہ شرفا اسی نوع کی لڑکی سے بیاہ

کرتے ہیں۔ اطالیہ، جنوبی فرانس اور ہسپانیہ میں البتہ چشمِ آہو اور زلفِ سیاہ کو پسند کیا جاتا ہے۔ آج کل حسنِ نسوانی کے معیار بہت کچھ بدلتے جا رہے ہیں، عورت کے چہرے کے نقوش کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے اور وہی عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے جو گدرائی ہوئی متناسب الاعضاء ہو اور جس میں بھرپور جنسی کشش ہو۔ گویا حسن کا معیار عورت کے چہرے سے ہٹ کر اُس کے بدن میں آ گیا ہے۔

حلالہ

احناف کی فقہ کی رُو سے جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اُس سے رجوع کرنا چاہے تو اُس کی بیوی کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کر دیا جاتا ہے جو خلوتِ صحیحہ کے بعد اُسے طلاق دے دیتا ہے اور پھر پہلا شوہر اُس سے نکاح کر لیتا ہے۔ اس عمل کو حلالہ کہتے ہیں اور حلالہ نکالنے والے کو مستحل کہا جاتا ہے۔

حلول

یہ عقیدہ ہے کہ خدا اپنے بعض برگزیدہ بندوں میں حلول کر جاتا ہے۔ فرقۂ حلولیہ کا بانی حسین بن منصور حلاج تھا۔ اُس نے کہا کہ جب خدا نے آدم کے پتلے میں رُوح (سانس) پھونکی تھی تو اُس نے آدم میں حلول کر لیا تھا۔ بعد میں وہ برگزیدہ ہستیوں میں حلول کرتا رہا ہے۔ اسماعیلیہ کے خیال میں خدا اُن کے امام میں حلول کرتا ہے۔ یہ خیال آریاؤں کے اوتار کے تصور سے لیا گیا ہے۔

حیض

اِسے ماہواری، ایام، کپڑے آنا، سر میلا ہونا بھی کہتے ہیں۔ وحشی قبائل کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان شروع سے حیض اور نفاس کے خون سے خوف زدہ رہا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ بد ارواح عورت میں حلول کر جاتی ہیں جس سے اُسے ایام آتے ہیں یا چاند اُسے بہکا کر ماہوری کا باعث ہوتا ہے۔ حائضہ کو ایک الگ تھلگ جھونپڑے میں بند کر دیتے ہیں۔ اِن ایام میں اُسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی کہ کہیں وہ سورج کی روشنی کو آلودہ نہ کر دے۔ حائضہ کے لئے اجار چٹنیوں کو چھونا یا نومولود بچے کو دیکھنا ممنوع ہے۔ یہ طبو نہایت قدیم ہے اور آج بھی افریقہ، آسٹریلیا اور مغرب الہند کے وحشی قبائل کے علاوہ بعض مہذب اقوام میں باقی ہے۔

خالصہ

سلاطین دِلّی کے دورِ حکومت میں بادشاہ کی ذاتی املاک کو خالصہ کہتے تھے۔ بعد میں سِکھ اپنے آپ کو خالصہ کہنے لگے۔

خانقاہ

اصلاً یونانی زبان کا لفظ ہے۔ پہلوی میں خانگاہ بنا، مُعرّب ہوا تو خانقاہ کہنے لگے۔ پنجابی میں آج بھی خانگاہ کہتے ہیں۔

ختنہ

ختنے کی رسم بار آوری اور افزائش کی دیویوں عِشتار، سائی بیلی وغیرہ کی پُوجا سے یادگار ہے جن کے سالانہ تہواروں پر اُن کے عقیدت مند اپنے آلاتِ تناسل کاٹ کر بھینٹ کیا کرتے تھے اور پھر زنانہ کپڑے پہن کر اُن کے مندروں میں خدمات انجام دیتے تھے۔ بعد میں آلاتِ تناسل کے قطع کرنے کے بجائے قربانی کی علامات کے بطور حشفے کا غلاف کاٹنے کا رواج ہوا۔ یہودی ختنے کی رسم مِصر سے لائے تھے۔ قیامِ مصر سے پہلے اُن کے یہاں ختنہ کرانے کا رواج نہیں تھا، بعد میں اُن کے مذہب کا لازمی جُزو بن گیا۔ آج کل مغرب میں صحت وصفائی کے لئے بعض لوگ ختنہ کراتے ہیں۔ جب برطانیہ کی موجودہ ملکہ الزبتھ نے اپنے بیٹے چارلس کا ختنہ ایک یہودی ربّائی سے کروایا تو اُس کی عیسائی رعایا نے تعرّض نہیں کیا۔

خُدا

قدیم پہلوی کا خُوتائی جس کا معنیٰ ہے آقا یا مالک۔ فارسی میں خُدا بن گیا۔

خُرافہ: پھُول کے نازک میٹھے حصّے کو خُرافہ کہتے ہیں جسے شہد کی مکھیاں رغبت سے کھاتی

ہیں۔ اِصطلاح میں کوئی مزیدار کہانی۔

خِرد افروزی

اٹھارھویں صدی کی مشہور عقلیاتی تحریک جو ہالینڈ اور فرانس سے شروع ہو کر تمام مغربی ممالک میں پھیل گئی۔ اِس دَور کے فلاسفہ کے پیش نظر دو نصب العین تھے (۱) ـــ عقلیت (۲) ـــ اِنسان دوستی۔ وہ اُس شاندار عقلیاتی ہیجان کے وارث تھے جو اِحیاء العلوم کے دَوران میں یورپ میں اُبھرا تھا۔ اُن کی اولیات یہ ہیں کہ انہوں نے فکر و تدبّر کی روشنی کو دنیا بھر میں پھیلایا۔ عُلماء اور ماہرین کے بجائے عام عورتوں مردوں کو مخاطب کیا اور اعلان کیا کہ تہذیب و تمدّن اور علوم و فنون تمام بنی نوع اِنسان کی مُشترکہ میراث ہیں۔ اُنھوں نے فکرِ اِنسانی میں نئی رُوح پھونک دی، اُمید کی رُوح۔ وہ اِنسان کو فطرتاً نیک مانتے تھے اور اُنہیں توقّع تھی کہ مستقبل میں نیکی ہی فتحیاب ہوگی۔ اُن کی اِنسان دوستی حقیقی اور گہرے جذبے پر مبنی تھی جس نے اُن میں بے پناہ جوش و خروش پیدا کیا۔ وہ مذہب سے بدظن تھے لیکن اِنسان پر کامل اِعتماد رکھتے تھے۔ اُن کے اِس اعتماد کا اِظہار ایّامِ دہشت میں ہوا جب شریف النفس کندورسے نے اپنی پناہ گاہ میں جہاں سے وہ مَر کر ہی نکلا اپنی تاریخ ساز کتاب "ذہنِ اِنسانی کی ترقّی کا خاکہ" لکھی جس کے آخری باب میں اُس نے پیش گوئی کی کہ مستقبل میں فتح عقل و خِرد ہی کی ہوگی۔ کندورسے کے علاوہ والٹیر، دیدرو، دالمبر، کبانسے، دولباخ اور مالسکو نے عقلیت کی اِس تحریک کو پروان چڑھایا۔ اِن فلاسفہ نے مِل کر قاموس عُلوم (انسائیکلوپیڈیا) مرتّب کی جس میں عقلیاتی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے مضامین لکھے۔ قاموسیوں نے اُمراء کے اِستحصال اور پادریوں کی دین فروشی کے پردے بڑی بے رحمی سے چاک کئے۔ وحی اور اِلہام کے تصوّر کو ردّ کر دیا اور مادیّت پسندی کا ابلاغ کیا۔ اُن کی تحریروں کے باعث عقل و خِرد کا اِحترام اور اِنسانی حقوق کی پاسداری کا اِحساس ہر کہیں مقبول ہو گئے، اِنسانی مساوات و اخوّت جیسی تراکیب زبان زدِ عوام ہو گئیں، قاموسیوں ہی نے اِنقلابِ فرانس کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ ہمارے زمانے میں اِشتراکی اِنقلابیوں نے بھی اُن سے بہت کچھ اِستفادہ کیا ہے۔

خسرو

قیصر، کسریٰ، خسرو، کزار (زار روس) سیزر کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ لاطینی میں سیزر کا صحیح تلفظ قیصر ہے۔

خلعت

لفظی معنیٰ ہے جو آدمی اپنے بدن سے جُدا کرے۔ بادشاہ کسی کو انعام میں اپنا لباس، خنجر، زیور، انگوٹھیاں وغیرہ بخش دیتے تھے۔ اسے خلعت کہتے تھے۔ خلعت میں گھوڑا، تلوار اور سونے کی زنجیریں اور پرتلے بھی مشمول تھے۔

خنّاس

لغوی معنیٰ ہے: جو خدا کا نام لینے پر سکڑ جائے، شیطان مُراد ہے۔

خواب

سگمنڈ فرائڈ نے اپنے ایک دوست لِسٹر کے نام ایک خط میں خواب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا "سوتے میں ذہن کے عمل کو ہم خواب کہتے ہیں"۔ فرائڈ کہتا ہے کہ خوابوں میں گہرے معنی مخفی ہوتے ہیں جو ترجمانی سے واضح ہو جاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں خواب آرزو پروری سے جنم لیتا ہے یعنی اس میں ناآسودہ خواہشات کی تشفّی کا سامان ہوتا ہے۔ خواب کے دو پہلو ہیں (۱) خفی (۲) جلی۔ خواب کی ترجمانی سے اس کے خفی پہلو کو اُجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے جو اس کا اصل موضوع ہے۔ گذشتہ روز کا کوئی واقعہ یا تجربہ ماضی کے احوال کو انگیخت کر کے انہیں خواب کی صورت دیتا ہے۔ ہم اپنے خوابوں میں اُن خواہشات کی تسکین کا سامان کرتے ہیں جن کی تکمیل کی ہمیں جاگتے میں جرأت نہیں ہوتی۔ فرائڈ اپنی مشہور کتاب "خوابوں کی ترجمانی" میں کہتا ہے کہ وہ عمل جس سے خواب کا خفی پہلو جلی صورت میں سامنے آتا ہے "خواب کا عمل" کہلاتا ہے۔ اس عمل سے پہلے تلخیص کا عمل ہوتا ہے یعنی جلی خواب کا موضوع اتنا تفصیلی نہیں ہوتا جتنا کہ خفی پہلو ہوتا ہے۔ تلخیص کا عمل یوں ہوتا ہے۔

(۱) بعض خفی عناصر حذف کر دیئے جاتے ہیں (۲) خفی پہلو کی بہت سی اُلجھنوں کا صرف ایک

جزوی حصہ جلی خواب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ (۲)____ خفی عناصر جو آپس میں ملتے جلتے ہیں جلی خواب میں اکائی بن جاتے ہیں۔ اِس تلخیص کے باعث بعض متضاد خفی خیالات ایک ہی جلی خواب کی صورت میں متحد ہو جاتے ہیں اور ہم خواب کی ترجمانی کے قابل ہو جاتے ہیں۔

خواب کا دوسرا عمل اُکھاڑ پچھاڑ کا ہے۔ یہ کام خواب کے محتسب کا ہے جس سے خواب کا مرکز بدل جاتا ہے اور وہ نامانوس شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خواب کا تیسرا عمل یہ ہے کہ اِس کی بدولت خیالات و افکار محسوس و مرئی پیکروں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ خواب میں ثانوی ترتیب بھی ہوتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ موضوع کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے تاکہ اُس کا سمجھنا مشکل ہو جائے۔ اِسی عمل سے خواب میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ انا (ایغو) کی گرفت میں آجانے سے خواب میں وہ منطقی عنصر پیدا ہو جاتا ہے جو کہ اصل خواب میں نہیں پایا جاتا۔ مختصراً فرائڈ کے خواب کے نظریے کے تین اصول ہیں۔

(۱)____ خواب کا عمل اِس لئے ہوتا ہے کہ نیند کا تحفظ کیا جائے۔ یہ عمل نہ ہوتا تو اِنسان کے لئے سونا مشکل ہو جاتا۔ خواب کا یہ عمل اصل خواہشات اور واردات پر علامتوں کا پردہ ڈال دیتا ہے جس سے نیند میں خلل نہیں پڑتا۔

(۲)____ خواب میں خفی پہلو ہوتا ہے جو جلی پہلو سے زیادہ سیر حاصل اور مختلف ہوتا ہے۔

(۳)____ خواب میں ناآسودہ خواہشات کی تشفی ہوتی ہے جو بھیس بدل بدل کر خواب میں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ فرائڈ کے خیال میں دبی ہوئی ناآسودہ خواہشات جن کی تسکین خواب کرتا ہے اکثر و بیشتر جنسی نوعیت کی ہوتی ہیں اور خوابوں میں چھڑی، چھاتا، ستون، درخت، سانپ، تلوار، صندوق، جہاز، چولہا، کمرہ، دروازہ، گڑھا، مرتبان، بوتل، چٹان، چشمہ، پھول، کلاک وغیرہ۔ لنگ اور یونی کی علامتیں بن کر نمودار ہوتے ہیں۔

فرائڈ خوابوں میں پیش بینی کا منکر ہے۔ اِس کے خیال میں خواب لازماً ماضی ہی کے واردات سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں، اِن میں مستقبل کی طرف کوئی اِشارہ ممکن نہیں ہے۔ ژنگ خواب میں پیش

بنی کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ خوابوں میں مستقبل کے واردات کے بارے میں بھی اشارے ملتے ہیں۔

خیال

خیال ہندوستان کی اُستادی موسیقی کی ایک صنف ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو یہاں دھورد، پد، چھند اور دوہا گانے کا رواج تھا۔ یہ اصناف گانے میں کلام موزوں داخل کرنے سے شکل پذیر ہوئیں۔ راجہ مان سنگھ گوالیاری کے درباری گویوں بخشو اور مچھو نے دھورد اور پد کو ملا کر گانا شروع کیا جس سے دھرپد کی گائیکی کا آغاز ہوا۔ دھرو کا معنیٰ ہے ٹھہرا ہوا اور پد بہ معنیٰ لفظ یا مرتبہ۔ دھرپد کے مزاج میں ٹھہراؤ اور دبدبہ ہے۔ اس کے چار حصے ہیں استھائی، انترا، سنچاری، ابھوگ۔ خیال کی گائیکی جونپور کے سلطان حسین شرقی نے ۱۵ ویں صدی عیسوی میں ایجاد کی۔ خیال کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا: الاپ، استھائی، انترا، ترانہ۔ الاپ خیال کا ابتدائی لیکن سب سے اہم حصہ ہے جس میں راگ راگنی کا رُوپ سروپ پوری طرح نکھر جاتا ہے۔ دھرپد میں تان کاری کی گنجائش نہیں تھی۔ مسلمان گویّوں نے نئی نئی تانیں وضع کیں جن سے خیال کی دلکشی میں اضافہ ہوا اور اس میں بڑی تاثیر پیدا ہو گئی۔ سلطان حسین شرقی کے بعد دھرپد اور خیال پہلو بہ پہلو نپیتے رہے لیکن ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں دھرپد کی گائیکی ماند پڑ گئی اور آج برصغیر میں خیال ہی کی گائیکی کا رواج ہے۔ محمد شاہ کے درباری گویّوں ادا رنگ اور سدا رنگ نے خیال کو ہر کہیں مقبولیت بخشی۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے پر اکثر گوّیے والیانِ ریاست کے درباروں میں چلے گئے۔ خیال کے فروغ میں گوالیار، آگرہ، جے پور، رام پور، الور اور بڑودہ کے درباروں اور گھرانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گوالیار خاص طور سے خیال کی گائیکی کا گڑھ بن گیا۔ بعد کے اکثر خیالیئے گوالیار کے اُستادوں ہی کے فیض یافتہ تھے۔ حدو خاں اور حسّو خاں اسی گھرانے کے مشہور اُستاد تھے۔ ان کے بیٹوں رحمت خاں اور نثار حسین خاں نے بھی شہرت پائی۔ دہلی کے گھرانے کے بانی تان رس خاں تھے۔ ان کے شاگردوں فتح علیخاں اور علی بخش پٹیالہ کا گھرانا یادگار ہے۔ آگرے کی گائیکی کا بڑا گویّا حاجی سُجان خاں تھا جو تان سین کی اولاد سے تھا۔ اُس کے اسلوب کو گھگّے

خدا بخش نے نکھار بخشا۔ عبد الکریم خاں اور عبد الوحید خاں کیرانہ گائیکی کے مشہور ترجمان تھے۔ عبد الکریم خاں کی بیٹی ہیرا بائی بڑودکر اور شاگرد روشن آرا بیگم نے ناموری حاصل کی۔ محمد علی خاں کوٹھیوال جے پور کے من رنگ گھرانے کے اُستاد تھے۔ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدیوں میں اُستادی موسیقی بن چکی تھی یعنی ان سالوں میں بڑے بڑے خیالیئے، تنت کار اور پکھاوجی سب مسلمان تھے۔ وِشنو دگمبر اور بھات کھنڈے نے بھی مسلمان اُستادوں ہی سے فیض پایا تھا۔ مسلمان موسیقاروں نے ہندوستانی موسیقی (شمال مغربی ہند کی موسیقی) کو وہ ہیئت اور اسالیب عطا کئے جو فی زمانہ برّصغیر کی موسیقی میں رائج ہیں۔ خیال کے علاوہ مسلمانوں نے مُلکی موسیقی میں ٹھمری، غزل، ٹپّہ، کافی، ترانہ، قوّالی اور ذکری (اسے قاضی محمود نے گجرات میں رائج کیا تھا) کے اصناف کا اضافہ کیا۔

ختا

رُوسی چین کو ختا کہتے ہیں۔ عربوں نے بھی چین کو یہی نام دیا تھا۔

د

دادا

پہلی جنگ عظیم کے بعد اُبھرنے والی ایک فنّی و ادبی تحریک جو خِرد دشمنی پر مبنی تھی اور لاشعور کے فکری اِنتشار کی ترجمانی کرتی تھی۔ رُومانیہ کے تزارا نے ۱۹۱۶ء میں اِس کی بُنیاد رکھی تھی۔

دادرا

موسیقی کی اِصطلاح میں وہ گیت جو دادرا تال میں گایا جائے۔ اِن گیتوں کے بولوں میں عورت اپنے شوہر سے پیار کا اِظہار کرتی ہے۔ دادرا تال کے چھ ماترے ہیں۔

دِھن دِھن دھا ؛ دھا تی نا

دابڑا

زچّہ کی غذا جو خشک میووں کو کوٹ کر اور گھی میں تَل کر تیار کرتے ہیں۔ اِس غذا سے اُس کی قُوّتِ جسمانی برقرار رہتی ہے۔

داس

آریا فاتحین نے مُلکیوں کو غلام بنالیا اور حقارت سے انہیں دسیو کہنے لگے۔ داس بہ معنیٰ غُلام یا چور اِسی دسیو کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ لونڈی کو داسی کہتے تھے۔

داروغہ

منگولی زبان کا لفظ ہے۔ دروگا قلعے کو کہتے ہیں۔ داروغہ یعنی قلعے کا حاکم۔

دانش مند

جو شخص دوسروں کو جانتا ہے وہ ذہین ہے؛ جو اپنے آپ کو جانتا ہے وہ دانش مند ہے۔

دراوڑ

پنجاب اور سندھ کے قدیم ترین باشندے آسٹریلیائی حبشی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بحیرۂ رُوم کی نسل کے قبائل ۲۹۰۰ ق م کے لگ بھگ درۂ بولان سے وادیٔ سندھ میں وارد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ اور پنجاب میں دریاؤں کے کنارے کھیتیاں اُگانے کا آغاز ہو چکا تھا۔ بحیرۂ رُوم کی نسل کے لوگوں کا اختلاط آسٹریلیائی حبشی نسل سے ہوا جس سے دراوڑی نسل صورت پذیر ہوئی۔ دراوڑوں نے ہڑپائی تمدن کی داغ بیل ڈالی تھی۔ آریا حملہ آوروں سے بچنے کے لئے جنوبی ہند کے علاقوں میں ہجرت کر گئے۔ آج کل اِن کی اولاد مدراس کے نواح میں آباد ہے۔

دخمہ

پارسی اپنے مُردے کو ایک منارے پر رکھ آتے ہیں جسے دخمہ کہتے ہیں۔ کوّے اور چیلیں اِن مُردوں کا گوشت کھا جاتے ہیں۔

دُختر کُشی

مُسلمان ہونے سے پہلے راجپوتوں، گکھڑوں، اہیروں، جاٹوں اور گوجروں میں کہیں کہیں دُختر کُشی کا رواج تھا۔ ۱۸۴۲ء میں مین پُوری کے چوہانوں میں شاذ و نادر ہی کوئی بچّی دکھائی دیتی تھی۔ (ہندوستان کا شمال مغربی صوبہ۔ ڈبلیو کروک)

دَرویش

یہ ترکیب در اور آویز سے مُرکّب ہے یعنی بھیک مانگنے کے لئے دروازے پر دھرنا مارنے والا۔

دقیانوس

قدیم زمانے کا ایک بادشاہ جس کے بارے میں روایت ہے کہ اُس کے خوف سے اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی تھی۔

دُلدُل

جنابِ رسالت مآبؐ کے سفید خچرؔ کا نام تھا۔

دلیل

دلیل کا لغوی معنیٰ ہے رہنما۔ دلیلہ یا دلالہ قحبہ کو کہتے ہیں جو جوان لڑکیوں کو بہکاتی ہے۔

دلفی

دلفی یونان قدیم میں اپالو دیوتا کا معبد تھا جہاں لوگ غیب کا حال معلوم کرنے کے لئے آتے تھے۔ موسیقی اور خوشبویات کے زیرِ اثر کاہنہ پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی تو وہ مُقفّیٰ جملوں میں پیش گوئی کرتی تھی۔

دمیتر

قدیم یونانی دیو مالا کی اناج کی دیوی تھی جس کی بیٹی کو زمین دوز عالم کا دیوتا اِغوا کر کے لے گیا اور وہ اُس کی تلاش میں وہاں جا پہنچی۔ اس کے معبد میں پُراسرار رسوم ادا کی جاتی تھیں جن کی ادائیگی کے دوران میں پجاریوں کو گندم کی بالی دکھاتے تھے اور بشارت دیتے تھے کہ جس طرح گندم کا دانہ مٹی میں مِل کر اکھوے کی صورت میں پھوٹ نکلتا ہے اسی طرح تم بھی مر کر زندہ ہو جاؤ گے۔

دیودار

ایرانی کہتے تھے کہ اِس درخت پر دیو بسیرا کرتے ہیں اس لئے اِس کا نام دیودار پڑ گیا۔ عرب اسے شجرۃ الجنّ کہتے ہیں۔

دیوداسی

لغوی معنیٰ ہے دیوتا کی لونڈی۔ زرعی انقلاب کے بعد بار آوری کا مت رواج پا گیا۔ اس زمانے میں ہل چلانے اور جنسی عمل کو یکساں ثمر آور سمجھا جاتا تھا چنانچہ زمین کی زرخیزی کو تقویت دینے کے لئے دھرتی دیویوں عشتار، اناہیتا، افرودائتی وغیرہ کے معبدوں سے سیکڑوں نوجوان لڑکیاں وقف کی جاتی تھیں جو دیوی کے نام پر خرچی لے کر یاتریوں کے پاس خلوت میں جاتی تھیں۔ یہ رقم پروہت وصول کرتے تھے۔ ہندوستان کے معبدوں میں سیکڑوں دیوداسیاں رہتی تھیں جن کو ناچ گانے کی تربیت دینے کے لئے پنڈت مامور تھے۔ یہ دیوداسیاں صبح، دوپہر اور شام گا بجا کر اور رقص

کر کے دیوتا یا دیوی کا جی بہلاتی تھیں۔ اُمراء اپنی بیٹیاں بطور چڑھاوے کے اِن معبدوں میں لاتے تھے۔ راجے مہاراجے اِن کی کمائی پولیس اور فوج پر خرچ کرتے تھے۔ کئی دیوداسیاں بلوغت کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی درندہ صفت برہمنوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی تھیں اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی تھیں۔ آج بھی جنوبی ہندوستان کے بعض مندروں میں دیوداسیاں رہتی ہیں۔

دولت

دولت کا لغوی معنیٰ ہے احوال کا بدلتے رہنا۔ اِصطلاح میں سلطنت یا زر و مال کو کہتے ہیں کیونکہ وہ کبھی کسی کے پاس ہوتے ہیں کبھی کسی کے پاس۔

دوزخ

دوزخ کا تصور تمام مذاہب میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے جس میں گُناہ گاروں کو اُن کی بد اعمالیوں کی سزا دی جائے گی۔ اِیرانیوں کا دوزخ، مصریوں کا امنتی، بابل کا شیول، یُونان کا ہیڈلیس، ہند کا نرک، یہودیوں کا جہنّہ، عربوں کا جہنّم نہایت خوفناک جگہ ہے۔ مسلمانوں کی روایات میں دوزخ کے سات طبقات کا ذکر آیا ہے۔ سب سے نچلا ہاویہ ہے جس میں منافقوں کو عذاب دیا جائے گا۔ دوزخ کے عذابوں کی تفصیل بڑی ہولناک ہے: آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دینا، خُون کے سمندر میں غوطے دینا، کھانے کے لئے تھوہر اور پینے کے لئے پیپ دینا، آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کرنا، سانپوں اور بچھوؤں سے بھرے ہوئے گڑھے میں پھینک دینا، آگ میں تپائے ہوئے گُرزوں سے مارنا، آگ میں تپائی ہوئی کنگھیوں سے گوشت کو ہڈیوں سے جُدا کرنا وغیرہ۔

دَھرنا

ہندوستان میں ایک رسم پُرانے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ جب کوئی مقروض قرض ادا نہ کر سکے تو قرض خواہ نادہند کے دروازے پر دَھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہے اور جب تک قرض وصول نہ کرے وہیں ڈیرا جمائے بیٹھا رہتا ہے۔

دَھرو: قُطب تارے کو ہندو دَھرو کہتے ہیں۔ بیاہ کی رات کو دُلہا اور دُلہن کو دَھرو کے

درشن کرائے جاتے ہیں۔ دیومالا میں لکھا ہے کہ ایک راجکمار کی عقیدت سے خوش ہو کر دیوتاؤں نے اُسے قُطب ستارہ بنا دیا تھا۔

دھیان

(۱)۔ مُراقبے کو یوگا کی زبان میں دھیان کہتے ہیں۔

(۲)۔ دھی دھیان: اپنے میکے میں گاؤں کی سب لڑکیاں دھی دھیان کہلاتی ہیں۔ دوسرے گاؤں میں بیاہی ہوئی لڑکی اپنے میکے کے گاؤں والوں کی دھی دھیان ہوتی ہے۔ لوگ جھگڑے چکانے کے لئے دھی دھیان کو دشمن کے گھر لے جاتے ہیں جو اُسے ٹھکرا نہیں سکتا اور صُلح کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دہلیز

شاہی فرودگاہ کے باہر کے خیمے کو دہلیز کہتے تھے۔

دَھنک

دَھنک کو عربی میں قوسُ قزَح یعنی گرج چمک کے دیوتا قزَح کی کمان کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اِسے سوارگی کہا جاتا ہے۔ رُومی اِسے آئرس دیوی کا نام دیتے تھے۔ پنجابی میں اِسے سخی سرور کی زوجہ "بی بی بائی کی پینگ" کہتے ہیں۔

دَھمال

شاہ بدیع الدین مدار کے ملنگ جوشِ مستی میں آ کر ناچتے ہیں اور دم دم مدار کا نعرہ لگاتے ہیں۔ بعض اوقات بیخودی کے عالم میں دہکتے ہوئے انگاروں پر بھی ناچتے ہیں۔ اِسے دَھمال کودنا بھی کہتے ہیں۔ لال شہباز قلندر کے ملنگ اور جلالی فقیر ٹخنوں اور گھٹنوں سے گھنگرو باندھ کر اُن کی تال پر ناچتے ہیں۔ اِسے دَھمال کھیلنا کہتے ہیں۔

دہریّہ

دہر کا معنی ہے زمانہ۔ عرب اِسے تقدیر کے مفہوم میں بھی استعمال کرتے تھے۔ عرب دہریّہ خُدا کی ہستی، حشر نشر اور حیات بعد موت کے مُنکر تھے۔ کہتے تھے کائنات ازل سے موجود ہے اور ابد

تک رہے گی نہ اِسے کسی نے پیدا کیا ہے اور نہ اِسے کوئی فنا کرے گا۔ اشیاء پیدا نہیں ہوتیں بلکہ بالقوۃ سے بالفعل ہوتی ہیں۔ طبیعت (نیچر) زندہ کرتی ہے اور زمانہ یا دہر فنا کر دیتا ہے۔

دیوالیہ

ہندوؤں میں کوئی بیوپاری کنگال ہو جاتا اور اپنے قرض ادا نہ کر سکتا تو وہ اپنی دکان کے آگے ایک دن صبح سویرے دو دیوے جلا کر رکھ دیتا جس سے لوگ جان جاتے کہ یہ شخص کنگال ہو چکا ہے۔ لفظ دیوالیہ دیوے ہی سے نکلا ہے۔

دیوالی

ہندوؤں کا مشہور تہوار ہے۔ اُن کے خیال میں اِس رات کو اُن کے مَرے ہوئے عزیزوں کی روحیں اپنے پرانے مسکن میں آتی ہیں اِس لئے وہ اُن کی ضیافت کے لئے اچھے اچھے کھانے پکاتے اور خوشی سے چراغاں کرتے ہیں۔ عام طور سے رات بھر جوا کھیلتے ہیں۔ مٹھائی بھینٹ کر کے لکشمی (دولت کی دیوی) اور کوبیر (دولت کے دیوتا) کی پوجا کرتے ہیں اور ساری رات جاگ کر گذارتے ہیں۔

دیومالا

اُن قصے کہانیوں کا علم ہے جو دیوتاؤں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ دیومالا کے وسیلے سے انسان نے قدیم زمانے میں کائنات کے ساتھ جذباتی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اِس کی اِبتداء سے بحث کرتے ہوئے ای۔ بی۔ ٹائلر کہتا ہے کہ غاروں کے زمانے کا اِنسان ذہنی و فکری لحاظ سے طفلی دور میں تھا۔ جس طرح بچے اپنے کھلونوں کو اپنے آپ پر قیاس کر کے اُنہیں زندہ سمجھتے ہیں اور اُن سے باتیں کرتے ہیں، اُن سے اپنے جذبات منسوب کرتے ہیں اِسی طرح قدیم اِنسان نے فطری مظاہر کو اپنی ہی طرح کا ذی رُوح اور ذی شعور قرار دیا اور خیال کرنے لگا کہ سورج، چاند، پہاڑ، دریا، درخت، اُسی کی طرح رُوح اور شخصیت کے مالک ہیں، اُسی کی طرح سوچتے ہیں اور اُسی کی طرح محسوس کرتے ہیں چنانچہ اُنہیں دیوتا بنا کر اُن سے قصے کہانیاں منسوب کرنے لگا۔ رابرٹسن سمتھ، اینڈریو لینگ اور جے، جی فریزر نے مختلف پیرایوں میں اِس نظریئے کی توثیق کی ہے۔ اینڈریو لینگ کہتا ہے کہ اقوامِ عالم

میں ایک ہی طرح کی دیو مالائی کہانیاں پائی جاتی ہیں کیوں کہ ہر کہیں انسان کا احساس اور سوچ کا انداز ایک ہی جیسا رہا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مُلکوں کی دیو مالا کی بُنیاد لوک بت کہاوتیں پر رکھی گئی ہے جو مختلف اقوام کے تاجر اور سیاح دُور دُور تک پھیلاتے رہے ہیں۔ ہر دیو مالا میں علاقائی مذاہب، رسوم و اطوار، طرزِ فکر اور دانش و خرد کا ذخیرہ بھی ملتا ہے جب کسی مُلک میں دوسری اقوام کی کہانیاں دستیاب ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں تہذیبی میل جول کا رشتہ قائم تھا۔ علمائے نفسیات ژُنگ اور رینک نے دیو مالائی قصوں کو بنی نوعِ انسان کے اجتماعی خواب کہا ہے۔ دیوتاؤں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) دوست اور مددگار (۲) مخالف اور موذی۔ آسمان، سورج، چاند، ابر، دھرتی، چشموں، جھیلوں، درختوں، دریاؤں کی پوجا ذوق و شوق سے کی جاتی تھی کیوں کہ وہ مہربان تھے۔ طوفان، گرج، چمک، موت اور امراض کے دیوتا خطرناک تھے اس لئے ان کی تالیفِ قلب کے لئے انہیں پوجتے تھے۔ دیوتاؤں کی استرضا اور استمداد کیلئے ان کے معبدوں میں قربانیاں دینے کا رواج ہوا۔ انسان جو اشیاء اپنے لئے پسند کرتا تھا انہیں دیوتاؤں کی بھینٹ کرتا تھا۔ وہ دھرتی دیوی کو ماں سمجھتا تھا کیوں کہ اُس کی کوکھ سے فصلیں اُگتی تھیں مصر قدیم میں آمن رع خداوند خدا تھا۔ اوزیرِس، آئسس اور ہورس کی تثلیث موجود تھی۔ انو اور ان لِل سمیریا کے بڑے دیوتا تھے۔ بابل کا بڑا دیوتا بعل تھا جس کا جسم بیل کا، بازو پر دار اور چہرہ انسان کا تھا۔ شمس سورج دیوتا تھا، عشتار دھرتی دیوی تھی جو بعد میں حُسن و عشق کی دیوی بن گئی۔ اس کے معبد میں ہر عورت کو اپنی زندگی میں ایک بار خرچی لے کر کسی نہ کسی اجنبی سے اختلاط کرنا پڑتا تھا۔ فنیقیہ کا بڑا دیوتا مولک نہایت خونخوار تھا۔ اُس کے مندر میں انسان ذبح کئے جاتے تھے جن کے خون سے اُس کی قربان گاہ ہمیشہ تر رہتی تھی۔ بعض اوقات اُس کے سامنے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پہلوٹھی کے بچوں کو پھینکا جاتا تھا۔ یونانی دیو مالا میں بارہ دیویاں دیوتا تھے جن کا خداوند خدا زیوس تھا جسے رومی جیوپیٹر کہتے تھے۔ سمندروں پہ پوزیڈون کی حکمرانی تھی۔ سورج کا دیوتا اپالو صداقت اور نور کا مظہر تھا۔ افرودائتی حسن و عشق کی دیوی تھی۔ اُس کا بیٹا کیوپڈ عشق کا دیوتا تھا جس کے

تیروں کا نشانہ اکثر اسی کی اپنی ماں بنتی تھی۔ ایران میں متھرا (ہندوؤں کا مترا بہ معنیٰ دوست) سورج دیوتا تھا اور اناہیتا (ناہید) حسن و عشق کی دیوی تھی۔ ہندی آریاؤں کے بڑے دیوتا اندر اور اگنی تھے۔ بدھ مت کے زوال اور ہندو مت کے احیا کے ساتھ ہندو برہما، شیو، وشنو اور اس کے اوتاروں رام اور کرشن کی پوجا کرنے لگے۔ شیو کی زوجہ کالی کی پوجا شکتی کے نام پر کی جاتی تھی۔ ہندی دیوتاؤں کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی دیوتا جتنا بدصورت ہوتا ہے اتنی ہی ذوق عقیدت سے اس کی پوجا کرتے ہیں میکسیکو کا بڑا دیوتا ہوئی تو پوکتلی سورج دیوتا تھا جس کے معبد میں ہر روز انسانی قربانی دی جاتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس لہو سے سورج کی شعاعوں میں چمک دمک باقی رہتی ہے کیوں کہ لہو حیات کی علامت ہے۔ ناروے سویڈن کی دیو مالا میں سب سے بڑا دیوتا اوڈن تھا جس نے پالے، لگر اور جاڑے کے دیوتاؤں کو قتل کر کے انسان کو موت سے بچایا تھا۔ بالڈر روشنی کا دیوتا تھا جس سے تاریکی کے دیو خائف رہتے تھے۔ تھور دیوتا اپنے ہتھوڑے کی ضربوں سے دیوتاؤں کو بھگا دیتا تھا۔ ہمڈیل دھنک کے پل کا محافظ تھا جس پر سے دیوتا گذرا کرتے تھے۔

تقابلی دیو مالا کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش، تکوین، عالمگیر سیلاب، دوزخ جنت، شجر حیات، زمین دوز مملکت وغیرہ کی روایات تمام اقوام میں کم و بیش ایک ہی شکل و صورت میں موجود رہی ہیں۔ مثلاً عبرانیوں کا نوح، ہندوستان کا مہانوود اور یونانیوں کا دیوکلین ہے جس نے اپنی کشتی میں جانداروں کو سیلاب سے بچایا تھا۔ دیو مالا کے اثرات مذاہب عالم پر گہرے اور دور رس ہوئے بقول کارل مارکس دیو مالا کی صورت میں انسان نے اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے فطرت کی قوتوں پر قابو پانے کی کوشش کی تھی، جونہی انسان نے سائنس کے طریقے سے فطرتی قوتوں پر قابو پا لیا دیو مالا بھی غائب ہو گئی۔ اقوام عالم کی شاعری اور ادبیات کو بھی دیو مالائی کہانیوں نے متاثر کیا ہے۔ یہ قصے تلمیحات کی صورت میں ادبیات عالم میں اس طرح نفوذ کر گئے ہیں کہ آج بھی شاعر اور قصہ نویس ان کے حوالے سے اپنے خیالات و احساسات کا اظہار کر رہے ہیں۔

دین : قدیم پہلوی زبان کا لفظ ہے جو عربی میں رواج پا گیا۔ پہلوی میں اس کا مطلب

ہے بصلہ، بدلہ، ضمیر۔

دیوث

بھڑوا جو اپنی بیوی سے پیشہ کراتا ہے۔

دوشیزہ

دوشیزہ کا لفظی معنیٰ ہے " دودھ دوہنے والی " ایران قدیم میں یہ کام جوان لڑکیوں کے سپرد تھا اس لئے کنواری کو دوشیزہ کہتے تھے۔ سنسکرت میں دوہتری کا یہی معنیٰ ہے۔

دلائی

لغوی معنیٰ ہے سمندر، ہمہ گیر، آفاقی۔ دلائی خاقان اور دلائی لاما کی تراکیب اسی مفہوم میں ہیں۔

دوسہ

مصر میں سعدیہ فرقے کے درویش اپنے شیخ کے استقبال کو نکلتے ہیں تو جس راستے پر اس نے گزرنا ہو اس پر اوندھے منہ لیٹ جاتے ہیں۔ شیخ گھوڑے پر سوار آتا ہے اور ان پر سے گزر جاتا ہے۔ اس تقریب کو دوسہ کہتے ہیں۔

دودھ کی دھاریں

پنجاب کے دیہات میں رسم تھی کہ کسی معرکے میں جانے سے پہلے مسلمان گبھرو اپنی ماں سے بتیس دھاریں دودھ کی بخشوایا کرتے تھے۔

ڈ

ڈان یُوآن

ہسپانیہ کا ایک رئیس جو نت نئی عورت کے عشق میں مُبتلا رہتا تھا۔ اِس کے نام سے یہ اصطلاح جنسی نفسیات میں بار پاگئی۔ ڈان یوآن سے مراد وہ ہرجائی ہری چگ ہے جو سدا نئی نویلی محبوبہ یا مثالی عورت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اُسے بار بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ رشتۂ اُمید کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور اپنی ناکام تلاش کو آخری دم تک جاری رکھتا ہے۔ فی الاصل وہ نرگسیت کا مریض ہوتا ہے اور اپنی ذات کے سوا کسی سے پیار نہیں کر سکتا۔ ہر نئی عورت اُس کے لئے کُھلا چیلنج ہوتی ہے اور اُسے یہ چیلنج قبول کرنا پڑتا ہے۔ وہ کوتاہ ہمت ہوتا ہے اور عورتوں کے پیچھے لگے رہنے سے یہ تاثر دلانا چاہتا ہے کہ وہ بڑا جواں مرد ہے۔

ڈاک

عربی میں اِسے برید کہتے ہیں جو فارسی کے لفظ بُریدہ سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے کٹا ہوا کیوں کہ ڈاک لے جانے والے خچروں اور گھوڑوں کی دمُوں کے بال کاٹ دیتے تھے۔ ڈاک کا لفظ پنجابی ہے اور ڈکے" سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے روک۔ ڈاکو بھی اِسی سے مشتق ہے کیوں کہ وہ راہ چلتے مسافروں کو روک کر اُنہیں لوٹ لیتا ہے۔ ڈاک کا وسیع انتظام سب سے پہلے ایران کے بادشاہوں نے کیا تھا اُن کے پروانے یا ڈاک لے جانے والے ہرکارے پیدل اور گھوڑ سوار شاہی فرامین لے کر دُور دراز کے شہروں تک پہنچ جاتے تھے۔ بیس بیس پچیس پچیس میلوں کی مسافت پر اُن کے آرام کرنے اور کھانے پینے کے لئے چوکیاں بنا دی گئی تھیں۔ ڈاک کا لفظ اِسی منزل یا چوکی کو ظاہر کرتا ہے یعنی ایک ہرکارے کے رُک جانے کی جگہ جہاں سے دوسرا ہرکارہ فرامین لے کر آگے بڑھ جاتا تھا۔

مغلوں کے زمانے میں ہر ڈاک چوکی پر دس ہرکارے موجود رہتے تھے جنہیں دھاوے کہتے تھے۔ جس چوکی پر گھوڑے بدلے جاتے تھے اُسے الاغ کہتے تھے۔ انگریز کے زمانے میں چوکی کے لئے ڈاک بنگلہ کا لفظ رائج ہوا البتہ اِس کا مفہوم بدل گیا۔ پیدل ہرکارے کی چوب پر گھنگرو بندھے ہوتے تھے۔ وہ چلتا تو اِن کی آواز سُن کر اگلی چوکی والے چوکنا ہو جاتے تھے۔ رنجیت سنگھ کا ایک ہرکارہ ایک دن میں چالیس کوس طے کر جاتا تھا اِس لئے اُس کا نام "چالی کوہا" (چالیس کوس چلنے والا) رکھ دیا گیا۔

ڈائن

ایک بدرُوح جو قبرستانوں میں ننگ دھڑنگ جاتی ہے۔ ڈائن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لوگوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے سندھ میں اسے جگر خور کہتے ہیں۔ میر شیر علی افسوس نے ٹھٹھے کی ڈائنوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "لڑکوں کے کلیجے منتر کی رُو سے تُرت لے جاتی ہیں اور اُن کی ماؤں کے دِلوں کو داغ دے جاتی ہیں۔ کھانا تو اُن کے حضور کسی کو کھانا لازم نہیں کیوں کہ اُسی وقت اُن کا تیرِ نظر جس پر چلے اُسے مار ہی رکھے۔ سوائے اِس کے کبھو کبھو ایسی حالت اُن پر طاری ہوتی ہے کہ اس وقت جس کو دیکھتی ہیں ہوش میں وہ نہیں رہتا پھر کئی دانے انار کی مانند اُس کے پاس سے اِس کو ہاتھ لگتے ہیں۔ کسی حکمت سے ایک لمحہ اُن کو اپنی پنڈلیوں کے اندر رکھ چھوڑتی ہے تب تلک وہ بیچارہ بیہوش پڑا رہتا ہے۔ ندان آگ پر اُن کو رکھ دیتی ہے جب وَے پھیل کر طباق کی صورت پکڑتے ہیں تب اپنی تمام ہم جنسوں میں حصّے کر کے کھا جاتی ہے وہاں اُس کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ اتفاقاً اگر وہ بدذات پکڑی جائے تو لازم ہے کہ اُس کی پنڈلیوں کو چیر ڈالیں فوراً وَے دانے نکل پڑیں گے۔ چاہیے کہ جس کے جگر کو صدمہ پہنچا ہے اُسے کِھلا دیویں۔ خُدا کی قدرت سے شفا پائے گا اور کلیجا اُس کا بچ جائے گا۔"

ڈرامہ

ڈرامہ کا آغاز یُونانِ قدیم سے ہوا۔ لفظ ڈرامہ کا لغوی معنیٰ ہے عمل یعنی جو کہانی عملاً سٹیج پر دکھائی جائے۔ یونانیوں نے اِس کے دو شُعبے قرار دیئے المیہ اور فرحیہ۔ اِن کا آغاز شراب اور

انگور کے دیوتا ڈیونیسس کی پوجا اور رسوم سے ہوا تھا۔ یونانی المیہ سراسر سنجیدہ ہوتا تھا۔ الزبتھ کے دور کے المیے کی طرح اُس میں تمسخر اور ظرافت کے مناظر نہیں دکھائے جاتے تھے۔ ایکٹر اپنے چہرے پر نقاب پہنتے تھے اور منہ میں دھات کی بنی ہوئی ایک قسم کی سیٹی رکھتے تھے جس سے اُن کی آواز گونج کر دُور دُور تک بیٹھے ہوئے ناظرین تک پہنچتی تھی۔ یونانی موئرا (تقدیر) پر عقیدہ رکھتے تھے۔ تقدیر کے خلاف مردانہ وار جدّوجہد اور موت کا سامنا کرنے کی جراُت اُن کے المیے کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اُن کے مشہور ڈرامہ نویسوں اسکیلس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز کی المیہ تمثیلوں کا موضوع یہ ہے کہ ایک مغرور اور سرکش بادشاہ یا سردار دیوتاؤں اور مقدر سے نبرد آزما ہوتا ہے، اُسے اپنے انجام کی خبر ہے لیکن وہ اُن کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتا اور مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا جان ہار دیتا ہے۔ اِس کی ایک اچھوتی مثال پرومیتھیس کی ہے جو دیوتاؤں کے مسکن سے انسان کے لئے آگ چُرا لایا تھا۔ خداوند خدا زیوس نے اُسے کوہ قاف کی ایک چٹان سے جکڑ دیا جہاں ہر روز ایک گدھ اُس کا سینہ نوچ نوچ کر اُس کا دل و جگر کھایا کرتا تھا لیکن پرومیتھیس نے ہار نہیں مانی اور زیوس کے خلاف نعرے لگاتا رہا۔ ارسطو نے سوفوکلیز کی المیہ تمثیل شاہ ایڈیپس کو اُس کا عظیم ترین ادبی کارنامہ قرار دیا ہے۔ شاہ ایڈیپس تقدیر کے چکر میں پھنس کر بے خبری کے عالم میں اپنے باپ کو قتل کر دیتا ہے اور اپنی ماں سے بیاہ کر لیتا ہے جب اُس پر اپنے خوفناک جرم کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ اپنی آنکھیں نکال کر اِس کا کفارہ دیتا ہے۔ یوری پیڈیز کی تمثیل ٹروجن عورتیں نہایت المناک ہے۔ وہ منظر خاص طور سے موثر ہے جب یونانی ہیکٹر کے معصوم بیٹے اسٹیانکس کو جان سے مار دیتے ہیں اور اُس کی دادی ملکہ ہکوبا بچے کی کچلی ہوئی نعش پر بین کرتی ہے۔ ارسطو نے یونانی المیہ پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اِسے دیکھ کر ناظرین کے خوف اور رحم کے جذبات اُبھر آتے ہیں جس سے اُن کا تصفیۂ نفس ہو جاتا ہے۔ ارسٹوفینیس اپنی مزاحیہ تمثیلوں کے لئے مشہور ہے۔ یونانی زبان میں جنسی جذبے کو کومس (سنسکرت کا کام) کہتے تھے، اوڈ کا معنیٰ ہے گیت، کومیڈی کا معنیٰ ہوا وہ جنسی گیت جو ڈیونیسس کے جلوس میں گائے جاتے تھے۔ اپنی ایک

تمثیل 'بادل' میں اُس نے فلسفی سقراط کا تمسخر اُڑایا ہے لیکن کہیں کہیں وہ پھکڑ بھی بولنے لگتا ہے جو آج کل نازک طبائع کو ناگوار گذرتے ہیں۔

یونانیوں کے بعد ڈرامہ کا دوسرا عظیم دور احیاءالعلوم کی صدیوں میں شروع ہوا۔ انگلستان میں شیکسپیئر اور فرانس میں ریسین، کورنیل اور مولیئر بلند پایہ تمثیل نگار تھے۔ شیکسپیئر کے موضوعات یونانیوں کی طرح آفاقی نہیں ہیں لیکن حسنِ ادا، جوشِ بیاں اور نفسیاتی بصیرت نے اُس کے المیّے کو عظمت بخشی ہے۔ آدم سمتھ نے ریسین کی تمثیل 'فیدرسے' کو دنیا بھر کا عظیم ترین المیّہ کہا ہے۔ مولیئر نہایت بلند پایہ طنز نگار ہے۔ اُس نے انسانی حماقتوں پر چبھتے ہوئے فقرے کسے ہیں، اُمراء کے غرور، تموّل اور پادریوں کی ریاکاری کی نہایت لطیف پیرائے میں تضحیک کی ہے۔ گوئٹے کے 'فاوسٹ' میں یونانی قدماء کے آفاقی نقطۂ نظر کا احیاء ہوا اور یہ روایت اُسی پر ختم ہو گئی۔ احیاءالعلوم کے ڈرامے میں انسانوں کی باہمی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ آج کل انسان کی اپنی ہی ذات کے خلاف کشمکش المیّہ کا موضوع بن گئی ہے۔ اِبسن کی تمثیلوں کو داخلی جبر کے تلخ احساس اور اس کی دُکھ بھری ترجمانی نے پُر تاثیر بنا دیا ہے۔ جی بی شانے اپنی تمثیلوں سے عشق و محبت کے موضوع کو خارج کرنے کا تجربہ کیا جس سے اس کی تمثیلیں بے کیف اور ٹھس ہو کر رہ گئیں۔ ہندوستان کے ناٹک نویسوں نے المیّہ سے اعتنا نہیں کیا اُن کے ناٹک ہمیشہ فرحیّہ ہی ہوتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آواگون اور کرم کی کڑی جبریّت اور اتھاہ یاسیت بھی اُن سے المیّہ نہیں لکھوا سکی۔ بہر صورت کالیداس اور بھوبھوتی کے ناٹک شعریت، تغزّل اور حسنِ ادا کے شگفتہ نمونے ہیں اور شکنتلا، وکرم اروسی اور میگھ دوت سنسکرت ادب کے شاہکار ہیں۔ پنجابی زبان میں بھی مشہور المیّے لکھے گئے۔ ان میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں بلند پایہ ہیں۔

ڈکٹیٹر

ڈکٹیٹر کا لفظ یونانی مادے ڈکیر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے نامزد کرنا۔ یعنی اُسے عوام منتخب نہیں کرتے بلکہ کونسل اُسے نامزد کر دیتی ہے۔

ڈوگر

جمّوں کے علاقے کو ڈوگر اور وہاں کے باشندوں کو ڈوگرا کہتے ہیں ۔

ڈُوم

برِّصغیرِ ہندو پاک کا ایک آدی واسی قبیلہ جو خانہ بدوشی کی زندگی گذارتا ہے ۔ انہیں جرائم پیشہ سمجھا جاتا ہے ۔ پنجاب میں میراسی کو ڈُوم کہتے ہیں ۔

ڈھائی پھٹ

پنجابی کی ترکیب ہے جو سِکھ دھاڑویوں سے یادگار ہے ۔ یہ لوگ دھاڑ یا جتھا بنا کر اچانک کسی گاؤں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور اُسے لوٹ کھسوٹ کر آگے بڑھ جاتے تھے ۔ اِن کا سامنا سرکاری فوج سے ہوتا تو اُس سے جم کر لڑنے کے بجائے ایک آدھ جھڑپ کے بعد بھاگ نکلتے تھے ۔ اِس طرح کی لڑائی کو ڈھائی پھٹ کہتے ہیں ۔

ڈھاڈی

ڈُھڈ بجانے والے کو ڈھاڈی کہتے ہیں ۔ یہ لوگ لڑائی کے موقع پر اپنے اپنے سرپرستوں کے جسِ (فتح) کے گیت ڈُھڈ کے ساتھ گا کر اُن کا حوصلہ بڑھاتے تھے ۔ پنجاب کے گویّے جو ڈُھڈ اور لنگ بجاتے ہیں ڈھاڈی کہلاتے ہیں ۔ ڈھاڈی عورتیں دف اور ڈھول بجا کر شادی اور پیدائش پر مبارک باد کے گیت گاتی ہیں ۔

ڈھولا

(۱) پنجابی کا ایک ولولہ انگیز لوک گیت جس کی بحر لمبی اور بندش آزاد ہوتی ہے ۔ اسے گمبھیر و گرج دار آواز میں گاتے ہیں ۔ اِس میں رزمیّہ اور عشقیہ ہر دو قسم کے موضوعات ہوتے ہیں ۔ بار کے ڈھولوں میں احمد خاں کھرل کی شجاعت کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُس نے انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے دکھائی تھی ۔ نوری ، میاں راجہ اور میر داد کے ڈھولے بڑے مقبول ہیں ۔

(۲) ڈھول ایک راجپوت راجہ تھا جس نے ریاست پھلواہہ کی بُنیاد رکھی تھی ۔ راجہ اجمیر کی بیٹی مارمن سے اُس کا معاشقہ مشہور لوک کہانی ہے ۔ اُس کے نام کی رعایت سے محبوب کو پنجابی میں ڈھول یا ڈھولا کہنے لگے ۔

ذ

ذات پات

آریا فاتحین نے ذات پات کی تفریق ورن (رنگ) کی بنا پر کی تھی تاکہ وہ مُلکیوں پر اپنی برتری قائم رکھ سکیں۔ ذات عربی زبان کا لفظ ہے سنسکرت میں جاتی کا لفظ آیا ہے۔ ویدک دَور ۸ ویں صدی قبل از مسیح پر ختم ہوا تھا۔ تیسرے یجروید تک ذات پات کی تفریق موروثی صورت میں مُستحکم ہو چکی تھی۔ منوسمرتی میں برہمن کو دیوتا کا درجہ دیا گیا۔ یگیہ، ہوم، شرادھ وغیرہ کی رسوم عبادت برہمن ادا کرتے تھے اور راجہ کی تخت نشینی کی تقریب بھی اُنہی کے ہاتھوں انجام پاتی تھی اِس لئے راجے ہمیشہ اُنہیں خوش رکھنے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ ہندو سماج میں شُودروں کی حالت غُلاموں سے بھی بدتر رہی ہے۔ منوسمرتی میں ہے کہ شُودر برہمن کی برابری میں بیٹھے تو اُس کے چوتڑ کاٹ دیئے جائیں، شُودر کا سایہ برہمن پر پڑے تو اُسے جان سے مار دیا جائے۔ آج بھی جنوبی ہند میں شُودروں کو اُونچی جاتیوں کے کنوؤں سے پانی بھرنے یا مندروں میں پوجا پاٹھ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ شُودر نہ کسی مذہبی تقریب میں شامل ہو سکتا ہے نہ منتروں کی آواز اُس کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے۔ جو شُودر منتر سُن لے اُس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے کا حکم ہے۔ شُودروں کا نام ہری جن رکھ دینے سے کچھ فرق نہیں پڑا۔ آج بھی اُن سے کوڑا اور مَیلا اُٹھانے کا کام لیا جاتا ہے۔ دُنیا بھر میں غلامی کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن شُودروں کی حالت غلاموں سے زبوں تر ہے۔ نو ہندومت کے پرچارک رادھا کرشنن وغیرہ ذات پا[illegible]ریق کے حق میں دلائل دے رہے ہیں۔ شُودروں کو اپنی سیاسی قوّت کا احساس ہو گیا ہے اور وہ اُونچی جاتیوں کے ساتھ مُعاشرتی مساوات حاصل کرنے کے لئے جِدّو جُہد کر رہے ہیں۔

ر

راگ

ہندی کلاسیکی موسیقی میں بھرت مُنی کی رُو سے چھ بڑے راگ ہیں: بھیروں، مالکوس، ہنڈول، دیپک، سری، میگھ۔ راگنیاں ان کی بیویاں ہیں۔ ان کے آٹھ آٹھ پُتر (بیٹے) اور آٹھ آٹھ بھارجائیں (بہویں) ہیں مثلاً سری راگ کی راگنیاں ہیں اساوری، بسنت وغیرہ، ان کے پُتر ہیں کھٹ، دیسکار، راگیشری وغیرہ۔ اور بھارجائیں ہیں سوہنی وغیرہ۔ ان راگ راگنیوں کے گانے کے موسم اور اوقات مُقرر ہیں۔ سات سُروں والے راگ سمپورن، چھ والے آڈو اور پانچ والے کھاڈو کہلاتے ہیں۔ سپتک یا استھان سات سُروں کے کہتے ہیں جن میں راگ راگنیاں گائی جاتی ہیں۔ یہ تعداد میں تین ہیں۔ مندر سپتک مدھم سُروں کا ہے، مدھ درمیانی سُروں کا اور تار سب سے اونچی سروں کا سپتک ہے۔ اکثر راگ راگنیاں مدھ سپتک میں گائی جاتی ہیں۔ ابوالفضل ایرانی موسیقی کے حوالے سے مقام سے راگ اور شُعبہ سے راگنی مراد لیتا ہے۔

راکھی

ہندو عورتیں ہر ساون کی کسی اتوار کو ایک دوسرے کی کلائی میں کئی رنگوں کا بٹا ہوا دھاگا باندھتی ہیں تاکہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں عام طور سے بہنیں بھائیوں کو راکھی باندھتی ہیں۔ پنجابی میں راکھی کا معنیٰ حفاظت کا ہے سنسکرت کا رکھشا۔

رامائن

رام اور آئن سے مرکب ہے جس کا معنیٰ ہے رام کی سرگذشت۔ روایت ہے کہ رشی نارد نے والمیکی کو بیس ہزار اشعار میں لکھوائی تھی۔ تلسی داس نے ہندی میں لکھی۔

رانی خان: پانی پت کی جنگ میں مرہٹے احمد شاہ ابدالی سے شکست کھا کر بھاگے تو مہادا جی سندھیا

سونے چاندی کے ساز سے آراستہ گھوڑے پر سوار تھا۔ متھرا کے قریب تعاقب کرنے والی ابدالی فوج کے ہاتھوں زخم کھا کر گھوڑے سے گر پڑا تو اُس کے لشکر کے ایک سقے نے جس کا نام رانی خاں تھا اُسے اُٹھا کر اپنے بیل پر سوار کیا اور اُجین لے آیا۔ مہاداجی نے رانی خاں کو اپنا بھائی بنا لیا اور بہت کچھ انعام دیا۔ اُجین میں آج تک رانی خاں کا باغ مشہور ہے۔ پنجاب میں شیخی خورکو رانی خاں یا "رانی خاں دا سالا" کہتے ہیں۔

راول

(۱)۔ پنجاب میں جوگیوں کو راول کہتے ہیں انہیں رتھ بنّھ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اولوں کو برسنے سے روک دیتے ہیں۔ اولوں بھرے بادل کو رتھ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ دیہات میں آنکھوں کے اپریشن کرتے ہیں۔

(۲)۔ راول گکھڑوں کا ایک سردار تھا جس کے نام پر راولپنڈی کا شہر بسایا گیا۔

(۳)۔ پہلے وقتوں میں چتوڑ کے راجہ کو راول کہتے تھے، بعد کو رانا کہنے لگے۔

راوی

سنسکرت میں دریائے راوی کا نام ایراوتی تھا جو دُرگا دیوی کا ایک نام ہے۔

رَتی

ہندوؤں کے عشق کے دیوتا کام دیو کی زوجہ۔ رَتی کا لغوی نام ہے خواہشِ نفسانی۔

رُجائیت

رُجائیت کا مطلب ہے زندگی کا روشن پہلو دیکھنا اور پُر اُمید رہنا۔ بعض لوگ اتنے رجائی ہوتے ہیں کہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان پر "پولی آنا میٹھے لیمو" کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ پولی آنا ایک عورت تھی۔ وہ اِس حد تک خوش مزاج تھی کہ لیمو کو بھی میٹھا کہا کرتی تھی حقیقی رجائیت فلسفیانہ قسم کی ہوتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ موت ایک تلخ حقیقت ہے جسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ یاسیت پسند موت اور فنا کے تصوّر میں زندگی کے روشن پہلوؤں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ گوتم بدھ، شوپنہائر اور ہارٹ مان اِسی قسم کے قنوطی تھے۔ فلسفیانہ رجائیت موت کے شعور سے جنم لیتی ہے۔ اِس پر عقیدہ رکھنے والے موت کی لٹکتی ہوئی تلوار کے سائے میں بھی بجدِ توفیق خوشیاں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور زندگی

کو رائگاں نہیں جانے دیتے۔ سطحی رجائیت طفلانہ ہوتی ہے جیسے کہ فرائڈ نے امریکیوں کی "احمقانہ رجائیت" کا ذکر کیا ہے۔

رجعت پسند

رجعت پسند وہ شخص ہے جو یہ جان کر بھی کہ اُس کے معاشرے کا نظام بدل رہا ہے تبدیلی کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔

رخش

رُستم کے گھوڑے کا نام رخش تھا۔ رخش کا اصل معنیٰ ہے بجلی۔

رزمیّہ

رزمیّہ شاعری کی وہ صنف ہے جس میں جنگ و جدال اور شجاعانہ کارناموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہومر کی ایلیڈ، فردوسی کا شاہنامہ اور مہابھارت اِس کی مشہور مثالیں ہیں۔ اِس کی خصوصیات ہیں جنگ کی وصف نگاری اور سورماؤں کی بہادری کا ولولہ انگیز بیان۔

رَس

(۱) سنسکرت میں رَس کا مطلب ہے وہ لُطف و ذوق یا حظ جو شعر سُننے والے کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ رَس ذوق سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اِس کی لذت یابی کا دائرہ اِنسان کے سارے حواس پر محیط ہے۔

(۲) پنجاب کے دیہات میں گنے کے افشردے کو رَس کہتے ہیں۔ "رَس جانا" محاورہ کا معنیٰ ہے موافقت کرنا۔

رسول اَرواحی

ہمارے دیہات میں مُلّا کو اناج دیتے ہیں جسے رسول ارواحی کہا جاتا ہے۔

رقیب

رقیب کا اصل معنیٰ ہے محافظ۔ ایک ہی محبوبہ کے دو چاہنے والے ہر وقت ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسرے کے رقیب کہلاتے ہیں۔

رعایہ

لفظ رعایہ رعیہ سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے "ریوڑ"۔

رگِ ہاشمی

اسے عرق الہاشمی کہتے تھے۔ یہ رگ بنو ہاشم کی آنکھوں کے درمیان ہوتی تھی جو غصّے کی حالت میں اُبھر آتی تھی۔ جنابِ رسالت مآب، حمزہؓ بن عبد المطلب اور امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب میں یہ رگ نمایاں طور پر موجود تھی۔ غیظِ جنگ میں جناب حمزہؓ اور جنابِ علیؑ کی یہ رگ اُبھر کر پھڑکنے لگتی تھی۔

رَمزیّت

حقائق کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرنے کے بجائے انھیں علامتوں کے روپ میں پیش کرنے کو اصطلاح میں رَمزیّت کہتے ہیں۔ رَمزیّت ابتدا سے شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں نمایاں رہی ہے لیکن ۱۹ویں صدی کے اواخر میں رَمزیّت فرانس میں ایک باقاعدہ تحریک کی صُورت اختیار کر گئی۔ ورلیں، میلارمے اور رِمبو جو ایڈگر ایلن پو کی کتابوں کے ترجموں سے مُتاثّر ہوئے تھے اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ انہیں وکٹر کوزیں کے نعرے "فن برائے فن" سے تقویّت بہم پہنچی۔ اِس نعرے میں جرمن فلسفی کانٹ کے اِس اصول کو ملحوظ رکھا گیا تھا کہ آرٹ کو ہر قسم کے خارجی علائق سے پاک ہونا چاہیے۔ یہ نعرہ سب سے پہلے گاتیے نے اپنے رومان میدموزیل دی ماپاں (۱۸۳۵ء) میں بلند کیا تھا۔ فرانس کے پرناسین شاعر اِس نعرے سے مُتاثّر ہوئے تھے۔ وہ ہیئت پر زور دیتے تھے۔ ورلیں اور میلارمے نے اُن کے خلاف احتجاج کیا اور شاعری میں انفرادی رنگِ مزاج، ابہام اور خوابناکی کو داخل کیا جس سے اُن کا رشتہ خارجی حقائق سے قائم نہ رہ سکا۔ وہ فن کو موسیقی کے قریب تر لانا چاہتے تھے۔ رَمزیّت پسند داخلیّت کے شیدائی تھے اور رُومانیوں کی طرح اپنے ہی نفس کو کھنگالنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ اپنے گرد و پیش سے ذوقی و فکری رشتہ منقطع کر کے اپنے ہی نفسوں میں حُسن کی جستجو کرتے تھے جس کے باعث رَمزیّت کو تحریکِ تنزل کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کے ترجمانوں میں ایڈگر ایلن پو اور بادلیئر سربرآوردہ سمجھے جاتے ہیں۔ بادلیئر کا تنزل پذیر رُجحان جنسی بے راہ روی کی صُورت میں سامنے آیا جیسا کہ

اُس کی نظموں کے مجموعے "بدی کے پھول" سے ظاہر ہے۔ اِسی بنا پر ناقدینِ ادب نے اُسے ابلیس کہا ہے۔ ہمارے ہاں کے پنجابی شعراء شاہ حسین، بُلّھے شاہ، خواجہ غلام فرید وغیرہ نے بھی علامتوں سے کام لیا ہے لیکن انسان دوستی کے باعث اُن کا تخلیقی رشتہ خارجی حقائق سے ہمیشہ قائم رہا ہے، اُن کی شاعری عوام کے دلوں کو گرماتی رہی ہے اور معاشرے کی تعمیر اور مثبت قدروں کی آبیاری کرتی رہی ہے۔

رنگ

بُنیادی رنگ چار ہیں: سُرخ، سبز، نیلا اور زرد۔ دھنک میں سارے رنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔ علمِ نجوم والوں نے رنگوں اور دھاتوں کو سات سیاروں سے وابستہ کر دیا تھا۔ نجومی اِن سے شگون لیا کرتے تھے: سورج، سونا رنگ زرد؛ چاند، چاندی سفید؛ عطارد: پارہ، بھورا؛ زہرہ: تانبہ، سبز؛ مریخ: لوہا، سُرخ؛ مُشتری، قلعی، نیلا؛ زُحل: سیسہ، سیاہ۔ سُرخ جنگ، بغاوت، جوشِ شباب، غیظ و غضب، نفسانی جذبے کے ہیجان کا رنگ ہے۔ یُونان اور روما میں باغیوں کے پھریرے سُرخ رنگ کے ہوتے تھے۔ رنڈیاں قدیم زمانے سے اپنے گھروں میں اور دروازوں پر سُرخ رنگ کے کنوّل یا بلب روشن کرتی رہی ہیں اسی لئے اُن کے بازار کو 'سُرخ روشنی کا علاقہ' کہا جاتا ہے۔ سانڈ کے ساتھ لڑنے والے اُس کے سامنے سُرخ رنگ کی چادر لہراتے ہیں جس سے سانڈ مُشتعل ہو کر حملہ کرتا ہے۔ انگریزی میں اشتعال انگیزی کے لئے محاورہ ہے "سانڈ کو سُرخ دھجّی دکھانا" عورتوں کے گالوں اور ہونٹوں کی لالی جنسی پہلو سے نہایت ترغیب آور ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر دُلہن کو سُرخ رنگ کا جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ مغرب میں عُشاق اپنی محبوبہ کو لالہ اور گلاب کے پھول تحفے میں بھیجتے ہیں۔ لہو زندگی کی علامت تھی جس کی نسبت سے انسان سُرخ رنگ کو زندگی بخش مانتا رہا ہے۔ سُرخ رنگ کو پسند کرنے والے دَمَوی مزاج، حوصلہ مند، بلند ہمت مردانِ کار ہوتے ہیں۔ عیسائیوں کے ایک فرقے کو یکر سے تعلق رکھنے والے عورتیں مرد سُرخ رنگ کا لباس نہیں پہنتے کہ اُن کے خیال میں اِس رنگ کا لباس نفسانی خواہش کو بھڑکا دیتا ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ آسٹریلیا کے وحشی قبائل میں جب کسی عورت پر نفسانی خواہش غلبہ پا لیتی ہے تو وہ اپنے بالوں میں سُرخ پھول سجاتی ہے جو ایک بلیغ اشارہ ہوتا ہے۔ سفید اور سیاہ رنگ ماتمی ہیں۔ چین میں

سفید اور مشرق و مغرب کے اکثر ممالک میں ماتم کے موقع پر سیاہ رنگ کا لباس پہنا جاتا ہے یا اس رنگ کی پٹی بازو پر باندھتے ہیں۔ ایران میں بانجھ عورت کو سیاہ پستان اور کنگال کو سیہ کاسہ کہتے ہیں۔ زرد رنگ سونے کی نسبت سے خوشحالی اور تموّل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چین کے بادشاہوں کا پسندیدہ رنگ زرد ہی تھا۔ اِسے پسند کرنے والے دھیمے مزاج کے بُردبار لوگ ہوتے ہیں۔ ایران میں اِسے موت کی زردی کے حوالے سے نحس جانتے ہیں۔ نیلا رنگ بھی نحس مانا گیا ہے۔ پنجاب کے دیہات میں منحوس کو کہتے ہیں "کالا مُنہ نیلے پَیر"۔ کہتے ہیں کہ اِسے پسند کرنے والے ناقابلِ اعتماد اور مُتلوّن مزاج ہوتے ہیں اور کسی کے ساتھ سچا پیار نہیں کر سکتے۔ فیروزی رنگ سعد ہے، اُسے سلیمانی کہا جاتا ہے اور وہ نظرِ بد سے بچاتا ہے۔ سبز حُسن و عشق کی دیوی زُہرہ کا رنگ ہے۔ اِسے پسند کرنے والے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں اور پیار میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ اِنہیں فن و ادب میں گہری دلچسپی ہوتی ہے۔ ایرانی البتہ اِس رنگ کو نحس جانتے ہیں جیسا کہ سبز قدم کی ترکیب سے ظاہر ہے۔ نجومیوں کا ایک واہمہ یہ ہے کہ اپنے خاص رنگ کا قیمتی پتھر زمرّد، یاقوت، پکھراج، نیلم، ہیرا وغیرہ انگوٹھی یا زیور میں پہننے سے آفات ٹل جاتی ہیں۔ یاقوت سورج کا، موتی چاند کا، مونگا مریخ کا، زمرّد عطارد کا، پکھراج مشتری کا، ہیرا زُہرہ کا اور نیلم زُحل کا خاص پتھر ہے۔ اَب یہ باتیں توہمات میں شمار کی جاتی ہیں۔

رَمّال۔

عربی میں ریت کو رمل کہتے ہیں۔ رمّال وہ شخص ہے جو ریت پر لکیریں کھینچ کر اور نقوش بنا کر فال لیتا ہے اور غیب کا حال بتاتا ہے۔

روزہ

عاشورہ کا روزہ یہودیوں سے ماخوذ ہے جو فرعون کی قید سے رہائی کی تقریب منانے کے لئے روزہ رکھتے تھے۔ صابئین بھی تیس دن کے روزے رکھتے تھے اور مہینے کے خاتمے پر عید مناتے تھے۔ ہندُ چندرائن کے روزے رکھتے ہیں اور چاند کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ ساتھ لُقمے بڑھاتے گھٹاتے جاتے ہیں۔

رواقیت: رواقیت کے مکتب فلسفہ کا بانی زینو قبرص کا رہنے والا کنعانی تھا۔ وہ ایک منقش

طاق (سٹوآ، رواق) کے نیچے بیٹھ کر درس دیتا تھا اِس لئے اُس کے فلسفے کا نام رواقیت پڑ گیا۔ اُس کے متبعین میں مارکس آریلیس، ایپک ٹیٹس اور سینیکا مشہور ہیں۔ رواقیت فی الاصل ایک نظامِ اخلاق ہے۔ رواقی مادیت پسند تھے اور کہتے تھے کہ کوئی غیر مادی شے موجود ہی نہیں ہو سکتی۔ اُن کے خیال میں علم صرف حواسِ خمسہ کے واسطے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اس لئے حقیقت وہی ہے جسے حواسِ خمسہ جان سکیں۔ اِس مادیت پر انہوں نے وحدت الوجود کا پیوند لگایا اور کہا کہ خُدا رُوحِ عالم ہے اور مادی عالم خُدا کا جسم ہے۔ اِس رُوحِ عالم اور رُوحِ اِنسان کو وہ آتشی کہتے تھے۔ جس طرح رُوح جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے اِسی طرح آفاقی آتش یا خُدا کائنات میں طاری و ساری ہے۔

روشانہ

فارسی زبان میں روشانہ یا روشنک اُس دوشیزہ کو کہتے ہیں جس کا چہرہ چمکتا ہوا سُرخ و سفید ہو۔ یونانیوں نے اِسے روکسانہ بنا لیا جو سکندر کی ایرانی بیوی کا نام تھا۔ پھر یہ بگڑ کر رُخسانہ بن گیا۔

رُومانیت

رُومیوں کے دورِ تسلط میں گال (فرانس) میں جو مُلکی زبان لاطینی اور مقامی بولیوں کے میل جول سے بنی اُسے رومانا لنگوا کہتے ہیں۔ اِس زبان میں جو قِصّے لکھے گئے وہ رُومان کہلائے۔ لبعد میں رُومان کا اِطلاق شجاعانہ کارناموں کے بیان پر ہونے لگا۔ اِنگلستان میں رُومان کی ترویج ۱۷ ویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوئی۔ گوئٹے بھی ابتدا میں رُومانیت کی جانب مائل ہو گیا لیکن لبعد میں اِسے مرض قرار دیا۔ رُوسو کو رُومانیت کا باپ کہا جاتا ہے۔ اُس نے قاموسیوں کی عقلیت اور ترقی پسندی کی مخالفت میں " فطرت کی جانب لوٹ جاؤ " کا نعرہ لگایا اور کہا کہ سائنسی تحقیق اور فلسفیانہ تدبّر غیر فطری ہے، تہذیب و تمدّن نے اِنسان کو فطرت سے دُور کر دیا ہے۔ رُومانی شعراء ورڈزورتھ وغیرہ نے فطرت پرستی کو ایک باقاعدہ صُوفیانہ نظریّہ بنا دیا۔ کارلائل اور کولرج جرمنوں کی رُومانیت سے متاثر ہوئے تھے۔ بائرن، شیلی، اور کیٹس نے انگلستان میں رُومانی تحریک کی ترجمانی اپنی شاعری میں کی۔ فرانس میں وکٹر ہیوگو، الگزنڈر ڈوما اور دی مسّے اور امریکہ میں تھورو نے اِسے پھیلایا۔

ادبی لحاظ سے رُومانیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اِس میں پُرجوش جذبات کے بے ساختہ اظہار کو اولیّن اہمیت دی جاتی ہے۔ رُومانی شعرا اور اُدبا اظہارِ نفس کی راہ میں ہیئت کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتے ہیں جب کہ کلاسیکی شعرا ہیئت (فارم) کو اہم سمجھتے ہیں۔ رُومانی قصّہ نویس ایسا ماحول پیش کرتے ہیں جس میں اچنبھگی اور غرابت پائی جائے۔ اُنہوں نے عجیب و غریب مُہمّات، بھوت پریت، شکستہ محلّات، ناکام عشّاق، خانماں برباد رئیس زادوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ رقیق جذباتیت کے باعث رومانی قصّے بچّوں اور ناپختہ ذہن و ذوق کے لوگوں ہی کو محظوظ کر سکتے ہیں فلسفے میں رُومانیت خرد دشمنی کی روایت سے تعلق رکھتی ہے۔ ولیم جیمز، نیٹشے، شوپنہائر، برگساں وغیرہ وجدان اور ارادے کو عقل و خرد پر فوقیت دیتے ہیں اِس لئے اُنہیں رُومانی فلسفی کہا جاتا

روہیلا

لغوی معنیٰ ہے روہ (پہاڑی علاقے) کا رہنے والا۔

رہبانیّت

قدیم زمانے میں زُہّاد پہاڑوں یا صحراؤں میں جاکر بسیرا کرتے تھے تاکہ گوشۂ عافیت میں میں بیٹھ کر زندگی اور کائنات کے مسائل پر غور و فکر کر سکیں۔ رہبانیّت اِسی روایت سے یادگار ہے۔ قسطنطائن کے زمانے میں ایک عیسائی زاہد پکومیوس نے اِس کا آغاز کیا تھا۔ ایک راہب سیمون ۳۷ برس تک ایک منارے پر بیٹھا گرما کی کڑی دھوپ اور جاڑے کی ٹھٹھر برداشت کرتا رہا۔ اُسے کھانے پینے کی چیزیں ٹوکری میں رکھ کر اوپر پہنچائی جاتی تھیں۔ عیسائی راہب بودھ سوامیوں اور مانویوں کی خلوت گزینی سے متاثر ہوئے تھے۔

رویّہ

یہ لفظ رائے سے بنا ہے جس کا معنیٰ ہے دیکھنا یعنی اِنسان کا طرزِ عمل جو دیکھنے میں آئے۔

رئیس

عربی میں جہاز کے کپتان کو کہتے ہیں بعد میں جاگیرداروں کو کہنے لگے۔ یمن میں نائی کو رئیس کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ راس (سر) مونڈتا ہے۔

رہس

برج کے علاقے میں سنسکرت ناٹک کی زوال پذیر صورت رہس کہلاتی تھی۔ اس میں دیو مالا کے قصے ناٹک کی صورت میں سٹیج پر کھیلے جاتے تھے۔ اس میں حصہ لینے والے کو رہس دھاریا کہتے تھے۔ رہس نے ابتدائی دور کے ہندوستانی تھیٹر کو متاثر کیا تھا۔

ز

زال

سندھی زبان میں عورت کو زال کہتے ہیں۔ رستم کے باپ کا نام زال (بوڑھا) لکھا گیا کیونکہ اُس کے سر کے بال پیدائشی سفید تھے۔

زبانیں

زبانوں کی تقسیم عام طور سے دُنیا کی چار بڑی نسلوں کے حوالے سے کی جاتی ہے: سامی، مغلی، حبشی اور آریائی۔ سامی زبانوں میں بابلی، اشوری، فنیقی، ارامی، عبرانی اور عربی شامل ہیں۔ اِن کی الفبا فنیقیوں نے سُمیریوں کے پیکانی اور مصریوں کے ہیروغلیفی حروفِ تہجی سے مرتّب کی تھی۔ یہی الفبا بعد میں آریاؤں میں بھی رواج پا گئی۔ آریائی زبانیں ہیں: یونانی، لاطینی، پہلوی، سنسکرت اور یورپ کی اکثر موجودہ زبانیں۔ سنسکرت کی الفبا فنیقی تاجر لائے تھے، دراوڑی زبانوں کے اثرات سے اِس میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی۔ ایرانیوں کے دورِ تسلط میں گندھارا میں خروشتی رسم الخط نے رواج پایا لیکن آخر الامر براہمی لپی ہی مقبول ہوئی۔ منگولی نسل کی سب سے بڑی زبان چینی ہے جس کے اثرات جاپان، سیام، ویت نام، ملیشیا، انڈونیشیا اور برما کی زبانوں اور بولیوں پر ہوئے۔ امریکہ کے لال ہندیوں کی بولیاں بھی اصلاً منگولی ہی ہیں کیوں کہ وہ مشرقِ ایشیا سے ہجرت کر کے امریکہ گئے تھے۔ حبشی زبان پر مصری ہیروغلیفی کے اثرات ہوئے۔ ہڑپائی عہد کے دراوڑوں کی زبانوں کے ہزاروں الفاظ جنوبی ہند کی زبانوں تامل، تلگو، کناڑی، ملیالم اور پنجابی، سندھی اور براہوی میں باقی ہیں۔

زرعی انقلاب

جب اِنسان نے فصلیں اُگانے کا راز دریافت کر لیا تو خوراک کی تلاش میں مارے مارے پھرنے

کے بجائے اُس نے دریاؤں کے کناروں پر بستیاں بسالیں اور خود خوراک پیدا کرنے لگا یہیں سے زرعی انقلاب کا آغاز ہوا اور انسانی معاشرے، ریاست، منظّم مذہب، تہذیب و تمدّن اور قوانین کی داغ بیل ڈالی گئی۔

ذاتی املاک کا تصوّر بھی زرعی انقلاب کے ساتھ پیدا ہوا۔ طاقت ور طالع آزماؤں نے جتھے بنالیے اور سیرِ حاصل اراضی پر قبضہ کرلیا۔ یہی سردار بعد میں بادشاہ بن بیٹھے اور دوسروں کی املاک بالجبر ہتھیانے کی تخریبی روایت نے جنم لیا۔ املاک کی ہوس نے لالچ، حسد، جارحیّت، ظلم و ستم اور تصرّف و استبداد کو ہوا دی۔ حصولِ املاک کی خاطر باپ نے بیٹے کا، بھائی نے بھائی کا، بیٹے نے ماں باپ کا خون بے دریغ بہایا اور تاریخِ عالم میں جنگ و جدال کے وحشیانہ سلسلے کی بُنیاد پڑی۔ غلامی اور بردہ فروشی نے رواج پایا اور جنگی قیدیوں سے گھروں، کشتیوں اور کھیتوں پر مشقّت لینے لگے، لونڈیوں سے ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا گیا۔ پروہتوں نے بادشاہوں کے ساتھ ملی بھگت کرکے مذہب کے نام پر عوام کو حکّام کی اطاعت کا سبق دیا۔ فی زمانہ سائنس کے فروغ کے ساتھ صنعتی انقلاب کی ہر کہیں اشاعت ہو رہی ہے اور زرعی معاشرے میں تبدیلیاں آرہی ہیں، ذاتی املاک کا اِدارہ متزلزل ہو گیا ہے، انسانی قدریں پنپنے لگی ہیں، محنت کش جبر و استحصال کے اِنسداد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور معاشی عدل و انصاف کی بُنیاد پر نظامِ معاشرہ کو از سرِ نو مرتّب کیا جارہا ہے۔

زَروان

زَروان قدیم پہلوی کا لفظ ہے۔ زمان اور زمانہ اسی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، مجوسی روایات میں اہورامزدا اور اہرمن زروان دیوی کے توأم بیٹے تھے۔ زمان کا تصوّر حرکت اور تبدیلی سے پیدا ہوا۔ کائنات میں کوئی تبدیلی اور حرکت نہ ہو تو زمان بھی نہ ہو، تغیر ہی زمان کی بنیاد ہے۔ تقدّم و تاخّر کے لحاظ سے زمان ذہنِ انسانی کی پیداوار ہے اور موضوعی ہے لیکن تغیر کی حیثیت سے معروضی ہے اور باقی رہے گا خواہ کرۂ ارض سے سب بنی نوعِ انسان مِٹ مِٹا کر فنا ہو جائیں۔ سامی مذاہب اور مجوسیّت میں زمان حقیقی ہے اور اِس کی حرکت مستقیم ہے یعنی خُدا نے کائنات کو ایک خاص لمحے میں پیدا کیا تھا اور وہ اِسے مٹا دینے پر قُدرت بھی رکھتا ہے لیکن اکثر آریائی مسالک مثلاً اِشراق، ویدانت، نو اشراقیت وغیرہ میں

زمان کی گردش دائرے میں ہو رہی ہے یعنی کائنات کی نہ کوئی اِبتدا تھی اور نہ اِنتہا ہو گی۔ زمان کا یہ تصوّر غیر حقیقی ہے۔ سپینوزا اور دوسرے وجودیوں کا یہی نظریہ ہے۔ ہمارے زمانے میں آئن سٹائن نے زمان کو زمان/مکان اکائی کی چوتھی بُعد قرار دیا ہے۔

زفاف

زفاف کا معنیٰ ہے دُلہا کا دلہن کو اپنے گھر لانا۔ اِستحصالی معاشرے میں سلاطین اور جاگیرداروں کو حقِ شبِ زفاف حاصل تھا یعنی نکاح کے بعد سُسرال جانے سے پہلے دُلہن کو ایک رات بادشاہ یا جاگیردار کے ساتھ خلوت میں بسر کرنا پڑتی تھی۔ زمانۂ وسطیٰ کے جاگیردار پادری بھی تجرّد کے عہد کے باوجود دُلہنوں سے اپنا یہ حق وصول کیا کرتے تھے۔

زَمزمہ

زَم کا معنیٰ ہے آہستہ، زَم زَم: آہستہ آہستہ۔ زَمزمہ اِسی سے ہے یعنی وہ کلمات جو عبادت کے وقت مجوسیوں کی زبان پر آتے ہیں۔ موسیقی کی اصطلاح میں دھیمی مترنّم آواز میں گانے کو زَمزمہ کہتے ہیں۔

زندیق

مجوسیوں کا ایک فرقہ جو اوستا کے ساتھ اُس کی تفسیر زند کو بھی الہامی مانتا ہے۔ انہیں مرتد کہتے تھے۔ دولتِ عباسیہ میں مانی کے پیروؤں کو زندیق کہا گیا اور انہیں چُن چُن کر قتل کر دیا گیا۔

زوال پذیری

زوال پذیری کی سب سے نمایاں علامت موضوعیت ہے جب کسی قوم کے افراد اجتماعی معاداات کو پسِ پُشت ڈال کر ذاتی مفاد کے حصول کے لئے اپنی تمام تر کوشش وقف کر دیتے ہیں اور شخصی عیش و عشرت پر جماعت کی فلاح کو قربان کر دیتے ہیں تو وہ قوم زوال پذیر ہو جاتی ہے جس طرح مثلاً سپنگلر کے خیال میں مغربی اقوام زوال پذیر ہو چکی ہیں۔

زُہرہ: حسن و عشق کی دیوی جسے ناہید بھی کہتے ہیں۔ مشہور روشن سیارہ جو ہر روز صبح سویرے مشرق کے اُفق پر دکھائی دیتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق زُہرہ بابل کی ایک حسین رقاصہ تھی جس کی اصلاح پر دو فرشتے ہاروت اور ماروت مامور ہوئے۔ دونوں اس پر فریفتہ ہو گئے اور تمتّع کی خواہش کی۔ انہیں چاہِ بابل میں اُلٹا لٹکا دیا گیا اور زُہرہ کو ستارہ بنا کر آسمان کی زینت بنا دیا گیا۔ زُہرہ کو رقاصۂ فلک اور لولیٔ فلک بھی کہا جاتا ہے۔

ژِگالو

آج کل یورپ اور امریکہ کی ادھیڑ عمر عیش پسند عورتیں اپنی ہوا و ہوس کی تشفّی کے لئے کسی خوبرو، تنومند نوجوان کو تنخواہ پر ملازم رکھ لیتی ہیں جسے جنسی نفسیات کی اصطلاح میں "مردِ کاسب" یا ژِگالو کہا جاتا ہے۔

سادیّت

نپولین بونا پارٹ کے عہدِ حکومت میں شو بلیر دساد ایک غلط کار عیش پسند جاگیر دار پیرس میں رہتا تھا۔ اُس کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ کسبیوں کو کھانے میں زہریلی منشیات کھلا کر اُنہیں خلوت میں لے جاتا اور اُن کے بدن میں نشتر چبھویا کرتا تھا جس سے کئی کسبیاں جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ حکومت نے دساد پر مقدمہ چلا کر اُسے باستیل کے جیل خانے میں بند کر دیا جہاں اُس نے اپنی بدنام زمانہ فحش کتابیں جسٹن، جولیت وغیرہ لکھیں۔ آخر قید ہی میں مر گیا۔ سادیت (سادازم) کی ترکیب اُس کے نام پر وضع کی گئی ہے۔ جنسیاتی نفسیات میں اِس کا مطلب ہے خلوت میں فریقِ ثانی کو جنسی ایذا دے کر جنسی حظ محسوس کرنا۔

سالگ رام

کالے رنگ کا چکنا گول پتھر جسے فارسی میں سنگِ سماق کہتے ہیں، حاجی پور اور نیپال میں ملتا ہے۔ ہندو دیوتا سمجھ کر اسے پوجتے ہیں اور اِسے وشنو دیوتا کا اوتار کہتے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ جو بُت ٹوٹ جائے وہ پُوجنے کے قابل نہیں رہتا سوائے سالگ رام کے۔ اِس کا بیاہ تلسی کے پودے سے بڑی دھوم دھام سے رچاتے ہیں۔

سامراج

سامراج کا مطلب ہے کسی قوم کا اپنی وطنی حدود سے تجاوز کر کے کسی دوسری قوم پر سیاسی یا معاشی تصرف قائم کرنا۔ صنعتی انقلاب کے بعد سوتی کپڑے کی فروخت کے لئے انگریزوں کو افریقہ اور ہندوستان کی منڈیاں درکار تھیں نیز اُن کے کارخانوں کے لئے خام مواد کی ضرورت تھی اِس لئے اِن ممالک پر تاخت کر کے انہیں فتح کر لیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اضلاعِ متحدہ امریکہ ایک بڑی سامراجی طاقت

کی صورت میں اُبھرا جس کے ارب پتی اجارہ دار ساری دُنیا کو اپنی منڈی بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اشتراکی ممالک اِن کے راستے میں حائل نہ ہوتے تو امریکی کب کے اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ اضلاع متحدہ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک اِس بنا پر اشتراکیوں کے دشمن ہیں کہ جہاں کہیں اشتراکی انقلاب برپا ہوتا ہے وہ مُلک سامراجیوں کے استحصال اور سامراج سے آزاد ہو جاتا ہے۔

سانپ

سانپ کا ذکر اکثر اقوام کی دیو مالا میں آیا ہے۔ زرخیزی کے مسالک میں سانپ کو لنگ کی علامت سمجھ کر پوجتے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سانپ خزانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سانپ بقا کی علامت بھی ہے عام عقیدہ ہے کہ سانپ اپنی کینچلی بدل کر نیا جنم لیتا ہے۔ جنوبی ہند میں عورتیں سانپ کو دودھ پلاتی ہیں اور اِسے جان سے مارنا ممنوع ہے۔ ایک واہمہ یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی سانپ کسی عورت پر عاشق ہو جاتا ہے اور سال چھ ماہ کے بعد اُسے ڈسنے آجاتا ہے۔ وہ نہ ڈسے تو عورت پر سخت بے قراری کا عالم رہتا ہے۔ اِسے عشق مار کہتے ہیں۔

ساہ

ساہوکار کو ساہ کہتے ہیں۔ پنجاب میں انہیں شاہ کہا جاتا تھا۔

سائنس

سائنس کے دو پہلو ہیں، نظری اور تجرباتی۔ تجرباتی سائنس کی داغ بیل اُس وقت ڈالی گئی جب اِنسان کے آبا نے دو ٹانگوں پر پہلے پہل چلنا سیکھا تھا اور اُس کے ہاتھ کام کرنے کے لئے آزاد ہو گئے تھے۔ شعور کی بیداری کے ساتھ اُس نے شکار کھیلنے کے لئے پتھروں کے ہتھیار بنائے، ہڈیوں کی سُوئیوں سے کھالیں سی کر اپنے لئے لباس بنایا، پتھروں کو ٹکرا کر یا لکڑیوں کو رگڑ کر آگ جلانے کا راز معلوم کیا، پہیہ اور کشتی ایجاد کئے اور تصویروں کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔ شروع شروع میں وہ فطری مظاہر سے خائف تھا اور اُن کی پُوجا کیا کرتا تھا۔ مرورِ زمانہ سے اُس کا خوف تجسّس میں بدل گیا۔ اور اُسے اِس بات کا شعور ہونے لگا کہ فطری مظاہر چند قوانین کی گرفت میں ہیں۔ قانونِ سبب و مسبّب

کی دریافت کے ساتھ باقاعدہ طور پر سائنسی تجربات کا آغاز ہوا۔ سائنس کے ابتدائی تجربوں پر صدیوں تک جادو اور مذہب کے پردے پڑے رہے۔ بابل کے صابیئین مناروں پر راتوں کو بیٹھ کر سات سیاروں کی گردش کا مشاہدہ کرتے تھے اور اپنے مشاہدات کو قلم بند کرتے رہتے تھے۔ بتدریج انہوں نے چاند گرہن اور سورج گرہن کا راز دریافت کر لیا۔ لیکن اس سے بھی مطلب برآری کا کام لیا۔ جب گرہن قریب آجاتا تو لوگوں سے کہتے کہ دیکھو سورج یا چاند دیوتا کو اندھیرے کے عفریت نگلنے والے ہیں۔ ان کے معبدوں پر بیش قیمت چڑھاوے چڑھاؤ نہیں تو فنا ہو جائیں گے۔ کلوں کی مدد سے بتوں کو حرکت دی جاتی تھی اور انہیں زندہ ثابت کر کے سادہ لوح پجاریوں سے زر و مال بٹورتے تھے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں طالیس ملطی نے سب سے پہلے علمی بنیادوں پر سورج گرہن کی پیش گوئی کی جو درست ثابت ہوئی۔ طالیس نے کہا کہ کائنات کو کسی دیوتا نے نہیں بنایا بلکہ یہ پانی سے بنی ہے۔ ہیرقلیطس نے کہا پانی سے نہیں آگ سے بنی ہے، دیماقریطس نے کہا ایٹموں سے بنی ہے۔ اس تحقیقی نقطۂ نظر نے سائنس کو دیو مالا اور مذہب کے توہمات سے آزاد کر دیا اور وہ ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گئی۔ فیثاغورسیوں نے کوپرنیکس سے صدیوں پہلے کہا کہ زمین گول ہے اور وہ نظام شمسی کا مرکز نہیں ہے۔ ارسطو نے پودوں اور حیوانات کے مشاہدے سے علم الحیوان اور علم نباتات کے ابتدائی اصول وضع کئے۔ ارشمیدس نے ہندسے اور علم الحیل (مکینکس) میں کمال پیدا کیا اور کئی حیرت انگیز کلیں بنائیں۔ چینیوں نے بارود، قطب نما، چھاپہ خانہ، کاغذ اور کرنسی نوٹ ایجاد کئے۔ نشاۃ الثانیہ کی صدیوں میں یونانی علوم کا احیاء ہوا تو تاریکیوں کے بادل چھٹ گئے، گلیلیو، کیپلر اور نیوٹن نے ہیئت اور طبیعات میں انکشافات کئے۔ گلیلیو نے دوربین سے کام لیا۔ گلیلیو نے پادریوں سے کہا آؤ میں تمہیں مشتری کے چاند دکھاؤں لیکن انہوں نے کہا تم جھوٹے ہو ہماری کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ گلیلیو پر زندقہ کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا کیوں کہ وہ کہتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ کوپرنیکس نے یہی بات ثابت کی لیکن اسے اپنی کتاب اپنی زندگی میں چھپوانے کی جرأت نہ ہوئی۔ صنعتی انقلاب کے بعد سائنس کو بیش از بیش فروغ ہوا۔ دخانی انجن نے نقل و حمل کو آسان بنا دیا۔ فولاد کی ڈھلائی اور کپڑا بننے کی کلوں نے صنعت و حرفت کے نئے طریقے رواج

دیئے۔ ڈارون نے یہ کہہ کر کلیسیا کو مشتعل کیا کہ اِنسان کا اِرتقا بتدریج ایک قسم کے اِنسان نُما حیوان سے ہوا ہے۔ اِسی طرح جغرافیہ اور طِب کو بھی عِلمی اصولوں پر مُرتّب کیا گیا۔ ۲۰ ویں صدی میں سائنس کو جو حیرت انگیز ترقّی ہوئی ہے وہ گذشتہ پانچ صدیوں میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ آئن شٹائن، ڈی بوہر، شروڈنگر، پلانک وغیرہ کے اِضافیت اور مقادیرِ عُنصری کے نظریات نے اِنسانی ذہن کے اُفق کو نئی وسعتیں بخشی ہیں۔ ریڈیو، ریڈار، ٹیلی ویژن، ٹیلی پرنٹر، راکٹ اور کمپیوٹر نے تحقیق کی نئی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ جوہری توانائی نے اُسے بے پناہ طاقت عطا کی ہے۔ کامیاب خلائی پروازوں نے اُس کے اِعتمادِ نفس کو تقویت دی ہے۔

سائنس کی ترقّی کے دُور رس نتائج برآمد ہوئے ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ اِنسان کا ذہن قدیم توہمات کے تصرّف سے آزاد ہو گیا ہے۔ اب وہ مسرّت، آسودگی اور نجات کے حصول کے لیئے آسمان کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ اُس نے اِسی کُرہ ارض پر ایک مُنصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے جس میں ہر شخص سائنس کے برکات سے تمتّع کر سکے گا اور جو اِستحصال سے پاک ہوگا۔ صنعتی اِنقلاب اور سائنس کے فروغ سے اِس معاشرے کے قیام کے آثار واضح ہو گئے ہیں اور کارل مارکس کے اِس مقولے کی صداقت روز بروز عیاں ہو رہی ہے کہ "سائنس بنی نوعِ اِنسان کی نجات دہندہ ہے"۔

سائیں

ہمارے ہاں فقیروں کو سائیں کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ سائیں کا معنیٰ ہے مالک، آقا، سائن، مالکہ۔ رچرڈ برٹن کے خیال میں یہ لفظ سنسکرت کے لفظ سوامی کی ایک صورت ہے۔ منگولی زبان میں سائیں کا معنیٰ ہے عالیشان۔

سانکھیہ

ہندوؤں کے فلسفے کا ایک درشن (مکتبِ فکر) جس کا بانی کپلا ہے۔ پُرش (توانائی) اور پرکرتی (مادہ) کی دوئی اِس کا اصل اصول ہے۔ اِس کی رُو سے پُرش مردانہ عُنصر ہے جس نے زنانہ عُنصر یا پرکرتی سے اِختلاط کیا تو کائنات وجود میں آئی۔ کپلا ناستک تھا یعنی خدا کی ہستی کا مُنکر تھا۔ بدھ مت اور ویدانت پر بھی سانکھیہ کے اثرات ہوئے تھے۔

سَبَت

بابلیوں کا شبوتو یا زحل سیارے کا دن جسے وہ آرام کا دِن سمجھتے تھے۔ عہد نامہٗ قدیم میں لکھا ہے کہ خدا نے چھ دن میں کائنات بنائی اور ساتویں دن آرام کیا۔ یہ ساتواں دن یا سنیچر یہودیوں کا سبت کہلاتا ہے۔ عیسائیوں نے اتوار کو اپنا سبت بنالیا اور مسلمانوں نے جمعہ کے دن کو۔

سبھا

سبھا کا اصل معنی ہے 'جوا کھیلنے کی جگہ'۔ اب عام مجلس کے لئے بولا جاتا ہے۔

سَت وار

پنجابی کا لوک گیت جس میں ہفتے کے سات دنوں کے نام پر ہجر و فراق کا مضمون بیان کیا جاتا ہے۔

ستارے

فارسی کا لفظ ستارہ اور انگریزی کا سٹار بابلیوں کی دیوی عِشتار کے نام کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں جو حُسن و عشق کی دیوی تھی اور سبعہ سیارہ میں شامل کر لی گئی۔ جس کہکشاں میں ہمارا کرہٗ ارض ہے اُس میں کم از کم ایک کھرب ستارے ہیں۔ اسی طرح کے پچاس کروڑ کہکشاں دُوربین میں سے دیکھے جا چکے ہیں۔ ہم سے قریب ترین ستارہ پروکسیما سنٹاری ہے جو ہم میں سے کم و بیش چار روشنی کے سالوں کی دُوری پر ہے۔ روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتی ہے۔ اسے منٹوں، گھنٹوں، دِنوں اور بارہ مہینوں میں منتقل کیا جائے تو ایک روشنی کے سال کی مسافت بنتی ہے جو عام گنتی میں ساٹھ ارب میل ہے۔ اِس کے پیشِ نظر یہ سوچ کر انسان کا ذہن لڑکھڑا جاتا ہے کہ بعض ستارے ہم سے لاکھوں روشنی کے سالوں کی دُوری پر واقع ہیں۔ ہماری کہکشاں کا روشن ترین ستارہ سیریس ہے جو ہمارے سُورج سے کہیں زیادہ درخشاں ہے اور ہم سے نَو روشنی کے سالوں کی مسافت پر ہے۔ حال ہی میں ایک ستارہ دریافت کیا گیا ہے جس کی وسعتوں میں ہمارا سارا نظامِ شمسی سما سکتا ہے۔ ستارے ہائڈروجن، کاربن، فولاد، فاسفورس، کیلشیم، آکسیجن وغیرہ عناصر سے مل کر بنے ہیں۔ انسان کا جسم بھی انہی عناصر سے بنا ہے گویا ہمارے جسم خاکی اور ستاروں کی ساخت و ترکیب ایک ہی جیسی ہے جس سے

ایک قسم کی سائنسی وحدت الوجود کا احساس ہوتا ہے۔ ستارے ٹوٹ کر فنا بھی ہوتے رہتے ہیں اور بنتے بھی رہتے ہیں اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ ہمارا سُورج دوسرے عظیم ستاروں کے سامنے محض ایک ننھا مُنا زرد ستارہ ہے۔ اِس جیسے ہزاروں سورج ہیں جن کا اپنا اپنا نظامِ شمسی ہے۔ ریڈیائی دُور بینوں سے کائنات کو کھنگالا جا رہا ہے لیکن ابھی اِس کی وسعتوں کا پوری طرح اِحاطہ نہیں کیا جا سکا۔

سُتھرے

سِکھوں کے ایک گُرو ہر رائے نے چندر لال کو سُتھرا کہا تھا۔ وہ اِسی نام سے مشہور ہو گیا۔ سُتھرا پنجابی زبان کا پہلا طنز گو شاعر ہے۔ سُتھرے دو ڈنڈے بجا کر بانیاں پڑھتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ اِن میں رجال شاہ، جھنگڑ شاہ، مشتاق شاہ، باواہری شاہ، محبوب شاہ اور باوا سنگت مشہور ہوئے۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں اِن کا ایک روپیہ بیاہ اور ایک پیسہ فی دکان مقرر تھا۔ سُتھرے اپنے آپ کو ہندو مسلمانوں میں مشترک خیال کرتے ہیں اور اپنا مسلک صُلحِ کُل بیان کرتے ہیں۔

سَدّ

مرزا صاحباں کے بول جو ڈھڈ کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ صاحباں کی فریاد سُن کر بے اختیار سُننے والوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگتے ہیں۔ اِن میں بے پناہ تاثیر ہوتی ہے۔

سِدّھ

نیک لوگ جو اِندر لوک (بہشت) میں رہتے ہیں۔ یہ اصحابِ کرامت سمجھے جاتے ہیں اور تعداد اِن کی چوراسی ہے۔

سُراپان

سُور: دیوتا اور پان: مشروب یعنی دیوتاؤں کے پینے کی چیز۔ شراب مراد ہے۔

سرادھ

ہندوؤں میں جب کسی کے ماں باپ مرجاتے ہیں تو وہ ہر مہینے اُن کے نام پر پنڈ دان کرتا ہے یعنی چاول، گھی، شہد اور دودھ کا بڑا سا لڈو بنا کر اپنے سامنے رکھتا ہے۔ برہمن منتر کے زور سے

مرے ہوئے کی رُوح کو بلا کر اُن سے یہ بھینٹ قبول کرنے کی درخواست کرتے ہیں اور پھر خُود مزے لے لے کر کھا جاتے ہیں۔ سرادھ کی رسوم پر بھاری رقم خرچ ہوتی ہے اور برہمنوں کی شکم پُری کے خوب سامان کئے جاتے ہیں۔

سَریان

سَریان کا مطلب ہے خُدا کا کائنات میں طاری و ساری ہونا۔ اِسرائیلی مذاہب کی رُو سے خُدا کائنات سے ماوراء ہے الگ تھلگ ہے اور اس نے اپنی قدرت سے کائنات کو خلق کیا تھا۔ ویدانتی، اِشراقی اور صُوفیہ وجودیہ کہتے ہیں کہ خُدا کائنات سے الگ نہیں ہے بلکہ اِسی میں جاری و ساری ہے۔ اِس خُدا کو سنسکرت میں انتریامی کہا جاتا ہے۔

سرائیکی

سرائیکی کا معنیٰ ہے سرو یا بالائی سندھ کی زبان۔ اِسے جٹکی بھی کہتے ہیں۔ سرائیکی مُلتانی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ مُلتانی، اُچکی اور لنڈی پنجابی زبان ہی کی شکلیں ہیں۔ اِس خیال کا اظہار رچرڈ برٹن نے کیا ہے۔

سکالا

سیالکوٹ کا پُرانا نام ہے۔ اِس شہر کو سفید ہنوں کے بادشاہ مہر گل نے اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ راجہ سالبھوان، راجہ رسالو اور پورن بھگت کی داستان کا مرکز تھا۔

سِروش

مجوسیوں کا اِلہام لانے والا فرشتہ۔

سمینہ

بودھ سوامیوں کو سنسکرت میں سرمن کہتے ہیں۔ عرب اُنہیں سمینہ کہنے لگے۔ وہ گوتم بدھ کو سمینہ کا پیغمبر مانتے ہیں۔ اِنہیں محمرّہ (سُرخ پوش) بھی کہا جاتا تھا کیوں کہ یہ نارنجی رنگ کا لباس پہنتے تھے

سمّی

پنجابی دیہات میں عورتوں کا لوک ناچ جو وہ چاندنی راتوں میں تالیاں پیٹ پیٹ کر ناچتی ہیں۔

اس کے ساتھ گانا گایا جاتا ہے۔

سماع

صوفیہ کے بعض سلسلوں مثلاً چشتیہ، قادریہ، مولویہ میں مزامیر کے ساتھ یا ان کے بغیر عارفانہ کلام کا گانا اور سننا مباح ہے۔ اُن کے خیال میں عشقیہ کلام سننے سے طبائع پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو انسان کے ذہن و قلب کو مکروہاتِ دنیا سے بلند تر کر کے اُن کے تزکیہ کا باعث ہوتی ہے۔ صوفیہ کی مجالسِ سماع میں قوال کبھی دستک کے ساتھ اور کبھی سازوں کی گت پر صوفی شعراء کا کلام سناتے ہیں۔ ابتدا میں سماع کو خلافِ شرع سمجھا جاتا تھا۔ غزالی نے اس کے حق میں دلائل دیئے تو علمائے ظاہر نے تعرض کرنا چھوڑ دیا۔

سنکھ

بڑا گھونگا جسے پنڈت دیوتاؤں کو صبح سویرے جگانے کے لئے بجاتے ہیں۔

سنیاس

ہندوؤں کے ہاں زندگی کے چار آشرم (مراحل) ہیں: برہم چریہ یا طالب علم، گرہست جب آدمی بیاہ کر کے دنیا داری کے فرائض ادا کرتا ہے۔ اُس کے بچے جوان ہو کر کاروبار سنبھال لیں تو وہ جورو سمیت جنگل کی راہ لیتا ہے اسے بان پرست کہتے ہیں۔ سنیاس ترکِ دنیا کا آخری مرحلہ ہے۔

سنگیت

آج کل گانے بجانے کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں ناچ اور اداکاری بھی سنگیت میں شامل تھی۔ اس کی اصل صورت سم گیت ہے سم: کامل، ہموار اور گیت: گانا یعنی جو گانا احسن طریقے سے گایا جائے۔

سوانی

شریف عورت۔ اصل میں ساؤآنی تھا یعنی شریف کی بیوی۔

سواستکا

صلیب ہی کی ایک صورت ہے اس کی دو قسمیں ہیں مردانہ یا دایاں 卐 اور زنانہ یا بایاں 卍۔

یہ آریا اقوام کا نشان تھا جو سورج کی علامت تھی، درّاوڑوں سے ماخوذ ہے۔ اسے تبرک کے طور پر گلے میں لٹکاتے تھے۔ جرمن کے نازیوں نے اسے اپنا جماعتی نشان بنا لیا۔ آج بھی بعض ہندو دکاندار اسے سعد مان کر اس کا نشان اپنی دکانوں کے آگے لٹکاتے ہیں۔ اس کی ضد سوواستکا کالی دیوی کی علامت ہے جو نحس اور تباہی لاتی ہے۔

سورج دیوتا

رگ وید میں پانچ سورج دیوتا ہیں (۱)۔ مترا (دوست) (۲)۔ سوریہ (خالق کائنات) (۳)۔ سوتری (تحریک کرنے والا) جسے منتر گایتری میں مخاطب کیا گیا ہے (۴)۔ پوشن (خوشحال کرنے والا) (۵)۔ وشنو جو بعد میں تر مورتی میں شامل ہو گیا۔ رام اور کرشن اسی کے اوتار ہیں۔

سُورہ

عبرانی زبان میں شورہ ہے جس کا معنیٰ ہے سلسلہ۔

سونگھا

جو فقیر زمین کو سونگھ کر چشمے کا پتہ دیتے ہیں انہیں پنجابی میں سونگھا کہتے ہیں۔ بعد میں دانا کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔

سَنگھ

بودھوں کی جماعت۔ پنجابی سَنگھ ساتھ یا سَنگی ساتھی، رفاقت کے مفہوم میں آیا ہے۔

سُہا

بنات النعش کے جھرمٹ کا ایک ننھا منا ستارہ۔

سہروردیہ

شیخ شہاب الدین سہروردی کا سلسلہ۔ خواجہ بہاؤالدین زکریا نے جو ملتان کے قریب کوٹ کروڑ کے رہنے والے تھے بغداد جا کر شیخ شہاب الدین سہروردی سے خرقۂ خلافت لیا اور ہندوستان میں اسے رواج دیا۔ اس سلسلے کے صوفیہ شریعت کی پابندی کو ضروری جانتے ہیں۔

سیاپا

ہندو عورتیں کسی جوانا مرگ کی موت پر اپنے گالوں میں بکّلے بھرتی ہیں، اپنے آپ کو طمانچے مارتی ہیں اور چھاتی کُوٹ کُوٹ کر مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتی ہیں۔ اِسے سیاپا کہتے ہیں۔

سیانا

جو آدمی جھاڑ پھونک سے آسیب کا سایہ اُتارتا ہے، جن نکالتا ہے یا ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑتا ہے پنجابی میں اُسے سیانا کہتے ہیں۔ اُسے اوجھا بھی کہا جاتا ہے۔

سِیتا

سیتا کا لغوی معنیٰ ہے ریگھاری جسے پنجابی میں سیاڑ کہتے ہیں۔ دھرتی دیوی کی بیٹی تھی جو راجہ جنک کے ہل چلاتے پر زمین سے نکلی تھی بعد میں رام سے بیاہی گئی۔ رام نے اُسے گھر سے نکال دیا تو وہ دوبارہ زمین میں سما گئی۔

سیپ

پنجابی دیہات میں کمین (کام کرنے والے) لوہار، ترکھان، موچی، نائی، کمہار، ماچھی، مُصلّی سال بھر زمینداروں کا کام کرتے ہیں۔ فصلوں کی برداشت پر انہیں اناج دیا جاتا ہے۔ اِس رشتے کو سیپ کہتے ہیں۔

سرب

ہندوؤں کا وہ تارک الدنیا سادھو جس کا دُنیا سے کچھ بھی تعلق باقی نہ رہا ہو۔

سُرس

سنسکرت میں رس کا معنیٰ ہے ذائقہ یا وہ کیفیت جو شعر سُننے سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کلام میں بہت رس ہو اُسے سُرس (س سنسکرت میں اچھے کے لئے آتا ہے) کہا جاتا ہے۔ پنجابی میں سُرس کا معنیٰ ہے عُمدہ۔

سیندھا نمک

سِندھ ساگر سے نکالا جانے والا نمک سیندھا کہلاتا ہے۔ یہ نمک کھیوڑہ کی کان سے نکالتے

ہیں۔ نمک نکالنے والوں کو لاشہ کش اور پنجابی میں واڈھے کہتے ہیں۔

سرائے

سرائے کا اصل معنیٰ فارسی میں ، محل ، کا ہے۔

سیٹھ

سنسکرت کا شرشٹھی جس کا معنیٰ ہے بیوپاریوں کی تنظیم کا سربراہ۔ مدراس میں اسے چیٹی کہتے ہیں۔

سپردائی

سارنگیا یا ربابی جو رنڈی کے گانے کے ساتھ سارنگی یا رباب پر سنگت کرتا ہے۔

ساٹن

عرب اسے زیتونی کہتے تھے۔ یہ لفظ چین کے ایک شہر سین ٹنگ کا بدلا ہوا تلفظ ہے جہاں ریشمی کپڑا بُنا جاتا تھا۔

شاگرد پیشہ

شاگرد ترکی زبان کا لفظ ہے۔ ترکی میں حرم میں داخل ہونے والی نئی نویلی کنیز کو شاگرد پیشہ کہتے تھے۔ مغلوں کے زمانے میں بھی ملازموں کو شاگرد پیشہ کہنے لگے۔

شاہدولہ کے چوہے

شاہدولہ نے شاہجہان کے زمانے میں گجرات میں قیام کیا اور ولایت کا درجہ پایا۔ جابجا پل اور عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ۱۷ جلوس عالمگیری میں انتقال کیا۔ بے اولاد ان کے مزار پر منتیں مانتے ہیں کہ اُن کے ہاں اولاد ہوئی تو پہلے بچے کو شاہدولہ کی نذر کریں گے۔ اس قسم کے بچوں کے سر بہت چھوٹے رہ جاتے ہیں اور وہ مخبوط الحواس ہوتے ہیں۔ لوگ انہیں ساتھ لے کر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان بچوں کے سر بچپن میں دبا کر چھوٹے کر دیئے جاتے ہیں۔ بہرحال انہی بچوں کو شاہدولہ کے چوہے کہتے ہیں۔

شاہ رخی

ایک سکہ سات آنے کے برابر جو امیر تیمور کے بیٹے مرزا شاہ رخ کے نام پر شاہ رخی کہلایا۔

شامیانہ

سایہ بان کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

شاہ رحمان

ان کا مزار ضلع شاہ پور میں ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسان گیہوں کی فصل کی کٹائی میں مصروف رہے اور نو دن شاہ رحمان کی خبر نہ لی۔ اس پر شاہ رحمان نے خفا ہو کر کہا کہ آئندہ سال سے فصل کی کٹائی کے موقع پر میں نو دن طوفان باد و باراں تم پر بھیجا کروں گا۔ کسانوں نے ان ایام میں برسنے والے بادل اور

آندھی کا نام ہی شاہ رحمان رکھ دیا ہے۔

شخص

اِس لفظ کا لغوی معنیٰ ہے تاریک جگہ۔ آدمی دھوپ میں کھڑا ہو تو زمین پر اُس کا تاریک سایہ پڑتا ہے اِس لئے اُسے شخص کہتے ہیں۔

شراب

شراب کو سنسکرت میں مدھو، پہلوی میں مذہ، سویڈش میں میڈ اور فارسی میں مے کہتے ہیں۔

شطرنج

سنسکرت کا چتر انگ یعنی چار پہلو : پیادہ، سوار، رتھ (رُخ) اور ہاتھی (فیل) جو ہندی فوج کے شعبے تھے۔ روایت کے مطابق ایک بودھ سوامی ـــــ نے شطرنج ایجاد کی تھی تاکہ راجے مہاراجے کھیل ہی کھیل میں اپنے ذوق نبرد آزمائی کی تسکین کر لیا کریں اور خون خرابے کی نوبت نہ آئے۔ نوشیرواں کا وزیر برزویہ اِسے ایران لے گیا اور وہاں سے ہر کہیں یہ کھیل پھیل گیا۔ شطرنج اور چوپڑ جبر و اختیار کے اصول پر بنائے گئے تھے۔ چوپڑ میں انسان مجبور ہے کیا معلوم کوڑیاں کیسے پڑیں گی لیکن شطرنج میں چال چلنے میں مختار ہے۔ ایرانی شطرنج کے وزیر کو فرزیں یعنی دانا کہتے ہیں۔ اُس کی چال ایک آڑے یا ترچھے خانے تک محدود تھی۔ یورپ والوں نے فرزیں کی جگہ ملکہ کو دی اور وہ شطرنج کا سب سے طاقت ور مہرہ بن گئی۔ شطرنج دُنیا کا دقیق ترین کھیل ہے اور اِس پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مشرق اور مغرب میں شطرنج کھیلنے کا اسلوب مختلف ہے۔ اہل مغرب کھیل کے آغاز میں پیدل کے دو دو خانے چلتے ہیں اور اُن کا قلعہ بھی آسانی سے بن جاتا ہے۔ شطرنج کے بہترین کھلاڑی رُوس میں ہیں جہاں اِسے قومی کھیل کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ کھیل شاہ مات (بادشاہ مرگیا) پر ختم ہوتا ہے جب شکست پڑنے پر بادشاہ چال چلنے سے معذور ہو جاتا ہے۔

شریعت موسوی

جناب موسیٰ کی شریعت دس احکام پر مشتمل ہے جن کی تفصیل عہد نامہ قدیم میں درج ہے اِن میں

قتل، چوری، زنا، جھوٹی گواہی، رہزنی، دوسروں کی املاک کی لوٹ کھسوٹ، بت پرستی، خدا کے نام جھوٹی قسمیں کھانے سے منع کیا گیا ہے اور ماں باپ کی عزت کرنے اور سبت کی تعطیل منانے کی تاکید کی گئی ہے۔

شطّاریہ

شطّار کا معنیٰ ہے تیز طرّار، صوفیہ کا ایک فرقہ ہے جس کے افراد حصولِ معرفت میں تیزی دکھاتے ہیں۔ اسے ابو محمد بن قصّار نے پھیلایا تھا۔ عام طور سے بے قید ہوتے ہیں۔ بعد میں یہ فرقہ قادریہ میں ضم ہو گیا۔

شعر

شاعری کا اوّلین مقصد بقول احمد حسن زیات غنا ہے۔ کبوتر کی آواز سے سجع، اونٹ کی چال سے بحز کا جنم لینا بھی اس امر کی دلیل ہے پھر خود شعر جو عبرانی شیر سے ماخوذ ہے جس کے معنی راگ اور بھجن کے ہیں نیز آج تک شعر پڑھنے کے لیے عربی میں انشاد (گانا) کا لفظ استعمال کرنا اس کی پوری تائید کرتا ہے کہ شعر کا ماخذ واقعتہً غنا اور موسیقی ہے۔

شکنجہ

شاہنیت کے دور میں عذاب کا ایک خوفناک آلہ شکنجہ تھا (تاریخ ادب عربی)۔ اس میں کس کر آدمی کی ہڈیاں چور چور کر دی جاتی تھیں۔ آجکل جلد ساز شکنجہ میں کتاب کو دبا کر سیفے سے اطراف کے ورق کاٹتے ہیں۔

شمن مت

سائبیریا، منگولیا، ترکستان اور لال ہندیوں میں ارواح کے مسلک کو شمن مت کہتے ہیں۔ شمن کو طبیب اور جادوگر بھی سمجھا جاتا تھا۔ آج کل یہ مت ملایا کے دیہات اور افریقی قبائل میں رائج ہے۔ ہمارے یہاں کا عامل یا سیانا اور ایران کا جن گیر شمن ہی کی صورتیں ہیں۔ شمن گا ناچ کر اور خوشبویات کی دھونی جلا کر ارواح کو بلاتے ہیں۔ جب ان پر از خود رفتگی کی کیفیت چھا جاتی ہے تو وہ ارواح کی مدد سے غیب کا حال بتاتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ عالمِ وجد و حال میں ارواح ان کی زبان سے بولتی ہیں۔ ملایا میں حاضرات کی بیٹھک کا رواج ہے۔ روحوں کی حاضرات کر کے ان سے غیب کا حال معلوم کرتے ہیں یا چوری کا سراغ لگاتے ہیں۔ شمن اپنے بدن اور لباس کو خوشبویات میں لبا لیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حالتِ جذب و سکر میں اس

پر ارواح کا نزول ہوتا ہے اور وہ زور زور سے سر ہلانے لگتا ہے۔ شمن بد ارواح کی پکڑ سے مریضوں کو بچاتے ہیں۔

شوشہ

بالوں کی لٹ جو کسی ولی کے مزار پر منت کے بطور لڑکے کے سر پر رکھی جاتی ہے۔ جوان ہونے پر تقریب بپا ہوتی ہے جس میں مساکین کو کھانا کھلاتے ہیں اور یہ لٹ مونڈ دی جاتی ہے۔

شوہ

(۱) — دُلہا کو شوہ کہتے ہیں۔ صُوفیہ اِس سے محبوب ازلی مراد لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اُس کی دُلہن سمجھ کر اُس سے اظہار محبت کرتے ہیں۔

(۲) — جہاں دریا کا پانی بہت گہرا ہو اُسے بھی شوہ کہا جاتا ہے۔

شولوم علیخم

یہودیوں کا سلام جس کا معنیٰ ہے تُم پر سلامتی ہو۔ ہمارے یہاں کا سلامٌ علیکم۔

شہنائی

اصل میں سینائی تھا جس کے بارے میں روایت ہے کہ پھونک کا یہ ساز بوعلی سینا نے ایجاد کیا تھا اس لئے اِس ساز کا نام سینائی پڑ گیا۔

شیربہا

بلوچستان، ایران اور افغانستان میں بیٹی کے بیاہ پر ماں دُلہا سے کچھ رقم وصول کرتی ہے جو دُلہن کو دُودھ پلانے کی قیمت ہوتی ہے۔ بلوچستان میں اسے شیر بیلی کہتے ہیں۔

شیطان

حبشہ زبان کا لفظ ہے جو عبرانی میں لیا گیا۔ اِس کا لغوی معنیٰ ہے سرکش۔ بابل کی قید سے پہلے بنی اسرائیل میں شیطان کا تصوّر موجود نہیں تھا اور وہ خیر و شر دونوں کو اپنے ملّی خداوند یہواہ ہی سے منسوب کرتے تھے۔ شیطان کا تصوّر مجوسیوں کے اہرمن کا مثیل ہے۔ فرق یہ ہے کہ اہرمن بہت طاقت ور ہے

جب کہ شیطان مردود و مقہور ہے۔

شاہ دولہ

شاہ دولہ نوجوانی میں کھما بدھرہ سیالکوٹی کے غلام تھے۔ حضرت میاں سیّد باہ سے ارادت تھی۔ بعد میں گجرات آکر ٹھہرے اور جابجا عمارتیں اور پُل تعمیر کرائے۔ ۱۷ جلوس عالمگیری میں راہیٔ عالم بقا ہوئے۔

شلوار

میکس ملر کے خیال میں شل فارسی بہ معنی ٹانگ۔ وار بہ معنی والا۔

شگون

فال کے مفہوم میں آتا ہے ـــــ سنسکرت کا شگن، پنجابی کا سگن ـــــ عرب اپنے بتوں کے آگے رکھے ہوئے تیروں سے فال لیتے تھے۔ پرندوں کی اُڑان، کالی بلّی اور کوّے سے بھی فال لی جاتی ہے۔ توران میں بکرے کے شانے کی ہڈی سے فال لی جاتی ہے، اسے شانہ بینی کہتے ہیں۔

صابئیت

دنیا کا قدیم ترین مذہب جس کا آغاز عراق سے ہوا تھا۔ یہ ترکیب صبا سے مشتق ہے جس کا معنیٰ عربی زبان میں ستارے کے طلوع ہونے کا ہے۔ صابئین سات سیاروں کو دیوتا مان کر اُن کی پوجا کرتے تھے۔ ان کی مورتیاں بنا کر اپنے معبدوں میں رکھتے تھے اور سورج کو نیرِ اعظم کہتے تھے جو ان سب کا آقا تھا۔ ان کے پروہت منارہ بابل پر بیٹھ کر سیاروں کی گردش کا مشاہدہ کرتے تھے جس سے علم ہیئت کی بُنیاد پڑی۔ ان کے یہاں پانچ نمازیں پڑھنے کا رواج تھا جو سورج کے طلوع، زوال، غروب اور رات کے مختلف اوقات سے وابستہ تھیں جن میں سورج کے دوبارہ طلوع ہونے کی دعائیں مانگتے تھے۔ وہ نمازوں میں رکوع و سجود کرتے تھے اور ان سے پہلے وضو بھی کرتے تھے۔ وہ ایک ماہ کے روزے رکھتے تھے اور کعبے کی طرف رُخ کر کے عبادت کرتے تھے۔ وہ کعبے کا طواف بھی کرتے تھے۔ مُردار، سوّر، خون کو حرام مانتے تھے، محرمات سے نکاح نہیں کرتے تھے اور مُردوں کی نمازِ جنازہ پڑھتے تھے۔ انہیں یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اہلِ کتاب میں شمار کیا جاتا ہے۔

صاحب

دورِ عباسیہ میں وزیر کا ایک لقب تھا، بعد میں تکریم کے لئے بولنے لگے۔ مالبارکے وزیر کو صاحب دیوان کہتے تھے۔

صدقہ

صدقہ اور عشر وہ محصول تھے جو یہودی اپنے مذہبی پیشواؤں کے لئے مددِ معاش کے طور پر عوام سے وصول کرتے تھے۔

صلوٰۃ: صلوٰۃ کا لغوی معنیٰ ہے "باندھ دینا"۔

صلیب

مصر میں صلیب کو جنسی ملاپ کی حیات بخش علامت سمجھ کر اسے مقدس سمجھتے تھے اور گلے میں لٹکاتے تھے۔ شہنشاہ قسطنطائن نے اسے کلیسیائے روم کا نشان بنا دیا۔ رومن کیتھولک اسے قبروں پر گاڑتے ہیں تاکہ اس کی برکت سے مُردے دوبارہ جی اُٹھیں۔ صلیب پر گاڑ کر موت کی سزا دینے کا رواج کارتھیج والوں سے شروع ہوا۔

صنعتی انقلاب

اس انقلاب کا آغاز کلوں کی ایجاد کے باعث انگلستان میں ہوا۔ آرک رائٹ نے ۱۷۷۰ء میں سوت کاتنے کی کل ایجاد کی جو آبی قوت سے چلتی تھی۔ ۱۷۸۲ء میں جیمز واٹ نے دخانی انجن ایجاد کیا۔ ۱۸۲۹ء میں لورپول اور مانچسٹر کے درمیان ریل کی پٹری بچھائی گئی۔ ۱۸۳۸ء میں پہلے دخانی جہاز گریٹ ویسٹرن نے بحر اوقیانوس کو عبور کیا۔ ۱۸۴۲ء میں سموئیل مورس نے تار برقی ایجاد کی۔ ان ایجادات نے صنعت و حرفت اور رسل و رسائل میں آسانیاں پیدا کیں۔ ۱۸۰۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیانی برسوں میں صنعتی انقلاب یورپ اور امریکہ میں پھیلتا ہوا جاپان تک پہنچ گیا اور وسیع پیمانے پر مصنوعات کی ساخت ہونے لگی جن کی کھپت کے لئے منڈیوں اور خام مال کی فراہمی کے لئے نو آبادیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۸۷۵ء کے لگ بھگ یورپی اقوام میں ایشیاء، افریقہ کی منڈیوں کے حصول کے لئے بے پناہ تگ و تاز کا آغاز ہوا۔ مشرقِ وسطیٰ سے لے کر ہندوستان تک اور جزائر شرق الہند سے لے کر چین و جاپان تک کے ممالک پر اہلِ مغرب کا سیاسی اور اقتصادی تسلط قائم ہو گیا اور سامراج کی داغ بیل ڈالی گئی۔

مشرق کی دولت سے صنعت کاروں کے خزانے معمور ہو گئے لیکن محنت کشوں کی حالت بدستور خوار و زبوں رہی۔ صنعتی انقلاب کے بعد جس اقتصادی استبداد کو عوام پر مسلط کیا گیا وہ جاگیرداروں کے استبداد سے بھی بدتر تھا جس سے خود تجارتی طبقے نے طویل کشمکش کے بعد رہائی پائی تھی۔ مزدور صنعت کاروں کے رحم و کرم پر تھے اور ان کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور تھے۔ کارخانہ داروں کا طفیلی خوار طبقہ مزدوروں کی خون پسینے کی کمائی پر عیش کرنے لگا جب کہ اپنی محنت سے سرمایہ پیدا کرنے والے مزدوروں کو بمشکل

نان شبینہ میسر آتا تھا۔ کارل مارکس نے اپنی کتاب سرمایہ میں سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کی طرف توجہ دلائی اور دنیا بھر کے مزدوروں کو متحد ہو کر ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف جدّوجہد کرنے کی دعوت دی جس سے اشتراکیت کو تقویت ہوئی۔ صنعتی انقلاب کی ہمہ گیر اشاعت کے ساتھ زرعی معاشرے کی سیاسی، معاشی، عمرانی اور فنّی قدریں بدلتی جارہی ہیں اور سائنس کے انکشافات کی روشنی میں معاشرۂ انسانی کو معاشی عدل و انصاف کی بنیادوں پر از سر نو متشکل کرنے کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔

صُوبہ

عربی میں اس کا اصل معنیٰ ہے "دانوں یا روپوؤں کا ڈھیر" بعد میں پرگنہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

صُوفہ

عربی زبان کے لفظ "صُفہ" کی بدلی ہوئی صورت ہے جس کا معنیٰ ہے بیٹھنے کی جگہ جو چبوترے کی شکل کی ہو۔

ضمیر

عام عقیدہ یہ ہے کہ ضمیر انسان کے بطون میں کوئی پُر اسرار حاسہ ہے جو ہمیں بُرائی پر ملامت کرتا ہے اور خیر و شر کا معیار ہے۔ تحلیل نفسی کی تحقیقات سے بڑی عمر کے لوگوں میں تو ضمیر کا کھوج مل گیا لیکن بچپن میں اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ اس کی رُو سے ضمیر کی تشکیل بچے کی عمر کے پانچویں سال میں ہوتی ہے اور اس کا تار و پود ماں باپ کے اوامر و نواہی (یہ کرو وہ نہ کرو) سے بنتا ہے۔ خاص طور سے باپ کے احکام بچے کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں اور اس طرح خیر و شر یا حق و باطل کا معیار سامنے آتا ہے۔ بعد میں جب ہم ماں باپ کے احکام کے ماخذ بھول جاتے ہیں تو وہ ضمیر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جسے ہم خیر و شر کا خلقی احساس مان لیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ بُرے اور اچھے میں فرق کرنے والا احساس پیدائشی ہوتا ہے۔ ضمیر کی آواز جو بالغوں کو سُنائی دیتی ہے وہ فی الاصل باپ کی آواز ہوتی ہے جو دورِ طفلی کے ماضی بعید سے آتی ہے۔ فرائڈ نے ضمیر کو "پولیس کا خوف" بھی کہا ہے۔

ط

طب

یونانیوں نے طب مصریوں سے سیکھی تھی۔ ہپوقریطیس (بقراط) کو یونانی طب کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے طب کو جادو کے اثرات سے پاک کر کے اسے علمی بنیادوں پر مرتب کیا۔ اس کے چار اخلاط ــــ دم، بلغم، صفرا، سودا ــــ کا نظریہ آج بھی صحیح مانا گیا ہے۔ ابتدا میں طب کا تعلق جادو بالمثل سے تھا مثلاً کہتے تھے کہ سیب کی شکل دل جیسی ہے اس لئے اسے کھانا مقوّی قلب ہے۔ اخروٹ کی بناوٹ مغزِ سر کے مشابہ ہے اس لئے یہ مقوّی دماغ ہے۔ بادام آنکھ سے ملتا جلتا ہے اس لئے مقوّی بصر ہے۔ پیاز اور لونگ کی شکل آلاتِ تناسل جیسی ہے اس لئے ان کا استعمال مقوّی باہ ہے۔ گیلے نس (جالینوس) نے طب میں تجربات کا آغاز کیا۔ عربوں کی تحقیقات نے خاص طور سے علمِ طب میں گراں قدر اضافے کئے۔ رازی نے جسم اور ذہن کے باہمی عمل و ردِّعمل کی اہمیت واضح کی اور کہا کہ جسمانی امراض نفسِ انسانی کو اور نفس کے عوارض جسمانی صحت پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ عربوں نے جراحی کو بھی ترقی دی اور اس کے لئے مناسب آلات ایجاد کئے۔ آج کل جس شعبۂ علم کو طبِ یونانی کہتے ہیں اس میں عربوں کی دین کو گراں بہا سمجھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں جڑی بوٹیوں اور کشتوں سے علاج کرتے تھے۔ برِّصغیر ہند و پاک میں طبِ یونانی اور آیورویدک کے اصولوں کی روشنی میں طب میں بیش قیمت اضافے کئے گئے جس سے اس کی افادیت دو گونہ ہو گئی۔ چین میں مفردات سے علاج کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چینی سوئیاں چبھو کر اعصابی اور عضلاتی امراض کا کامیاب علاج کرتے رہے ہیں۔ جدید مغربی طب کو باقاعدہ ایک سائنس بنا دیا ہے اور اس کے طریقوں سے وبائی اور چھوت سے لگنے والے امراض پر قابو پا لیا گیا ہے۔ میڈیکل سائنس نے جراحی

میں بھی حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں اور آج کل ماؤف اعضائے رئیسہ کی جگہ مصنوعی اعضاء لگانے کے کامیاب تجربات کئے جا رہے ہیں۔ ہومیوپیتھی کا آغاز جرمنی سے ہوا لیکن یہ جادو کے مماثل ہے اور اسے ایلوپیتھی کی طرح سائنس تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

طبوٗ اور طوطم

یہ اصطلاحات ایک لال ہندی قبیلے اوجیوا سے لی گئی ہیں۔ طبوٗ امتناع اور تقدس ہر دو مفہوم رکھتا ہے۔ حائضہ عورت کا طبوٗ اقوام عالم میں ہر کہیں ملتا ہے، یہودیوں کے ہاں سبت کے روز کاروبار ممنوع تھا۔ تابوت سکینہ کو سوائے پیشواؤں کے کوئی شخص چھو نہیں سکتا تھا۔ طوطم کا معنیٰ ہے "بہن بھائی کا رشتہ" وحشی قبائل اپنا اپنا مخصوص نشان رکھتے ہیں جو کوئی پرندہ یا جانور ہوتا ہے جسے وہ اپنا سرپرست سمجھتے ہیں۔ ایک ہی طوطم رکھنے والے ایک دوسرے کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن آپس میں بیاہ نہیں کرتے۔ مثلاً جس کا طوطم کوا ہو گا وہ کبوتر والے کے قبیلے میں بیاہ کرے گا۔ فرائڈ نے اپنی کتاب "طوطم اور طبوٗ" میں مذہب کے ارتقائی مراحل میں طبوٗ اور طوطم کی اہمیت سے خیال افروز بحث کی ہے۔

طرّہ باز خاں

مغلیہ دور کا ایک امیر روشن الدولہ بہادر رستم جنگ اپنی پگڑی پر بہت سے طرّے لگاتا تھا لہٰذا طرّہ باز خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ اب ہر نمائش پسند شیخی خورے کو طرّہ باز خاں کہا جاتا ہے۔

طوبیٰ

خوشی اور نیکی کا درخت ہے جس کا ذکر اوستا میں بھی موجود ہے، یہودیوں کے شجر حیات کے مماثل ہے۔

ظ

ظاہریت پسندی

یہ فلسفہ جرمن فلسفی ہسترل نے پیش کیا ۔ اُس نے کہا کہ کسی مجرد حقیقتِ کُلّی پر غور و فکر کرنے کے بجائے اُن حقائق و ظواہر پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو حواسِ خمسہ سے محسوس کیے جا سکتے ہیں ۔ ہائڈگر اِسی فلسفے سے متاثر ہوا تھا ۔

ظریف

اِس کا اصل معنیٰ عربی میں شائستہ اور مُہذّب کا ہے ۔ اُردو اور فارسی میں تمسخر و مزاح کرنے والے کو کہتے ہیں ۔

ظلم

ظلم کا لغوی معنیٰ ہے کسی شے کو ایسی جگہ پر رکھنا جو اُس کی نہ ہو ۔

عالمہ

مصر میں پیشہ ور گانے والی کو عالمہ کہتے ہیں۔

عالم صغیر

صوفیہ وجودیہ کے خیال میں انسان کو کائنات کے نمونے پر پیدا کیا گیا ہے گویا انسان عالم صغیر ہے جس طرح خود کائنات انسان کبیر ہے۔ بعض صوفیہ انسان کو عالم کبیر اور کائنات کو عالم صغیر مانتے ہیں۔

عشائے ربانی

کلیسیائے روم والوں کی ایک رسم عبادت جس میں روٹی کو جناب مسیح کا گوشت سمجھ کر کھایا جاتا ہے اور شراب کو اُن کا لہو سمجھ کر پیتے ہیں۔ یہ رسم قدیم بُت پرستی کے دور سے یادگار ہے جب لوگ اپنے معبود بیل وغیرہ کو ایک تقریب میں کھا جاتے تھے تاکہ اُس کی یزدانی قوت اُن میں نفوذ کر جائے۔

عشق عذری

قبیلہ بنو عذرا والے پاک اور بے لوث عشق کے لئے مشہور تھے۔ اُن کے عشاق خلوت صحیحہ میں بھی عفت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے چنانچہ عشق عذری ضرب المثل بن گیا۔

عصمت فروشی

عصمت فروشی کو دنیا کا قدیم ترین پیشہ کہا گیا ہے لیکن اس مقولے میں مزاح زیادہ اور صداقت کم ہے۔ عورت کی زبوں حالی اور ذلت کا آغاز زرعی انقلاب کے بعد ہوا جب اُسے بھیڑ بکری اور گائے بیل کی طرح ذاتی املاک اور بکاؤ مال سمجھنے لگے۔ معاشرۂ انسانی اپنی ابتدائی صورت میں مادری تھا یعنی عورت کو مرد پر سیادت اور فوقیت حاصل تھی۔ بچے ماں کی نسبت سے پہچانے جاتے تھے اور املاک کا ورثہ

ماں کی طرف سے بچوں کو ملتا تھا۔ یہ صورتِ احوال زرعی انقلاب کے بعد بدل گئی جب معاشرے کا اساسی اصول پدری بن گیا اور عورت کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ عصمت فروشی کی ابتدا دھرتی دیویوں کے معبدوں سے ہوئی جہاں سینکڑوں دیوداسیاں رکھی جاتی تھیں جن کی کمائی پروہتوں کی جیب میں جاتی تھی۔ یہ "مقدس کاروبار" صدیوں تک جاری رہا حتیٰ کہ کاروباری لوگ اسے معبدوں سے باہر لے گئے اور جابجا قحبہ خانے کھول دیئے۔ ان میں زیادہ تر زر خرید لونڈیاں رکھی جاتی تھیں۔ پہلے پہل یہ قحبہ خانے بندرگاہوں میں قائم کئے گئے جہاں جہاز ران اپنی کمائی کسبیوں پر لٹاتے تھے۔ قحبہ خانوں کی مقبولیت دیکھ کر انہیں ریاستوں نے اپنی تحویل میں لے لیا اور دوسرے محصولات کی طرح اسے بھی اپنی آمدنی کا وسیلہ بنا لیا۔ فنیقیہ، یونان اور روما میں کسبیوں کو سرکار سے اجازت نامے لینا پڑتے تھے۔ ان ممالک میں لونڈوں کے قحبہ خانے بھی موجود تھے۔

مسلمان مورخین ہمیں بتاتے ہیں کہ ہندوستان کے راجے مہاراجے کسبیوں پر محصول لگا کر یہ رقم اپنی پولیس اور فوج پر خرچ کرتے تھے۔ اسلامی ممالک میں عصمت فروشی ممنوع تھی لیکن بردہ فروش اپنے گھروں میں لونڈیوں سے یہ دھندا کراتے تھے جیسا کہ الف لیلہ و لیلہ کی کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے۔ تمام ممالک کے درباری شہر کسبیوں کے گڑھ بن گئے کیوں کہ سلاطین، امراء اور روساء ان کی دل کھول کر سرپرستی کرتے تھے۔ احیاء العلوم کی صدیوں میں اہلِ مغرب نے مشرقی ممالک پر تاخت کی اور انہیں اپنی نو آبادیوں میں بدل دیا تو مصنوعات کے ساتھ کسبیوں کو بھی نو آبادیوں میں لے گئے جس سے "سفید غلامی" کے کاروبار کا آغاز ہوا۔ فی زمانہ یورپ اور امریکہ کے بڑے شہروں میں نہایت وسیع اور منظم طریقے سے عصمت فروشی کا کاروبار ہو رہا ہے کسبیوں کو کال گرل، ماڈل گرل اور میزبان کے نام دیئے گئے ہیں۔ ادھیڑ عمر کی عورتوں کو مرد کاسب یا ناچ کے ساتھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ ہوٹلوں میں منگول اور حبشی بیرے رکھے جاتے ہیں جو امراء کی عیاش عورتوں کی تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ پیرس میں مارسی لیے کے شہروں میں کسبیاں ہر نوع کی جنسی کجروی کی تشفی کرتی ہیں جس سے جامۂ انسانیت تار تار ہو گیا ہے۔ نیویارک، شکاگو، لندن، ہامبرگ، ٹوکیو، ہانگ کانگ، سنگاپور کے شہروں میں لاکھوں کسبیاں اپنا دھندا کرتی ہیں۔ عصمت فروشی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے سیزر لومبروزو نے کہا ہے کہ بعض عورتیں پیدائشی کسبیاں اور جرائم پیشہ ہوتی ہیں لیکن

اشتراکی دانشوروں نے ثابت کر دیا ہے کہ عصمت فروشی کی اصل وجہ معاشی ہے چنانچہ کسبیوں کو روزگار فراہم کر کے اشتراکی ممالک میں عصمت فروشی کا استحصال کر دیا گیا ہے۔ چین میں اشتراکی انقلاب کے وقت صرف شنگھائی میں پچاس ہزار کے لگ بھگ کسبیاں تھیں۔ اشتراکی رہنماؤں نے کنوارے مردوں سے کہا کہ ان کسبیوں سے نکاح کر کے انہیں دلدل سے نکالنا ان کا اخلاقی فرض ہے۔ ایک برس بھی نہ گذرا تھا کہ تمام کسبیاں باعزت بیویاں بن گئیں اور مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگیں۔ آزاد دنیا میں جہاں اجارہ داروں اور تاجروں کو لوٹ کھسوٹ کی آزادی ہے وہاں عورت کی عصمت فروشی کو بھی اس کا حق سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ پابندی سے اس کے آزادئ عمل کی جراحت ہوگی۔ گذشتہ جنگ عظیم میں جہاں کہیں امریکی گئے وہیں چکلے کھل گئے اور عصمت فروشی کا کاروبار چمک اٹھا۔ جنوبی کوریا، جاپان، جنوبی ویت نام، تھائی لینڈ، ملیشیا، برما کی اقوام کو ان ہوس پرستوں نے اپنے بے پناہ فسق و فجور سے آلودہ کر دیا ہے۔ آزاد دنیا میں عصمت فروشی کا وسیع کاروبار اس امر پہ دلالت کرتا ہے کہ اس میں عورت کی حیثیت عملاً مرد کے مساوی تسلیم نہیں کی گئی اور دوسری اجناس کی طرح اس کی عصمت کو بھی جنس تجارت سمجھ کر اس سے نفع اندوزی کی جا رہی ہے۔

عقل

لغوی معنیٰ ہے رسی جس سے اونٹ کا گھٹنا باندھا جائے۔ انسانی ذہن کی فکر و تدبر کی وہ خاصیت جو اُسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور اس میں خود شعوری پیدا کرتی ہے۔ انسان نے عقل ہی کے طفیل ترقی کے مدارج طے کر کے تمدن و تہذیب کی بنیادیں استوار کی ہیں اور وہ اسی کی مدد سے تسخیر فطرت پر قادر ہوا ہے۔

عقیقہ

عقیقہ کے لغوی معنیٰ ہیں نومولود کے سر کے بال۔

عبرانی

عبرانی کا مادہ عبور ہے۔ آرامی میں یہ لفظ عبر ہے جس کا معنیٰ ہے پار کرنا۔ جناب ابراہیم دریائے فرات کے اس پار سے آئے تھے اس لئے انہیں عبرانی کہا گیا اور ان کی زبان کو عبرانی کا نام دیا گیا۔

علم: علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے، تجربے کا مآخذ حواس خمسہ ہیں لہٰذا ہمارے حواس خمسہ کے توسط

کے بغیر ہمیں کسی شے کا علم نہیں ہو سکتا۔

علم الانسان

یہ ترکیب انتھروپولوجی کا لغوی ترجمہ ہے۔ یہ ترکیب ارسطو نے وضع کی تھی۔ اس علم کے دو پہلو ہیں (۱) طبیعی علم الانسان (انسان کا مطالعہ بحیثیت ایک حیوان کے جیسا کہ وہ ماضی میں تھا اور اب ہے) (۲) کلچرل علم الانسان (انسان کا مطالعہ بحیثیت معاشرتی وجود کے)۔ ہمارے زمانے میں علم الانسان کو بڑا فروغ ہوا ہے۔ ٹائلر، فریزر، رابرٹسن سمتھ، مالی نوسکی وغیرہ کی تحقیقات نے قدیم مذہب، کلچر، سماج، توہمات کے بارے میں اہم انکشافات کیے ہیں اور انسان کی سوچ کے بہت سے مخفی پہلو بے نقاب ہو گئے ہیں۔ علم الانسان نے تحلیل نفسی پر بھی گہرے اثرات ثبت کیے ہیں۔

عمر کا عبوری دور

یہ دور جوانی کے گذرنے کے بعد آتا ہے اور نفسیاتی پہلو سے مردوں عورتوں کے لیے بڑا نازک ہوتا ہے۔ عورتوں میں یہ دور ایام کے رک جانے کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ جوانی کی رخصت کا احساس عورت مرد دونوں کے لیے نہایت تلخ ہوتا ہے اور اس دور میں انسان گوناگوں جسمانی اور ذہنی عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور افسردگی، بیزاری، مردنی اور یاسیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ البتہ کسی اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے کام کرنے والے اس دور کے آشوب سے محفوظ رہتے ہیں۔

عورت

لفظ عورت کا لغوی معنیٰ ہے "شرمگاہ"۔ یہ لفظ عربی زبان کا ہے۔

عیدی

وہ روپیہ جو کسی زمانے میں عیدین پر بچوں کے اتالیق کو دیا جاتا تھا۔ آج کل عیدی عزیزوں کو دی جاتی ہے۔

غازیہ

مِصر میں پیشہ ور ناچنے والی کو غازیہ کہتے ہیں۔ غازیہ نہایت ہوس پرور اور ترغیب آور انداز میں زور زور سے کولہے مٹکا کر ناچتی ہیں۔ "رقصِ شکم" ان کا خاص ناچ ہے۔ بعض محفلوں میں برہنہ بھی ناچتی ہیں۔ اِن کا 'رقصِ شکم' مصرِ قدیم سے یادگار ہے۔

غبغب

ذبیحہ کا خون جس گڑھے میں گرتا تھا اِسلام سے پہلے کے عرب اُسے غبغب کہتے تھے۔ ادب کی اِصطلاح میں کسی حسینہ کی ٹھوڑی کے نیچے کے اُبھار کو غبغب یا سیبِ غبغب کہتے ہیں۔ اِسے خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

غزل الغزلات

عہد نامۂ قدیم کی مشہور عشقیہ نظم جو جنابِ سلیمانؑ سے منسوب ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن شکار کھیلتے ہوئے جنابِ سلیمانؑ نے ایک حسین و جمیل چرواہی کو دیکھا اور اُسے اپنے محل میں لے آئے لیکن یہ دوشیزہ کسی چرواہے سے پیار کرتی تھی۔ وہ اُٹھتی بیٹھتی عالمِ خیال میں اپنے محبوب سے باتیں کیا کرتی اور اُس سے پُرجوش محبت کا اِظہار کرتی تھی۔ آخر زچ ہو کر جنابِ سلیمانؑ نے اُسے واپس بھیجوا دیا۔ اپنے اچھوتے تمثیلی پیکروں کے لحاظ سے یہ نظم عشقیہ شاعری کا ایک نادر اور شگفتہ نمونہ ہے۔

غوغا

عرب کوّے کی آواز کو غاغا کہتے تھے۔ اِس سے لفظ غوغا بنا یعنی کوّا رول جیسا شور و غُل۔

فاشزم

اس کا اردو لاطینی کا لفظ فاشز ہے جس کا معنیٰ ہے چھڑیوں کا گٹھا جو کلہاڑے کے گرد باندھتے تھے اور جسے رومی عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ مسولینی نے اسے از سرِ نو رواج دیا۔ سیاسیات کی اصطلاح میں اس کا مفہوم ہے جبر و استبداد اور آمریت۔

فراست

علم قیافہ کو فراست کہتے ہیں اور یہ لفظ دانائی اور زیرکی کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ فراست عرب میں گھوڑوں (فرس: گھوڑا) کی پہچان کا علم تھا۔ بعد میں آدمی کی شکل و صورت، چال ڈھال اور ظاہری اطوار سے اس کے کردار کا پتہ چلانے کا علم بن گیا۔

فراش

فراش کا معنیٰ ہے بچھونا۔ عورت مرد کا بچھونا ہے اس لئے اسے فراش کہا جاتا تھا۔ صاحب فراش شوہر کو کہتے ہیں۔ بچھونے کی نسبت سے مریض کو بھی صاحبِ فراش کہا جاتا ہے۔

فرشتے

فارسی میں فرشتہ کا معنیٰ ہے "بھیجا ہوا" الہامی مذاہب میں فرشتے خدا اور پیغمبروں کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے۔ مجوسیوں کے بڑے فرشتے ہیں وہو مانو (نیک ذہن) مزدا (دانش مند) آشا (نیک سروش (الہام لانے والا) مرداد (موت کا فرشتہ) خور داد (آگ کا فرشتہ) لفظی معنیٰ ہیں سورج (خور) کا دیا ہوا۔

فلسفہ

لفظ فلسفہ کا معنیٰ ہے "دانش کی محبت" پہلے پہل دانا آدمی کو فلسفی کہا جاتا تھا۔ بعد میں مدلل علم

کو فلسفہ کہیں گے۔

فنونِ لطیفہ

فنونِ لطیفہ میں حسن و جمال کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ یہ فنون ہیں: موسیقی، مصوّری، شاعری، ناٹک، تعمیر، سنگ تراشی۔ ایچ، جی، ویلز نے کہا ہے کہ فلسفہ اور سائنس انسان کی تخلیقی کاوشیں ہیں جب کہ فنونِ لطیفہ محض آرائشی اور بیانیہ حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ محلِ نظر ہے۔ فنونِ لطیفہ کے شاہکاروں میں انسانی ذہن و قلب کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے۔ فن ایک پہلو سے سائنس اور فلسفے پر برتری رکھتا ہے کہ اس کے شاہ کاروں میں دوامی تاثیر کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ سائنس اور فلسفے کے نظریات بدلتے رہتے ہیں لیکن فن پارے کبھی فرسودہ نہیں ہوں گے اور ہمیشہ انسان کو مسرت بخشتے رہیں گے۔ سائنس، فلسفے اور فن میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ تینوں میں تناسب و توافق کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ سائنس دان اور فلسفی نوعِ انسانی کے اجتماعی تصورات میں تناسب کی تلاش کرتے ہیں اور فن کار اپنی شخصیت کے حوالے سے انسان کے ذہنی و قلبی واردات میں تناسب و توافق پیدا کرتا ہے۔

فول

انگریزی کا یہ لفظ لاطینی کے لفظ فالس سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے دھونکنی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک احمق کی گفتگو میں دھونکنی کی طرح سوائے ہوا کے کچھ نہیں ہوتا۔

فقیر

یوسف زئی مزارعین کو فقیر کہتے ہیں۔

قاآن

تاتاری زبان میں سردار یا آقا کو کہتے تھے۔ دہقان یعنی گاؤں کا مکھیا۔ بعد میں یہی لفظ خان بن گیا۔

قانون

زرعی انقلاب کے بعد انسانی معاشرے اور ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی۔ برسرِ اقتدار طبقے نے کچھ قاعدے اور قوانین بنالئے جن کا اصل مقصد ذاتی املاک کا تحفظ تھا۔ (اس لئے چوری، ڈاکے، زنا (عورت کو بھی ذاتی املاک میں شمار کرتے تھے) اور بغاوت کو سنگین جرائم قرار دے کر ان کی سزا موت رکھی گئی۔ مقتدر طبقے پر ان قوانین کا اطلاق ممکن نہ تھا۔ وہ ریاست کے مفاد کے نام پر سب کچھ جائز سمجھتے تھے۔ قانون کی حیثیت مکڑی کے جالے کی تھی جس میں ننھے منے پتنگے تو پھنس جاتے ہیں لیکن بڑے بڑے بھونرے اسے توڑ کر نکل جاتے ہیں۔ دلہنوں کو پہلی رات بادشاہ کی خلوت میں بسر کرنا پڑتی تھی اور جہاں کہیں بادشاہ کوئی خوبصورت عورت دیکھتے اور اسے پسند کرتے وہ بلا تکلف اسے اپنے حرم میں داخل کر لیتے تھے۔ حکام شروع سے اپنی طاقت اور اقتدار کو قوانین کے پردوں میں چھپاتے رہے ہیں تاکہ وہ اپنا تسلط مستقلاً برقرار رکھ سکیں۔ قانون کا مقصد عدل وانصاف کا قیام نہیں تھا جیسا کہ حکام کہتے آئے ہیں بلکہ طبقاتی مفاد کا تحفظ تھا۔ مقتدر طبقہ موجودہ صورتِ حالات کو برقرار رکھنے کے لئے قانون سے آلۂ کار کا کام لیتا رہا ہے چنانچہ ان کا قانون ان لوگوں کو باغی کہہ کر ان کا قلع قمع کر دیتا ہے جو موجودہ صورتِ احوال کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اقتدار کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ انہیں غدار اور وطن دشمن کہہ کر پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے۔ جمہوری نقطۂ نظر سے جو قوانین عوام خود اپنی مرضی سے اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں انہی کی پیروی ان پر فرض ہوتی ہے۔

قبتہ الصخرا، اس کا لغوی معنیٰ ہے "چٹان کا گنبد" یروشلم کی یہ عمارت یہودیوں، عیسائیوں اور

مسلمانوں کا مقدس مقام ہے۔ بقول ابن خلدون پہلے پہل یہاں کنعانیوں کا معبد تھا جو مقدس چٹان پر تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد میں اسے مسمار کرکے یہاں جناب سلیمان نے اپنا شاندار ہیکل تعمیر کردیا اس کے ایک اندرونی کمرے میں تابوت سکینہ رکھوا دیا۔ بابل کے بادشاہ بنوکد نضر نے یروشلم کو فتح کیا تو ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور تابوت سکینہ کو بھی توڑ پھوڑ دیا گیا۔ بعد میں مسلمانوں نے اس جگہ قبۃ الصخرا تعمیر کرایا جو آج تک محفوظ ہے۔

قدر

قدر کی سب سے آسان اور قابل فہم تعریف یہ ہوگی کہ جس شے میں ہم دلچسپی لیتے ہیں اسی میں ہمارے لئے قدر پیدا ہو جاتی ہے مثلاً ایک پڑھا لکھا آدمی ایک اچھی کتاب کی قدر کرے گا لیکن ان پڑھ کے لئے اس میں کوئی قدر نہیں ہوگی اسی لئے کہا گیا ہے کہ قدر ہمیشہ موضوعی ہوتی ہے۔ افلاطون تین قدروں کو ازلی و ابدی و معروضی مانتا تھا، حسن، خیر، صداقت۔ جدید نظریۂ اضافت نے قدر کو اضافی اور موضوعی بنا دیا ہے۔

قدم شریف

پتھروں پر اولیاء کے نشان پا کو قدم شریف کہا جاتا ہے۔ لوگ ان پر منتیں مانتے ہیں۔ ہندو اس نشان پا کو ہری چرن کہتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا مندر گیا میں ہے جہاں وشنو کا نشان پا محفوظ ہے۔ عورتیں اپنے سر کے بال کٹوا کر اس پر چڑھاتی ہیں گویا اپنا سر قربان کر رہی ہیں۔ گوتم بدھ کا قدم بھی بڑھ ہوت کے درخت کے نیچے پر نقش ہے اور مقدس سمجھا جاتا ہے۔

قرابادین

اس رسالے کو کہتے ہیں جس میں طبی مرکبات درج ہوں۔ یونانی زبان کا لفظ گرافیدیون کا معرب ہے۔

قربانی کا بکرا

یہودیوں کے ہاں رسم تھی کہ وہ اپنے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ایک بکرے کی قربانی سے دیتے تھے۔ وہ باری باری اس بکرے کے سر پر دونوں ہاتھ رکھتے گویا اپنے گناہ اسے منتقل کر رہے ہیں پھر اسے ایک اونچی چٹان سے گرا کر ہلاک کر دیتے تھے۔ اس کی گردن میں سرخ رسی بندھی ہوتی تھی۔ ان کے خیال میں ان کے سال بھر کے گناہ یہ بکرا اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

قزّان

قزّان کا لغوی معنیٰ ہے بآوازِ بلند پڑھنا۔

قزلِ باش

لغوی معنیٰ ہے سُرخ سر والا۔ ترکمانوں کے سات قبیلوں کو صفویہ کے جدِّ امجد نے تیمور لنگ سے سفارش کرکے رہائی دلوائی تھی چنانچہ یہ قبائل صفوی خاندان کے فدائی بن گئے۔ اِن قبیلوں کے افراد اپنے سروں پر سُرخ رنگ کے بارہ گوشوں کی کلاہ اوڑھتے تھے۔ بارہ گوشے بارہ اماموں کی رعایت سے رکھتے تھے۔ شاہ اسمٰعیل صفوی نے قزلِ باشوں کی جانفشانی اور پامردی سے شاہی بیگ اُزبک کو شکستِ فاش دے کر اُس کا زور توڑ دیا تھا۔

قزّاق

رُوسی زبان کا اصل لفظ قازق (کازک) ہے جس کا معنیٰ ہے گھوڑ سوار۔ بعد میں رہزن کو قزّاق کہنے لگے۔

قلندر

اصل لفظ فارسی کا کلندر تھا۔ بے شرعِ ملامتیہ کو قلندر کہتے ہیں۔ لال شہباز اور بوعلی قلندروں کے مشہور پیشوا تھے۔ یہ لوگ عورتوں کی طرح زیور پہنتے ہیں، گھٹنوں اور ٹخنوں سے گھنگرو باندھتے ہیں جو تال پر دھمال کھیلتے ہیں۔ پنجاب میں بکرے اور بندر کا تماشہ دکھانے والے کو بھی قلندر کہتے ہیں۔

قندیل

یہ لفظ لاطینی زبان کے کینڈیلا کا معرّب ہے۔ انگریزی کا کینڈل بھی یہی ہے۔

قہوہ

آج کل کافی کو کہتے ہیں لیکن اصلاً یہ لفظ شراب کے معنوں میں تھا۔ لفظ کافی حبش (ابی سینیا) کے جنوبی صوبے کافا کے نام سے لیا گیا جہاں پہلے پہل کافی کی کاشت ہوتی تھی۔ شیخ الشاذلی اسے ۱۴۳۰ء میں یمن لائے اور اِسے قہوہ کہنے لگے۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ کافی برازیل میں پیدا ہوتی ہے۔

قیوم

لغوی معنیٰ ہیں قائم رکھنے والا۔ شیخ احمد سرہندی کے خلفاء جن کا تعلق مجددیہ فرقے سے تھا، قیوم ہونے کے مدعی تھے یعنی کہتے تھے کہ اُن کے وجود سے کائنات کا نظام قائم ہے۔

قلم

فنیقی زبان میں جس سرکنڈے سے قلم تراشا جاتا ہے اُسے قلم کہتے تھے۔ بعد میں یہ لفظ عربی میں رواج پا گیا۔ یونانی زبان کا قلاموس اور لاطینی کا قلامس۔

کافی

پنجابی شاعری کی مشہور صنف جسے شاہ حسین نے راگوں کی بندش میں لکھا اور بلھے شاہ اور خواجہ غلام فریدؒ نے اُسے کمال کو پہنچایا۔ ایک روایت ہے کہ پہلے اس کا نام کامی (کام سے بمعنیٰ عشق اور ہوا و ہوس) تھا بعد میں کافی ہوگیا۔ اکثریت کی رائے میں کافی بمعنیٰ کامل تھا۔ ہندوستانی موسیقی میں کافی راگ اور کافی ٹھاٹھ بھی ہے۔

کالی دیوی

دراوڑوں کی مہامتا یا دھرتی دیوی جو بعد میں ہندوؤں کی دیو مالا میں شامل ہوگئی۔ ہندوؤں میں اس کے کئی نام ہیں، ستی، اُما، امبیکا، پاروتی، دُرگا، جگدگوری، چنڈی وغیرہ۔ کالی دیوی کے معبد میں انسانی قربانی دی جاتی تھی۔ کلکتہ (کالی گھاٹ سے بنا ہے) میں ہر روز اس کے معبد میں بکریاں ذبح کی جاتی ہیں جن کا بہتا ہوا خون اولاد کی خواہش مند عورتیں چاٹتی ہیں۔ اُن کی مورتی کے آگے خون کو خشک نہیں ہونے دیتے۔ اُس کی مورتی کے کئی ہاتھ ہیں۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ہے اور زبان لہو سے تر ہے۔ ٹھگ کالی کے پجاری تھے اور اُس کے نام پر مسافروں کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیتے تھے۔

کام دیو

ہندو دیو مالا میں عشق کا دیوتا جو وشنو اور لکشمی کا بیٹا ہے۔ اُس کے کئی نام ہیں: مَن متھ (دل میں گڑ بڑ مچانے والا)، مارا (چوٹ لگانے والا)، مدن (پیار کے نشے میں سرشار کرنے والا)۔ اس کے ایک ہاتھ میں تیر کمان ہے دوسرے میں سُرخ رنگ کا علم ہے جس پر مچھلی کا نشان ہے۔

کاغذ

چینیوں کی ایجاد ہے۔ اس کا اصل نام کوکو ذ تھا۔ ۷۰۴ء میں سمرقند فتح ہوا تو چینی قیدیوں نے مسلمانوں

کوریوں سے کاغذ بنانے کا فن سیکھایا۔ دمشق میں کاغذ کے کارخانے قائم کئے گئے۔ اطالیہ والوں نے صقلیہ کے مسلمانوں سے یہ ہنر سیکھا اور پھر سارے یورپ میں پھیل گیا۔

کلانا

مصلیوں کو کہتے ہیں جو آج کل مسلم شیخ کہلاتے ہیں۔ افغانستان کے مُصلّی اپنے آپ کو شاہ خیل کہتے ہیں

کٹھ

پنجاب کے دیہات میں مُردے کے دفن کے چالیس روز بعد برادری اکٹھی ہوتی ہے اور مرحوم کے بڑے بیٹے کے سر پر پگڑی باندھی جاتی ہے گویا آج سے وہ اپنے کنبے کا سربراہ ہے۔ اس تقریب کو کٹھ کہتے ہیں۔

کچی پنّی

پنجاب کے دیہات میں دلہن کے سسرال جانے پر چاول، چینی، گھی وغیرہ ملا کر گاؤں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسے کچی پنّی کہتے ہیں۔

کراڑ

انہیں اروڑے بھی کہتے ہیں۔ ان کے تین قبیلے ہیں: اُترادھی (شمالی) ڈکھنا (جنوبی) اور ڈاہرا۔ یہ کرشن کے پجاری ہیں اور ساہوکارا کرتے ہیں۔ یہ کسی کام سے عار محسوس نہیں کرتے۔ دکانداری ان کا خاص پیشہ ہے لیکن ضرورت پڑے تو گدھے بھی لا دلیتے ہیں اور جوتے بھی بیچ لیتے ہیں جو اُونچی ذاتوں کے ہندو پسند نہیں کرتے۔ ان کی رسم تحریر کو کرڑی کہتے ہیں۔

کرم

ریشم کے کیڑے کو فارسی میں کرماں کہتے ہیں کیوں کہ پہلے پہل وہ شہر کرمان میں پالے گئے تھے۔ بعد میں لفظ کرم کیڑے کے مفہوم میں بولنے لگے۔

کرشن

کرشن کا لغوی معنی ہے کالا۔ کالی دیوی کی طرح کرشن بھی دراوڑی دیو مالا سے لیا گیا ہے۔ اس کے دو روپ ہیں ایک گووندا یعنی گائیوں کے رکھوالے اور دوسرا وشنو کا اوتار جو مہا بھارت کی جنگ میں

ارجن کا رتھ بان تھا۔ پہلا روپ دراوڑی ہے۔ اس کی ماں دیوکی اپنے بھائی کنس والئی متھرا کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے بچانے کے لئے اسے برندابن لے گئی جہاں وہ گوپیوں (گوالوں) کی عورتوں سے عشق کرتا تھا۔ ایک گوپ آئن گھوش کی زوجہ رادھا سے اُس کا معاشقہ مشہور ہے اور ہندی شاعری کی ایک مستقل روایت بن گیا ہے۔ کرشن بھگت رادھا سے آتما مُراد لیتے ہیں جو کرشن (برہمن) سے واصل ہونے کے لئے بیقرار رہتی ہے اور اُس کی جُدائی میں تڑپتی رہتی ہے۔

کرسمس

کرسمس یا جناب مسیح کی پیدائش کا تہوار قدیم اقوام کی دیومالا سے لیا گیا تھا جو اسے آفتاب دیوتا کی ولادتِ نو کے سلسلے میں مناتی تھیں۔ جاڑے میں آفتاب جنوب کا رُخ کرتا اور اس کی تمازت میں فرق آجاتا تو قدیم زمانے کا انسان ڈر جاتا کہ آفتاب جنوب کی طرف جھکتا جھکتا آخر غائب ہو جائے گا اور زمین تاریکیوں کی لپیٹ میں آجائے گی لیکن دسمبر کے اواخر میں آفتاب اپنی جگہ ٹھہر جاتا اور پھر شمال کی طرف لوٹنے کا سفر جاری کرتا۔ اس پر خوشی کی تقریب منائی جاتی تھی۔ ۲۵۔ دسمبر کے لگ بھگ کی تاریخیں اکثر آفتاب دیوتاؤں کے جنم دن ہیں۔ بقول پلوٹارک اپالو کی تاریخ پیدائش ۲۵۔ دسمبر ہے، اوزیرس ۲۷۔ دسمبر کو اور ہورس ۲۸۔ دسمبر کو پیدا ہوا۔ ایران کا آفتاب دیوتا متھرا ۲۵۔ دسمبر کو ایک غار میں اپنی کنواری ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اُس کے بارہ پیرو تھے، اُسے خداوند اور بندوں کے مابین شفیع اور منجی (نجات دہندہ) مانتے تھے۔ اُس کے مت میں شامل ہونے کے لئے بپتسمہ لینا ضروری تھا۔ موت کے بعد اُسے دفن کیا گیا لیکن وہ قبر سے جی اُٹھا جس پر اُس کی حیاتِ نو کا جشن منایا گیا۔ متھرا مت ۷۰ ق م کو روما پہنچا اور ہر کہیں پھیل گیا۔ عیسائیت کی اشاعت پر اُسے روما اور سکندریہ میں تشدد کے ساتھ دبا دیا گیا۔ کرسمس کا تہوار بھی متھرا مت ہی سے لیا گیا ہے۔ جناب عیسیٰ کا یوم پیدائش شروع شروع میں چھ جنوری کو مناتے تھے لیکن ۳۵۴ء میں پوپ لائی بیریس نے اسے ۲۵۔ دسمبر کر دیا۔ یاد رہے کہ یونانی کلیسا والے کرسمس کا تہوار آج بھی ۶۔ جنوری کے دن مناتے ہیں

کعبہ

کعبہ کا معنی ہے چوکور عمارت۔ صابئین بھی کعبے کو مقدس مانتے تھے۔ مؤرخینِ اسلام کہتے ہیں کہ ایران

کے ساسانی بادشاہ کعبے کے لئے چڑھاوے بھیجا کرتے تھے۔ مجوسی کہتے ہیں کہ یہ لفظ فی الاصل ماہ گاہ یعنی چاند دیوتا کا معبد تھا۔ شہرستانی کے خیال میں کعبہ کیوان سیارے کا معبد تھا۔ دلبستان مذاہب میں حجر اسود کو کیوان کی علامت کہا گیا ہے۔ کعبے کے گرد قدیم زمانے میں سات چکر لگاتے تھے جو آفتاب کے گرد سات سیاروں کی گردش کی رعایت سے لگائے جاتے تھے۔ مسلمان بھی طواف کرتے ہوئے سات ہی چکر لگاتے ہیں۔

کفن

چٹاگانگ اور اس کے نواح میں کفن سے ایک عجیب کام لیا جاتا ہے۔ جب چور کسی کے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو اُس مکان کی چھت پر کسی مُردے کا اُتارا ہوا کفن پھیلا دیتے ہیں تاکہ گھر والے بے خبر سوتے رہیں۔

کلال

شراب کشید کر کے بیچنے والے کو کلال کہتے ہیں۔ سکھ کلال اہلوالیہ اور مسلمان کلال ککّے زئی کہلاتے ہیں۔ آج کل ککّے زئی پٹھان ہونے کے مدّعی ہیں۔ پہلے بندوبست میں گجرات کے ایک گاؤں والوں نے اپنے آپ کو کلال لکھوایا جب کہ دوسرے بندوبست میں ککّے زئی درج کروا دیا۔ ہوشیار پور کے ککّے زئی شیخ کہلاتے ہیں۔ بعض مسلمان کلال راجپوت اور کھتری ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ (ابٹسن۔ پنجاب کی ذاتیں) پنجابی دیہات میں کمہاروں کو کلال کہا جاتا ہے۔

کلام

علم کلام معتزلہ سے یادگار ہے۔ عباسی دور میں یونانی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے اور دنیائے اسلام میں فکری ہیجان پیدا ہوا تو معتزلہ نے عقلی دلائل سے مذہب اسلام کا دفاع کیا اور علم کلام کے اصول مرتّب کئے۔ شہرستانی نے ملل والنحل میں لکھا ہے کہ کلام اور منطق مترادف الفاظ ہیں۔ کلام فلسفے کے مقابلے میں ایجاد ہوا تھا اس لئے اسے فلسفے ہی کی ایک شاخ یعنی منطق کا نام دیا گیا۔ مسلمانوں سے پہلے عیسائی علماء نے عقل استدلالی سے اپنے مذہب کی صداقت کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عقل و نقل کی مفاہمت کو علم کلام کا نام مسلمانوں کا دیا ہوا ہے۔ مسلمانوں میں رازی اور غزالی مشہور متکلّم ہو گذرے ہیں۔ آج بھی اُن کی تقلید میں مذہب اور سائنس میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش

کی جارہی ہے۔ اہلِ مذہب پہلے تو کسی سائنسی انکشاف کو ملحدانہ قرار دیتے ہیں اور جب اُس کی صداقت مُسلّم ہو جاتی ہے تو اپنی مذہبی کتابوں کے متن کی تاویل کرکے کہتے ہیں کہ اِس انکشاف کے اصول ہمارے ہاں پہلے سے موجود تھے۔ مشرقی ممالک میں اِس نوع کی مُتکلمانہ روش سے علمی تحقیق کو نقصان پہنچا ہے اور سائنس کی ترویج و ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔

کلبیّت

یونانی زبان میں کُتّے کو سائن کہتے ہیں۔ فلسفی دیوجانس سے کسی نے ایک دن پوچھا "تم کون ہو" تو وہ بولا "میں ہوں دیوجانس کُتّا" اِس پر اُسے سِنک کہنے لگے یعنی "کُتّے کی مانند" (غرّانے والا) سنسکرت میں لگو مد و ٹکو کی ترکیب ہے جس کا مطلب ہے کُتّے کی طرح رہنے والا۔ عربوں نے سِنک کا ترجمہ کلبی سے کیا کہ عربی میں کُتّے کو کلب کہتے ہیں۔ دیوجانس کلبی اور اُس کے پیرو پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے تھے اور ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ وہ شخصی املاک کے مخالف تھے اور امیروں کے بارے میں طنزیہ کہتے تھے کہ یہ لوگ گدھے ہیں جو اپنی پیٹھ پر مال و دولت کا بوجھ اُٹھائے پھرتے ہیں۔ بعد میں ہر بات کو طنز و تمسخر میں اُڑانے والے اور بات بات پر زہر خند کرنے والے کو سِنک یا کلبی کہنے لگے۔

کلیسیا

اِس لفظ کا لغوی معنیٰ ہے "اجتماع" بعد میں عمارت اور ادارے کیلئے بولنے لگے۔

کمرہ

یونانی زبان کا لفظ ہے۔ عکس کشی کے آلے کو کیمرہ کہتے ہیں۔ یہ بھی کمرے ہی کے معنی رکھتا ہے۔

کُمبھ کرن

راون کا بھائی ایک دیو تھا۔ وہ سال بھر سویا پڑا رہتا تھا۔ لوگ لاکھ ڈھول پیٹتے ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا البتہ جب کوئی خوبصورت عورت اُسے چھوتی تھی تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا تھا۔

کُمبھ کا میلا

۲۱ مارچ کو چاروں طرف سے لوگ ہردوار گنگا میں اشنان کرنے کے لئے آتے ہیں۔ بارہ برس کے بعد

جب سیارہ مشتری برج دلو میں داخل ہوتا ہے (اسے کمبھ کہتے ہیں) تو یہاں زبردست میلا لگتا ہے اور لاکھوں عورتیں مرد ہجوم کر آتے ہیں۔ اس روز گنگا میں نہانا، خیرات دینا، سر اور ڈاڑھی کے بال منڈوانا بڑا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ مُردوں کے پھول (ہڈیاں) گنگا میں بہائے جاتے ہیں تاکہ وہ سیدھے سورگ کو جائیں۔

کوتوال

یہ لفظ اصلاً کوٹوال ہے (کوٹ، قلعہ) یعنی قلعے کا حاکم۔ کوٹ، پہاڑ کی چوٹی کا چھوٹا قلعہ جو چٹان پر تعمیر کیا گیا ہو۔

کوکلکس کلان

اضلاعِ متحدہ امریکہ کی ایک خفیہ جماعت جو پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں قائم کی گئی تھی۔ اس کی بنیادی تعلیم ہے یہودیوں، حبشیوں اور رومن کیتھولکوں سے نفرت کرنا۔ اس کے اراکین اپنے چہرے پر نقاب ڈالتے ہیں اور جنگلوں میں آگ کے الاؤ جلا کر عجیب و غریب رسوم ادا کرتے ہیں۔ شعلوں کی بھڑکتی ہوئی صلیب ان کا نشان ہے۔

کہروا

کہروا یا کہاروا کہاروں کے ناچ گانے کو کہتے ہیں۔ بعد میں یہ لوک گیت دادرے کی طرح ہندوستانی موسیقی کی ایک صنف بن گیا۔

کلچر

کلچر وہ جامع کُل ہے جس میں علم، عقیدہ، فنونِ لطیفہ، اخلاق، قانون، رسم و رواج اور دوسری عادات اور صلاحیتیں جو انسان نے بہ حیثیت معاشرے کا فرد ہونے کے حاصل کی ہیں، شامل ہیں۔ (ای، بی ٹائلر)

کھادر

دریا کے کنارے کی قریبی زمین کو کھادر کہتے ہیں۔ جو اراضی دریا کے کنارے دُور ہو اُسے بانگر کہا جاتا ہے۔

کھٹ

جہیز کو چارپائیوں پر ڈال کر اس کی نمائش کی جاتی ہے۔ اسے کھٹ کہتے ہیں جس پر عورتیں گیت

گاتی ہیں۔ بعض دیہات میں نائی پیالے میں لسی یا دہی ڈال کر مہمانوں سے لاگ وصول کرتا ہے اسے بھی کھٹ کا نام دیا جاتا ہے۔

کھرج

ہندوستانی موسیقی کے سپتک کا پہلا سُر (سا) اصل میں شڑج ہے جس کا معنی ہے چھ کی پیدائش یعنی اس میں سے باقی کے چھ سُر پنچم، دھیوت، رکھب، گندھار، مدھیم اور نشاد نکلے ہیں۔

کہکشاں

ستاروں کا جھرمٹ جو آسمان پر لمبی دھاریوں کی صورت میں دکھائی دیتا ہے جیسے گھاس کا گٹھا گھسیٹا گیا ہو۔ کاہ (گھاس) کشیدہ۔ ہندو اِسے ناگ وِیٹی (سانپوں کی قطار) کہتے ہیں۔ پنجابی میں اسے "بیڑی دا گھس" کہتے ہیں یعنی ناؤ جو نقش سطحِ آب پر چھوڑتی ہے۔

کھلوار

فارسی میں خروار ہے یعنی ایک گدھے کا بوجھ۔ پنجاب میں کھلوار دس من کا ہوتا ہے۔

کھوجی

پنجاب کے دیہات میں چوری کا سُراغ لگانے والے کو کھوجی کہتے ہیں۔ یہ چوروں کے نشان پا (کھوج) اور مویشیوں کے پاؤں کے نشان (کھرا) کو دیکھتے دیکھتے عین اُس جگہ جا پہنچتے ہیں جہاں چوروں نے چوری کے مواشی رکھے ہوئے ہوں۔ بعض اوقات تیس تیس میل تک کھوج لگا لیتے ہیں خواہ راستے میں ندی نالے ہی کیوں نہ آجائیں۔ یہ فن اب مٹتا جا رہا ہے۔

کیمیا گری

معمولی دھاتوں کو سونے چاندی میں بدل دینے کا فن کیمیا گری کہلاتا ہے۔ اس کا آغاز مصرِ قدیم سے ہوا تھا جہاں کے پروہت اپنی زبان میں مصر کو کیمیا کہتے تھے۔ کیمیا گر پارس پتھر کی تلاش میں عمریں گنوا دیتے ہیں۔ سونے کی ہوس کے باعث انہیں ھُوَس بھی کہا جاتا ہے۔ اُن کے خیال میں سُورج نے ہزاروں برس چمک کر زیرِ زمین اپنا پیکر تخلیق کیا ہے جسے سونا کہا جاتا ہے۔ کیمیا گروں کی اصطلاح میں

سونے کو شمس اور چاندی کو قمر کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا (آفتاب) کو سونے سے پہچانا جاتا ہے۔ خُدا کا پیکر پارے میں لفوذ کر کے اُسے سونا بنا دیتا ہے۔ گوئٹے کی مشہور تمثیل فاؤسٹ میں کیمیاگری کے افکار کا تانا بانا ہے۔ ژنگ نے اِس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ کیمیاگروں کی مشہور تثلیث ہے: گندھک، پارہ، نمک۔ کیمیاگروں کے تجربات ہی سے کیمسٹری کی سائنس نے جنم لیا تھا جیسا کہ اِس کے نام سے ظاہر ہے۔

کرتا

سنسکرت میں اِس کا معنیٰ ہے وہ مرد جو گھر والوں کی کفالت کرتا ہو۔ گھر والے اُس کے پرلیوار ہوتے ہیں۔ کرتا دھرتا کی ترکیب اِسی سے بنی ہے۔

کوروبستان

بعض اقوام میں یہ رسم تھی کہ میزبان اپنی زوجہ کو مہمان کے پاس خلوت میں بھیجتا تھا۔ اِسے آدابِ مہمان نوازی میں شمار کیا جاتا تھا۔

کبت

پنجابی شاعری کی ایک صنف جس میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ ایک میں ماتروں کا حساب نہیں ہوتا خواہ کتنے ہی ماترے ہو جائیں۔

گانا

گانا سُرخ، زرد اور سبز دھاگوں سے بٹا جاتا ہے۔ دُلہا دلہن کو میراسی اور میراثن جنوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے کلائی میں باندھتے ہیں اِس کے ساتھ ایک چھلّا اور پُھندنا اور حرمل کی پوٹلی بھی بندھی ہوتی ہے۔

گٹکری

موسیقی کی اِصطلاح میں وہ آواز جو گلے سے لہرا کر نکلتی ہے اِسے گٹکری کہتے ہیں۔

گِدھا

پنجاب کے دیہات کی جوان لڑکیوں کا ایک لوک ناچ ہے جو چٹکیاں بجا بجا کر اور تالیاں پیٹ پیٹ کر ناچا جاتا ہے۔ اِس کے ساتھ گیت بھی گاتی ہیں۔

گرنتھ

پُرانے زمانے میں ہندو کاغذ سے ناآشنا تھے۔ وہ بھوج پتر پر لکھتے تھے اور اِن پتروں کو دھاگے میں پرو کر گرہ لگا دیتے تھے۔ گرنتھ کا معنی گرہ ہی ہے بعد میں کتاب کے مفہوم میں بولنے لگے۔

گُرمتا

سکھوں کی مشاورتی مجلس کو گُرمتا کہتے تھے۔ اب منصوبہ باندھنے کو گُرمتا پکانا کہا جاتا ہے۔

گلاّئی

گلاّئی شام کی دھرتی دیوی عشتر کے خوبجے پجاری تھے جو دیوی کے جشنِ بہار پر جلوس نکالتے تھے۔ اِس جشن میں زور زور سے ڈھول پیٹے جاتے اور نفیریوں کے ساتھ بلند آواز میں گیت گاتے جاتے۔ عشتر

کے پجاری جوش میں آکر اپنے آپ کو چھریوں سے زخمی کر لیتے، اپنے کپڑے نوچ پھینکتے اور اپنے آلاتِ تناسل قطع کر دیتے۔ پھر وہ گلیوں میں دوڑتے پھرتے اور لوگوں کے گھروں میں آلاتِ تناسل پھینک دیتے جس پر گھر والے انہیں زنانہ لباس اور زیورات پہننے کو دیتے تھے۔ یہ ہیجڑے دیوی کے مندر کے پجاری بن جاتے تھے آلاتِ تناسل کے کاٹنے کا مطلب یہ تھا کہ ہیجڑے بن کر وہ دیوی کے زیادہ قریب ہو جائیں گے۔

گمک

ڈھول یا طبلے کی تھاپ یا گانے والے کے گلے سے گونجتی ہوئی آواز کو گمک کہتے ہیں۔ وین، ستار وغیرہ میں تو مبا لگانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اِس میں سے آواز گونج کر نکلتی ہے۔ گانے والے یا گانے والی کا پیٹ جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اُس کی آواز میں گمک ہوگی جو اس کے گانے اور آواز میں دلکشی اور تاثیر پیدا کرے گی۔

گندھارا آرٹ

پشاور کے گرد و نواح کا علاقہ کسی زمانے میں گندھارا کہلاتا تھا جس کا معنی ہے خوشبو سے معطّر (گندھ: خوشبو)۔ ۱۹۰ ق م میں گندھارا پر باختری یونانیوں نے قبضہ کر لیا۔ دوسری صدی بعد مسیح میں یہاں کشان بادشاہ کنشک کا تسلط ہوا جس نے بدھ مت کو بڑا فروغ بخشا اور بدھ کی مورتیاں تراشنے کے فن نے ترقی کی۔ بت تراشی کے لئے یونانی فن کاروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ مجسمے جن کے خدوخال یونانی ہیں گندھارا آرٹ کے حسین نمونے ہیں۔ اِس آرٹ کو دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لاہور کے میوزیم میں اِس اسلوبِ فن کے نہایت خوبصورت نمونے موجود ہیں۔

گھوٹ

سندھ میں دُلہا کو گھوٹ اور دلہن کو کنوار کہتے ہیں۔

گوت

لفظ گوت کا اصل معنی ہے "گائے کا گھر"۔ اصطلاح میں ہندوؤں کی ذیلی جاتیوں کو کہتے ہیں۔

گورکھا: (۱)۔ ایک قسم کا نقارہ جو جنگ سے پہلے بجاتے تھے (۲)۔ نیپال کا پیشہ ور سپاہی۔

گھڑی

مغلوں کے دور میں گھڑی ۲۴ منٹ کی، پل ۲۴ سیکنڈ کا اور بپل ایک سیکنڈ کا ہوتا تھا۔

گھوڑی

پنجابی دیہات کا لوک گیت جو دُلہا کے گھوڑی پر سوار ہوتے وقت گایا جاتا ہے۔ دُلہا کی بہنیں یہ گیت گاتی ہیں۔

گھگُھو

گھگھو (اُلّو) اور گھوگڑ (مادہ بدرو) ہیں جو ننّھے بچوں کو ڈراتی ہیں۔ پنجابی دیہات کا ایک توہّم ہے۔

گوئیاں

امیر لوگ بعض اوقات دوسروں کی بیٹیاں گھروں میں رکھ کر اُن کی پرورش کرتے تھے جو اُن کی اپنی بیٹیوں کی گوئیاں (سہیلیاں) کہلاتی تھیں۔

گھوٹل

وسطِ ہند کے جنگلی قبائل بوارِیا، گونڈ اور مُنڈا اپنی بستی سے الگ تھلگ ایک بڑا سا جھونپڑا بناتے ہیں جس میں راتوں کو کنوارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مِل بیٹھتے ہیں اور جنسی اختلاط کرتے ہیں۔ اس جھونپڑے کو گھوٹل کہا جاتا ہے۔ اس میں بیاہے ہوئے عورتیں مرد نہیں جا سکتے۔ گھوٹل میں کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اُس کا بیاہ اپنے اصل منگیتر سے کر دیا جاتا ہے اور اِسے معیوب نہیں جانتے۔ گھوٹل کی صورت میں گویا اِن قبائلیوں نے کنوارے لڑکے لڑکیوں کے جنسی مسائل کا حل پیش کیا ہے۔

گیتا

مجوسیوں کی گاتھا۔ گیتا کا مادہ گائی (گانا) ہے اور گیت اِسی لفظ سے ہے۔ گیتا ہندوؤں کی اور گاتھا مجوسیوں کی مقدّس کتابیں ہیں۔

ل

لاکڑی

لاکڑی یعنی لکڑی والا۔ کبڈی کے کھیل میں منصف کے ہاتھ میں لکڑی ہوتی ہے جس کے اشارے پر کھلاڑی عمل کرتے ہیں۔

لات منات

لات، منات اور عزیٰ تین چاند دیویاں تھیں جنہیں اسلام سے پہلے عرب اللہ کی بیٹیاں (بنات اللہ) کہا کرتے تھے۔

لاکھ

سنسکرت کے لفظ لکھشنا سے بنا ہے۔ ایک سو ہزار کی رقم۔ لکھشنا کا معنیٰ ہے نشان۔

لانگ مارچ

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں چین کی خانہ جنگی میں چیانگ کائی شیک کی فوجوں نے اشتراکی فوج کو گھیرے میں لے لیا لیکن اشتراکی ماوزے تنگ، چو این لائی اور چن ژی کی قیادت میں یہ گھیرا توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور محفوظ کوہستانی علاقے تک پہنچنے کے لئے ساڑھے چھ ہزار میل کا فاصلہ طے کیا۔ اسے لانگ مارچ کہتے ہیں جو تاریخ عالم میں عظیم ترین جنگی کارنامہ ہے۔ کچھ عرصے کے بعد حالات مساعد ہونے پر اشتراکی کمین گاہوں سے باہر نکل آئے اور چیانگ کائی شیک کو شکست دے کر ملک سے باہر نکال دیا۔ دس لاکھ اشتراکی جو لانگ مارچ میں حصہ نہ لے سکے انہیں چیانگ کائی شیک نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ماوزے تنگ اس مارچ میں جس گھوڑے پر سوار تھا موت کے بعد اسے محفوظ کر لیا گیا۔ یہ حنوط شدہ گھوڑا اشتراکیوں کی ہمت و شجاعت کی علامت بن گیا ہے۔

لِنگ دھاری

شیو بھگت ہیں جو لِنگ اور غم کی شبیہ چاندی میں منڈھا کر گلے میں پہنتے ہیں اور ماتھے پر اِن کی شکل کا ٹیکہ لگاتے ہیں ۔

لانواں

دُلہا اور دلہن کے کپڑوں کو گرہ دے کر گرہ کو سات دفعہ اُن کے سروں پر رکھا جاتا ہے اور گیت گائے جاتے ہیں۔ بیاہ کی ایک مشہور رسم ہے ۔

لُڈّی

پنجاب کا ایک لوک ناچ جسے چکّر لگا کر ناچتے ہیں ۔ ہاتھوں میں ڈنڈے رکھتے ہیں جو تال کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے بجاتے ہیں۔ لُڈّی اُچھل اُچھل کر ناچی جاتی ہے ۔

لبھائتی

فرائڈ نے جنسی کشش کے لئے لاطینی کا لفظ لبائڈو LIBIDO استعمال کیا ہے۔ یہی لفظ سنسکرت میں لبھائتی (شدید کشش) ہے ۔ لوبھ اور لُبھانا اِسی سے ہیں ۔ یہ لفظ قدیم جرمن میں لیوب LIOB اور انگریزی میں لَو LOVE بہ معنیٰ محبت آیا ہے ۔

لکھنؤ

شہر ایودھیا کی نواحی بستی تھی جسے رام کے چھوٹے بھائی لکشمن کے نام پر بسایا گیا تھا اِس لئے لکھنؤ کے نام سے مشہور ہوئی ۔

لوک گیت

جس طرح لوک بت کہاوت ادبیات کا ماخذ ہے اِسی طرح لوک گیت موسیقی کا مبدا ہیں ۔ ہندوستانی موسیقی کے راگ کسی نہ کسی صورت میں لوک گیتوں ہی سے نکلے ہیں مثلاً پہاڑی ، بھیرویں ، پسج ، جوگ ، سوہنی ، دیس ، گوڑ ملہار ، سارنگ وغیرہ ۔ پنجاب میں جگنی ، ماہیا اور ٹپّہ لوک گیت ہیں ۔ دادرا بندھیل کھنڈ کا ، چیتی ، ساونی ، جھولن اُتّر پردیش کے ، کجری مرزاپور کے لوک گیت ہیں ۔ روس کے

موسیقاروں رِمسکی اور گلنکا نے اکثر لوک گیت اپنائے ہیں اور اُن کے رس اور نغمگی کو کلاسیکی اسالیب میں منتقل کیا ہے۔ جرمن موسیقار شوبرٹ کے نغمات پر لوک گیتوں کا اثر نمایاں ہے۔ گوئٹے کہتے ہیں کہ گویّے کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوک گیتوں سے قریبی رابطہ رکھے۔ اُس کی گائیکی میں لوک رس سے شگفتگی پیدا ہوگی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں مارگ (کلاسیکی) اور دیسی (لوک، علاقائی) راگ راگنیوں کا تال میل ہوا جس سے موسیقی عوام سے قریب تر آگئی۔ ایک جرمن عالم جوہان گوٹفریڈ ہرڈر نے جرمنی کے لوک گیت اکھٹے کئے اور ایک رات گوئٹے کو سُنائے۔ گوئٹے پر لوک گیتوں کی بے پناہ تاثیر کا راز کھلا اور وہ اُسی رات سے شعر کہنے لگا۔ لوک گیتوں پر ہرڈر کی کتاب "اقوامِ عالم کی آوازیں گیتوں میں" نہایت قابلِ قدر ہے۔

لُوہری

جاڑے میں ٹھٹھرا دینے والی تیز ہوا کو پنجابی دیہات میں لُوہری کہتے ہیں۔

لیلی

لیلی سردار یار محمد خاں کی ایک نہایت خوبصورت اور سُبک خرام گھوڑی تھی جس کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔ رنجیت سنگھ نے یار محمد خاں کو مجبور کر کے یہ گھوڑی اُس سے ہتھیا لی۔

لاہوت

منصور حلاج نے صوفی کے روحانی ارتقاء کی منزلیں مقرر کی تھیں: ناسوت (مادی عالم) جبروت (فرشتوں کا عالم یا عالمِ جلال) لاہوت (عالم جمال) ہاہوت (فنا فی اللہ کا مقام)۔

لے

طبلے، مردنگ یا پکھاوج کا ٹھیکا جو سُروں کو ضبط میں رکھتا ہے۔ اُستاد لوگ کہتے ہیں کہ جو گویّا لے کا پکا نہ ہو وہ کوڑھ (عطائی) ہوتا ہے۔ پنڈتوں کے خیال میں سُر گورو ہے، سُر ایشور ہے (سُر کا اصل معنی خدا ہی ہے) گورو کا ہاتھ تھامے بغیر ایشور تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

۴

مادّیت پسندی

یونان قدیم میں فلسفے کا آغاز مادیت پسندی سے ہوا تھا۔ ابتدائی دَور کے آئونی فلاسفہ کو ہیولائی (ہیولا: مادّہ) کہا گیا ہے جس کا معنی مادیت پسند ہی کا ہے۔ طالیس (۵۵۰—۶۲۴ ق م) نے کہا کہ کائنات پانی سے بنی ہے، اناکسی مینڈر نے کہا نہیں کائنات ایک زندہ لا محدود شے ہے، ہیرقلیتس نے کہا کائنات آگ سے بنی ہے، ایمپی دکلیس کے خیال میں کائنات کے اجزائے ترکیبی آگ، ہوا، مٹی اور پانی ہیں؛ دیماقریطس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کائنات ایٹموں سے مرکب ہے۔ یہ فلاسفہ مادیت پسند تھے کیوں کہ انہوں نے اپنے علم اور مشاہدے کے مطابق کائنات کی تحقیقی توجیہہ کرنے کی کوشش کی تھی اور اِس کی تکوین کو کسی دیوتا سے منسوب نہیں کیا تھا جیسا کہ اُس دَور کے اہل مذہب کا عقیدہ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ مادّہ ازلی ہے، غیر فانی ہے، اِس میں حرکت کی صلاحیت موجود ہے اور یہ حرکت مقرّرہ قوانین کے تحت ہو رہی ہے، فطرت میں ہر کہیں سبب و مسبّب کا قانون کار فرما ہے اِس لئے کوئی شے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی اور نہ کائنات پر کسی قسم کا کوئی شعور یا ذہن یا یزدانی قوت متصرّف ہے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کی مثالیت پسندی کے باعث مادیت پسندی کی یہ روایت دب کر رہ گئی لیکن رواقیین اور ابیقورس کے پیرووں نے پھر مادیت پسندی سے رجوع کیا۔ رواقیین کی طبیعیات کا اصل اصول یہ تھا کہ کوئی غیر مادی شے موجود ہی نہیں ہو سکتی۔ اُن کے خیال میں علم صرف جسمانی حواس ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ رُوح اور عقل کو بھی مادّی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی مادیت پر وحدت الوجود کا پیوند لگایا اور کہا کہ خُدا کائنات کی رُوح ہے لیکن اِس سے جُدا نہیں ہے اور یہ رُوح بھی آتشی ہے، مادّی ہے۔

ابیقورس اور لکریشیس نے واشگاف الفاظ میں مادیت کا ابلاغ کیا اور کہا کہ عالم مادّی ہے اور میکانکی ہے جس کا نظام

سلسلۂ سبب و مسبّب کے باعث قائم ہے، اور روح ایٹموں سے مرکب ہے جو مرنے کے بعد بکھر جاتے ہیں چنانچہ وہ حیات بعد موت کے منکر تھے اور اسے اہل مذہب کا واہمہ قرار دیتے تھے۔ لکریشیس کہتا ہے کہ کائنات مادّی کے ماوراء کوئی قانون یا ہستی نہیں ہے۔ کائنات کے سب قوانین اس کے اپنے بطون میں موجود ہیں۔ خدا آفاقی قانون ہی کا دوسرا نام ہے۔ عہدِ وسطیٰ کی تاریک صدیوں میں مثالیت کا چرچا رہا کیوں کہ کلیسیا والے اسے اپنے مذہب کے قریں جانتے تھے۔ ولی آگسٹائن نے افلاطون کو فلسفیوں کا مسیح کہا۔ احیاءِ العلوم کے ساتھ جب نئی سائنس نے جنم لیا اور کیپلر، گلیلیو اور نیوٹن نے طبیعیات اور ہیئت میں حیرت انگیز انکشافات کئے تو فلاسفہ نے مادیت پسندی کا احیاء کیا۔ ہابس مطلق مادیت کا قائل تھا۔ اس کے خیال میں کائنات کی ہر شئے انسان سمیت مادّی ہے اور حرکت میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی فکر ترقی یافتہ حسیات ہی کا سلسلہ ہے۔ ڈیکارٹ نے حیوانات کے جسم کو ایک خود کار کل قرار دیا اور سپینوزا نے رواقیین کی طرح وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ حقیقت ایک ہے جو تمام کائنات پر محیط ہے۔ اس سے الگ کسی شئے کا وجود ممکن نہیں ہو سکتا۔

اٹھارویں صدی میں سائنس کی ہمہ گیر اشاعت نے خرد افروزی کی تحریک کو جنم دیا جو ہالینڈ اور فرانس سے ابھری اور تمام مغربی ممالک میں پھیل گئی۔ اس کے فلاسفہ دیدیرو، دہولباخ، دالمبر، ترگو، ہل وشیس وغیرہ مادیت پسند تھے۔ انھوں نے کہا کہ ڈیکارٹ نے حیوانات کو کل کہا ہے انسان بھی انہی کی طرح کی کل ہے اور اس میں تمام ذہنی واردات میکانکی ہیں۔ دہولباخ نے روح کے وجود سے انکار کیا اور کہا کہ فکر و تدبّر مغزِ سر کا ایک ایسا ہی فعل ہے جیسا کہ مثلاً ہضم معدے کا فعل ہے۔ ان فلاسفہ کے خیال میں حقائق کو مشاہدے پر مبنی ہونا چاہیے۔ مادّی عالم کا نظام خود کار ہے اور اس میں تمام تغیرات طبعی قوانین کے تحت ہوتے ہیں اور کرۂ ارض کائنات کا مرکز نہیں ہے۔ ۱۹ ویں صدی میں ہیکل اور ڈارون کے نظریات نے بھی مثالیت کی نفی کی۔ ہیکل نے انسانی شعور کی تشریح عضویاتی پہلو سے کی اور کہا کہ ذہن جسم سے الگ نہیں ہے بلکہ مغزِ سر ہی کا فعل ہے۔ اس نے ہر قسم کی فوق الفطرت ہستیوں سے انکار کیا۔ ڈارون نے انسان کو ایک ترقی یافتہ حیوان کہہ کر کلیسیا والوں کی روحانیت کو رد کر دیا۔ صدیِ رواں میں اضافیت

اور مقادیر عنصری کے نظریات نے کلاسیکی مادیت کا خاتمہ کر دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مادہ چند "واقعات" پر مشتمل ہے جو اختلافی قوانین سبب و مسبّب کے تحت ترتیب پاتے رہتے ہیں یعنی مادہ توانائی میں اور توانائی مادے میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بعض سائنس والوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایٹم کے اجزا الیکٹرون پروٹون وغیرہ کی حرکت آزادانہ ہے جس سے سلسلہ سبب و مسبّب باطل ہو گیا ہے لیکن یہ محض نیم صداقت ہے توانائی کی لہروں کی حرکت آزادانہ ہو تو ہو لیکن جب توانائی مادے کی شکل اختیار کرتی ہے تو یہ مادہ سلسلۂ سبب و مسبّب کی گرفت میں آجاتا ہے۔

کارل مارکس نے کلاسیکی مادیت کو رد کر دیا اور اس میں جدلیات کو شامل کر کے جدلیاتی مادیت کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کا اصل اصول یہ ہے کہ مادہ اپنے وجود کے لئے انسانی ذہن و شعور کا محتاج نہیں ہے اور معروضی صورت میں موجود ہے، اس کے ساتھ ہی کلاسیکی مادیت کی جگہ جدلیاتی مادیت رواج پا گئی ہے۔

ماشہ

ما کا معنی سنسکرت میں ہے ماپنا۔ ماشہ اسی سے ہے۔

مافیہ

عربی میں مافیہ کا مطلب ہے 'جائے پناہ'۔ یہ خفیہ تنظیم جزیرہ صقلیہ سے شروع ہوئی جو کسی زمانے میں عربوں کے تسلط میں تھا۔ ابتدا میں زمینداروں کی تنظیم تھی جو بل کسم زارعوں اور کسانوں کو دبانا چاہتے تھے بعد میں ٹھگوں اور قاتلوں کی خفیہ جماعت بن گئی جس کے سردار کو ڈان کہتے ہیں۔ مسولینی نے مافیہ کو کچل دیا تو یہ لوگ بھاگ کر اضلاع متحدہ امریکہ چلے گئے اور وہاں اس کے سرداروں نے کئی تنظیمیں قائم کر لیں اس کے اراکین پیشہ ور مجرم اور قاتل ہوتے ہیں۔ جوا، منشیات کا لین دین، عصمت فروشی اور سمگلنگ کے مذموم کاروبار بیشتر انہی کے ہاتھوں میں ہیں۔ یہ اپنے مخالفین کو پیشہ ور قاتلوں سے ہلاک کرا دیتے ہیں اور آپس میں بھی لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

مالا

مالا بودھوں کی ایجاد ہے بعد میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں اس کا رواج ہوا۔ تسبیح اسی کی ایک صورت ہے۔

مالتھس کا نظریہ

مالتھس کا آبادی کا نظریہ جس نے چارلس ڈارون کو متاثر کیا تھا یہ تھا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کو تین طریقوں سے روکا جا سکتا ہے۔ (۱) اخلاقی ضبط یعنی جنسی ملاپ سے گریز کرنا (۲) معصیت یا غیر فطری طریقے اختیار کرنا۔ (۳) افلاس۔ اخلاقی ضبط پر اُسے چنداں اعتماد نہیں تھا اور بحیثیت ایک پادری ہونے کے وہ معصیت کو بھی جائز قرار نہیں دے سکتا تھا اس لئے اُس نے کہا کہ صرف افلاس ہی آبادی کو بڑھنے سے روکنے کا موثر طریقہ ہے۔

مالیخولیا

مالیخولیا یونانی زبان کا لفظ ہے۔ یہ ایک ذہنی مرض ہے جس میں آدمی وسوسوں اور وہموں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی سب سے واضح علامت یہ ہے کہ مریض بے تکان بے تکی باتیں کرتا ہے اور بے تحاشا قہقہے لگاتا رہتا ہے۔

مانویت

مانی بن حماد (۲۱۶ — ۲۷۶ ب م) شاپور اردشیر کے عہدِ حکومت میں ایران میں ظاہر ہوا۔ اُس نے زردشت کے مذہب کو رد کر دیا۔ مانی کی تعلیم یہ تھی کہ کائنات میں دو ازلی و ابدی عناصر ہیں: خیر اور شر؛ خالق دو ہیں خالقِ خیر اور خالقِ شر۔ ہر شئے پانچ صفات سے متصف ہے یعنی رنگ، ذائقہ، بُو، لمس اور آواز۔ اِن کے ذریعے سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ نور نیکی کا ماخذ ہے اور ظلمت بُرائی کا منبع ہے۔ اِبتدا میں یہ عناصر الگ الگ تھے لیکن ظلمت کی طرف سے ابتدا ہوئی اور دونوں باہم آمیز ہو گئے۔ وہ زردشت کی تعلیم کے برعکس اہرمن یا خالقِ شر کو اہورا مزدا یا خالقِ خیر سے زیادہ طاقتور اور فعال سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ آدم کو شیطان نے پیدا کیا تھا اس لئے برائی انسان کی سرشت میں ہے۔ مانی نے زردشت کی مخالفت اس لئے بھی کی کہ زردشت توالد و تناسل کی دعوت دیتا تھا جب کہ مانی تجرد اور ترکِ دنیا کا قائل تھا۔ اس لحاظ سے وہ بدھ مت سے متاثر ہوا تھا۔ اسی سبب وہ عیسیٰ ابن مریم کا بھی مداح تھا۔ اُس نے اپنی کتاب شاہ پورکان شاہِ ایران شاپور کے نام معنون کی تھی۔ مجوسیوں کے اکسانے پر شاپور کے جانشین بہرام اوّل نے مانی کو قتل کرا دیا۔ اُس

پر الزام یہ تھا کہ وہ ترکِ علائق اور تجرد کی دعوت دے کر معاشرۂ انسانی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ مانی اور اُس کے پیرو بلند پایہ خطاط اور مصوّر بھی تھے اور سونے چاندی سے اپنی کتابوں کو مزیّن کرتے تھے۔

مانی کے تعلیمات کے اثرات دُور رس ہوئے۔ عیسائیوں کا مشہور ولی آگسٹائن عیسائیت قبول کرنے سے پہلے مانی ہی کا پیرو تھا۔ عیسائیوں میں رہبانیت کا رواج بھی بُدھ مت اور مانی کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ایرانی مسلمانوں کے خیالات پر بھی مانویت کے اثرات ہوئے۔ مسلمان علما نے مانویہ پر زندیق ہونے کا فتویٰ دیا اور انہیں چُن چُن کر قتل کیا گیا۔ مانی کا کردِش، جابر و قاہر اہرمن ادبیات میں نفوذ کر گیا۔ ملٹن کا باغی شیطان اور اقبال کا ابلیس اُسی کے عکس ہیں۔

مانا

مانا کا تصوّر اکثر وحشی قبائل میں شروع سے موجود رہا ہے۔ کوڈرنگٹن نے میلانیشیا کے قبائل کے حوالے سے اس کی تشریح کی ہے وہ کہتا ہے کہ اُن کے عقیدے کے مطابق مانا ایک قسم کی فوق الفطرت اور ہمہ گیر توانائی ہے جو اشیا، اور اشخاص میں نفوذ کر جاتی ہے۔ اِسی کے طفیل کسی شخص یا شے میں غیر معمولی قوّت پیدا ہو جاتی ہے۔ کوڈرنگٹن کے انکشافات پر تبصرہ کرتے ہوئے ژنگ نے کہا کہ مانا کا تصوّر ہماری نفسیاتی توانائی کے تصوّر کا پیش رَو ہے بلکہ تمام توانائی کا مثیل ہے۔ اِس کا تعلق ارواح کے مسلک سے ہے جس کی رُو سے بادلوں، درختوں، جھیلوں، دریاؤں، طوفانوں وغیرہ کو ذی رُوح سمجھا جاتا تھا۔ میلانیشیوں کے خیال میں سردارِ قبیلہ، طبیب یا جادوگر میں مانا یا توانائی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔

ماورا واقعیت

بیسویں صدی کی ایک فنّی و ادبی تحریک جس میں شاعر یا فن کار اپنے تحت شعور کو خیالی تصاویر کے وسیلے سے پیش کرتا ہے۔ ایسے فن پارے کے نقوش بالکل ویسے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ خواب میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نقوش بظاہر بے ربط ہوتے ہیں لیکن عُلمائے نفسیات کے خیال میں اِن میں مخفی ربط و تعلق ہوتا ہے۔

مثالیت پسندی

افلاطون مثالیت پسندی کے فلسفے کا عظیم شارح تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اَمثال کا عالم حقیقی ہے!

اِس دنیا کی اشیاء امثال ہی کے عکس ہیں۔ امثال ازلی و ابدی ہیں۔ عالمِ مادی میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں امثال پر اُن کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ افلاطون عقلیت پسند ہے کیوں کہ اُس کے خیال میں امثال حسّی تجربے اور مشاہدات سے بے نیاز اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں جن کا ادراک عقلِ استدلالی ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ افلاطون کی مثالیت پر فیثاغورس، سُقراط، پارمی نائڈیس اور ہیریقلیتس کے اثرات نمایاں ہیں۔ فیثاغورس سے اُس نے حیات بعد ممات، ریاضیات کی اہمیت اور عقل و عرفان کے امتزاج کے تصوّرات لئے، پارمی نائڈیس سے اُس نے یہ خیال اخذ کیا کہ حقیقت ازلی و ابدی ہے اور تغیرات فریبِ نظر ہیں۔ ہیریقلیتس سے یہ عقیدہ مستعار لیا کہ عالمِ حواس یا عالمِ مادّی کی ہر شئے تغیر پذیر ہے اور اس عالم میں کسی بھی شئے کو بقا و قرار میسّر نہیں ہے۔ پارمی نائڈیس کا یہ تصوّر لیا کہ عالمِ امثال میں تغیّر و تبدّل ممکن نہیں ہو سکتا۔ ان مختلف رنگوں کے دھاگوں سے جو خوبصورت قالین بُنا گیا وہ افلاطون کا اپنا ہے۔ اخلاقیات میں وہ سُقراط کے اِس نظریے سے متاثر ہوا تھا کہ خیر، حُسن اور صداقت کی اقدار معروضی ہیں۔

ارسطو بھی مثالیت پسند تھا لیکن اُس کے افکار میں حقیقت پسندی کا عنصر موجود ہے۔ اُس نے کہا کہ امثال اشیاء سے ماوراء نہیں ہیں جیسا کہ افلاطون کہتا ہے بلکہ خود اُن کے بطون میں موجود ہیں؛ عالمِ مادّی غیر حقیقی نہیں ہے نہ محض امثال کا عکس ہے بلکہ حقیقی ہے اور امثال و اشیاء کا امتزاج حرکت و تغیّر کا باعث ہے۔

جدید مثالیت کا آغاز کانٹ سے ہوا۔ کانٹ کے نظریے میں عقل اور ارادے کے مابین مفاہمت نہیں ہو سکی چنانچہ اُس کے بعد مثالیت پسندی کی دو تحریکیں پہلو بہ پہلو صورت پذیر ہوئیں (۱) ـــــ جرمن عقلیاتی مثالیت پسندی (فشٹے، شیلنگ، ہیگل) جسے جرمن کلاسیکی مثالیت پسندی بھی کہا جاتا ہے۔ اِس میں خود آگاہ عقل یا ذہن کو حقیقتِ مطلق مانا گیا ہے (۲) ـــــ ارادیت پسندی جس کا بانی شوپنہائر ہے وہ اندھے آفاقی ارادے کو حقیقتِ مطلق قرار دیتا ہے۔ فشٹے کے نظامِ فکر میں موضوعی مثالیت پسندی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ برگساں، لائبنرے اور بارکلے مشہور مثالیت پسند ہیں۔ انگریزی مثالیتِ مطلق کے شارحین براڈلے، اور بوزنکوئے ہیگل کے پیرو تھے اور حقیقت کو کامل بالذات اور ہمہ گیر عقلیاتی تجربہ سمجھتے تھے۔ فوئر باخ اور کارل مارکس کی تنقید سے جرمن مثالیت پسندی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ الیوکن اس کا آخری مشہور شارح تھا۔

جدید فلسفیانہ رجحانات بالخصوص موجودیت اور جدلیاتی مادیت مثالیت پسندی کے خلاف ہیں۔

مُربّع

مُربّع کا لغوی معنیٰ ہے "بہار کا موسم گذارنے کی جگہ"۔

مُرکھت

مجزی کا انعام جو پنجاب کے دیہات میں چوری کا سراغ لگانے والے کو دیا جاتا ہے۔

مرزا

یہ لفظ امیرزا یا امیرزادہ کا مخفف ہے۔

مجوسیّت

زردشت کا مذہب جس کی مقدس کتاب اوستا ہے۔ سپنگلر کے خیال میں پیغمبرانہ تعلیم کا مرکزی خیال مجوسی الاصل ہے: خدا ایک ہے اُسے یہواہ کہا جائے یا اہورا مزدا یا مردوک بعل کا نام دیا جائے۔ وہی خیر کا اصول ہے، دوسرے تمام دیوتا خدا کے مقابلے میں عاجز ہیں، شر ہیں۔ اس تصور پر مسیحا کا پیوند لگایا گیا جس کی شکل یسعیاہ میں دکھائی دیتی ہے اور جو داخلی جبر کے تحت ہر کہیں اُبھرتا رہا ہے۔ یہی مجوسیت کا مرکزی خیال ہے کہ اس میں ضمنی صورت میں خیر اور شر کے مابین عالمی تاریخی کشمکش کا تصور موجود ہے یعنی شر درمیانی دَور میں کامیاب ہوگا اور خیر یومِ قیامت کو فتح یاب ہوگا۔ تاریخ کی یہ اخلاقی ترجمانی ایرانیوں، کالدیوں اور یہودیوں میں مشترک ہے اسی سے برگزیدہ اُمت کا سوال بھی پیدا ہوا۔ قیدِ بابل کے دوران میں سبت جیسے کالدی شعائر نے یہودیت میں بار پایا۔ شیطان، ملائکہ، ہفت بہشت، یوم قیامت کے تصورات ایرانیوں کے آفاقی احساس کی پیداوار ہیں۔ یسعیاہ میں یسوع کو مسیحا کہا گیا ہے۔ مجوسی پانچ یا تین نمازیں پڑھتے ہیں۔ نماز کو گاہ کہتے ہیں جس میں گاتھا کی آیات زمزمہ کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ آفتاب کی نیائش (دُعا) دن میں تین بار کی جاتی ہے: صبح، دوپہر، شام۔ وندیداد میں زردشت کے مذہب کے تین بنیادی اصول ملتے ہیں (۱) ـــ زراعت اور گلہ بانی شریف ترین پیشہ ہے (۲) تخلیق و تکوین کائنات خیر اور شر کے تصادم کے نتیجے میں ہوئی تھی (۳) ـــ عناصرِ اربعہ آگ، مٹی، ہوا اور پانی مقدس ہیں، انہیں آلودہ کرنا گناہ ہے۔ مجوسی کُتے اور سگِ ماہی کو مقدس جانتے ہیں۔ موت کے وقت

سگ دید کی رسم ادا کی جاتی ہے یعنی مرنے والے کے پاس ایک چار چشم کتا لایا جاتا ہے جسے دیکھ کر وہ دم توڑتا ہے۔ مجوسی آگ کو آفتاب کا مظہر جان کر اُس کی تقدیس کرتے ہیں اور اِسے بجھنے نہیں دیتے۔ نماز کے وقت آگ میں خوشبودار لکڑیاں پھینکتے ہیں۔ ان کے ہاں زمان کی حرکت مستقیم ہے یعنی وقت کا آغاز بھی تھا اور اُس کا انجام بھی ہوگا۔

مزدکیت

مزدک، ایران کا اشتمالی مصلح تھا جو شاہ کواذ کے عہد میں ظاہر ہوا۔ اُس کی تعلیم کا اصل اصول یہ ہے کہ لالچ، رشک اور حسد ہمارے تمام مصائب و آلام کے ذمّے دار ہیں۔ زر، زمین اور زن کے لالچ نے انسانی مساوات کا خاتمہ کر دیا ہے اور لوگ امیر اور غریب کے طبقات میں بٹ کر رہ گئے ہیں لہذا ذاتی املاک کا خاتمہ ضروری ہے اور ہر قسم کی پیداوار کا اشتراک لازم ہے۔ نولڈکے کہتا ہے کہ مزدکیت کو جو بات معاصر اشتمالیت سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مزدک مذہب کے نام پر ذاتی املاک کے خاتمے کا متمنّی تھا۔ مزدک نے افلاطون کی طرح عورت کے اشتراک کی بھی دعوت دی تھی۔ اِس کا عقیدہ تھا کہ ذاتی املاک اور عورت ہی اِنسان کے لالچ اور ہوس کے جذبات کو بھڑکاتی ہے۔ مجوسی ذاتی املاک کے تحفّظ کے قائل تھے۔ انہوں نے کواذ کے بیٹے خسرو (بعد کا انوشرواں) کو ساتھ ملا لیا اور بادشاہ کو مزدک سے بدظن کر دیا۔ اُن کے اُکسانے پر بادشاہ نے دھوکے سے مزدک اور اُس کے پیروؤں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور بڑی بے رحمی سے اُن کا قتلِ عام کرایا۔ ایک عیسائی پادری بازانس نے اِس قتلِ عام کا چشم دید احوال لکھا ہے۔ اباحتِ نسواں کی مزدکی روایت مسلمانوں کے بعض فرقوں میں نفوذ کر گئی۔ ان کا کھوج مقنّع اور ابو مسلم خراسانی کی تعلیمات میں لگایا جا سکتا ہے۔

مذہب

زاخو نے مذاہبِ عالم کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے (۱) الہامی (۲) سریانی۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام الہامی ہیں جن میں خدا فرشتوں کے واسطے سے اپنے برگزیدہ بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے؛ یونانی اِشراق اور ہندی ویدانت سریانی ہیں جن کی رُو سے خدا کائنات میں جاری و ساری ہے اور اِس سے الگ نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں یہ تقسیم اِس طرح کرنا زیادہ مناسب ہوگا (۱) ماورائی: خدا کائنات سے علٰحدہ ہے، خالق ہے، مختارِ مطلق ہے اور (۲) سریانی: خدا کائنات میں طاری و ساری ہے۔

مذہب کے اجزائے ترکیبی ہیں (۱)۔۔۔کسی فوق الطبع قوّت یا قوتوں پر عقیدہ رکھنا (۲)۔۔۔انہیں مقدّس سمجھنا (۳)۔۔۔اُن کی تالیفِ قلب کے لئے رسومِ عبادت ادا کرنا اور قربانیاں دینا (۴)۔۔۔مذہب کے دئیے ہوئے ضابطۂ اخلاق پر عمل کرنا ہے۔ جی فریزر نے مذہب کی تعریف میں کہا ہے کہ مذہب اُن فوق الطبع قوّتوں کی تالیفِ قلب کا نام ہے جو اہلِ مذہب کے خیال میں انسانی زندگی پر متصرّف ہیں۔ ہارٹ مان کہتا ہے کہ مذہب انسانی ذہن کی آرزوؤں اور تمناؤں کو ایسی خارجی قوتوں سے مربوط کرنے کی کوشش کا نام ہے جو فی الواقع اُس کی مطلق پروا نہیں کرتیں۔ قدیم مذہب کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے بعض اہلِ تحقیق نے کہا ہے کہ مذہب کی تخلیق موت اور فنا کے خوف سے کی تھی۔ انسان شروع سے موت سے خائف رہا ہے اور اُس پر قابو پانے کی تدبیریں سوچتا رہا ہے۔ اس خوف کا مداوا اُس نے ارواح کے مُت سے کرنے کی کوشش کی۔ وہ حالتِ خواب میں دیکھتا کہ اُس کی ملاقات مرے ہوئے عزیزوں سے ہوتی ہے جس سے اُسے یقین ہو گیا کہ وہ بھی مر کر زندہ رہے گا اور اُس کے اندر کوئی ایسی شئے مخفی ہے جو موت پر فنا نہیں ہو گی۔ اس شئے کو اُس نے رُوح کا نام دیا اور رُوح کی بقا کا یہ تصوّر مذہب کا سنگِ بنیاد بن گیا۔

ارواح کے مُت سے اجداد کی پُوجا اور دیوتاؤں کی پرستش کا آغاز ہوا اور وہ اُنہیں راضی رکھنے کے لئے قربانیاں دینے لگا۔ زرعی انقلاب کے بعد جہاں ریاست معرضِ وجود میں آئی وہیں پروہتوں نے مذہب کو منظّم کیا اور دیوتاؤں کے لئے معبد تعمیر کئے۔ مرورِ زمانہ سے کثرت پرستی کی جگہ وحدت کا تصوّر اُبھرنے لگا اور ایک ہی خدا وند خدا کو سب دیوتاؤں کا سردار تسلیم کر لیا گیا۔ موت کی دہشت سے نجات پانے کے لئے دیومالا اور مذہب کی صورت میں قدیم دَور کا انسان مظاہرِ کائنات سے جذباتی رشتہ قائم کرنے کا متمنّی تھا تاکہ اس وسیع اور بے کراں کائنات میں اُسے اپنی بے بسی اور اجنبیت کا احساس نہ ہو اور وہ اس خیال سے تقویت حاصل کرے کہ مظاہرِ کائنات اُس کے خیر خواہ ہیں۔ سائنس کی اشاعت کے بعد انسان اور مظاہرِ کائنات کے مابین اس جذباتی رشتے کو ٹھیس لگی ہے۔ علمِ ہیئت کے انکشافات سے کائنات کی بیکراں وسعتوں کا انکشاف ہوا ہے اور کرۂ ارض جسے مرکزِ کائنات سمجھا جاتا تھا ایک معمولی سے ستارے سورج کا ایک حقیر سیارہ بن کر رہ گیا ہے۔ سائنس کی تحقیقات کی روشنی میں انسان نے ہزاروں برسوں کے بعد از سرِ نَو سوچنا شروع کر دیا ہے کہ اس وسیع کائنات

میں اُس کا اصل مقام کیا ہے۔ رُومانی طبائع بدستور کائنات کے ساتھ جذباتی وابستگی کو قائم رکھنے پر اصرار کر رہی ہیں جب کہ حقیقت پسندوں نے اس جذباتی وابستگی کو بے ثمر جان کر رد کر دیا ہے اور اسی کرۂ ارض پر ایسا معاشرہ تعمیر کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہوگا اور جس میں ہر شخص کو اپنی جسمانی، ذہنی اور ذوقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملے گا اور جس میں وہ امکانی حد تک با مسرّت زندگی گذار سکے گا۔

سائنس نے مذہبی عقائد کو مجروح کر دیا تو مذہب کے نعم البدل کا سوال پیدا ہوا۔ برٹرنڈ رسل کے خیال میں جو لوگ مذہب سے بدظن ہو گئے ہیں اُن کے لئے علمِ ہیئت اس کا بدل ثابت ہو سکتا ہے اور جذبات کی تنقیح کے لئے موسیقی سے رجوع لایا جا سکتا ہے۔ اب رُوحانیت کی تعریف یہ کی جا رہی ہے کہ انسان دوستی کے نصب العین پر عقیدہ رکھنا، اُسے مُقدّس سمجھنا اور اس کی عملی تشکیل کے لئے جدّ و جُہد کرنا ہی رُوحانیت ہے۔

مزدور

فارسی میں مزد اُجرت کو کہتے ہیں۔ مزدور یعنی اُجرت پر کام کرنے والا۔

مسخرہ

اسی لفظ سے انگریزی لفظ ماسک بہ معنی نقاب اور ماسکوریڈ بہ معنی نقاب پوش تماشائیوں کا جمگھٹ لئے گئے ہیں۔

مسکوٹ

اگلے زمانے میں اپنے آپ کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے بادشاہ اپنے دربار میں کوئی بدصورت مسخرہ یا کُبڑا بونا رکھتے تھے جسے نظر بٹّو کہتے تھے یعنی نظرِ بد ہٹانے والا۔ شاہ عباس صفوی نے ایک کُرد لڑکا اپنا مسکوٹ رکھا ہوا تھا۔ آج کل اہلِ مغرب کی فوج میں رجمنٹ یا بریگیڈ کا ایک مسکوٹ ہوتا ہے جو عام طور سے کوئی حیوان یا پرندہ ہوتا ہے۔ یہ رسم طوطم منت سے یادگار ہے۔

مسمرازم

ڈاکٹر فرانز انطون مسمر نے ۱۷۶۶ء میں ایک کتاب شائع کی جس میں کہا کہ سیاروں کی گردش ایک ایسے غیر مرئی سیّال کے واسطے سے انسان کے بدن پر اثر انداز ہوتی ہے جس میں کائنات کی ہر شے ڈوبی ہوئی ہے۔ اُس نے اس چیز کو حیوانی مقناطیسیت کا نام دیا کیوں کہ یہ زندہ بدن پر اثر ڈالتی ہے اور عامل اسے ضبط میں

لا سکتا ہے۔ اسی عقیدے پر مسمرازم کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۴۱ء میں ڈاکٹر بریڈ نے انگلستان میں ہپناسس (نیند) کا طریقہ رائج کیا۔ عامل مریض پر نیند طاری کر کے اُس کا علاج کرتا تھا۔ یہ طریقہ بعد میں فرائیڈ نے تحلیل نفسی میں برتا اور پھر ترک کر دیا۔

مَشّائی

کا معنیٰ ہے چلنے پھرنے والا۔ ارسطو کے پیروؤں کو کہتے ہیں کیوں کہ ارسطو باغ میں ٹہل کر سبق دیا کرتا تھا۔

مُتعہ

مُتعہ تمتّع سے ہے جس کا معنیٰ ہے فائدہ اٹھانا۔ اصطلاح میں اس کا مطلب ہے طے شُدہ مدت کے لئے نکاح کرنا۔ اس مدت کے گذر جانے پر نکاحِ مُتعہ فسخ ہو جاتا ہے۔ مُتعہ کو صیغہ بھی کہتے ہیں جناب رسالت مآب اور خلیفۂ اوّل کے زمانے میں مُسلمان مُتعہ کیا کرتے تھے اور روایات میں ہے کہ بعض اوقات مُٹھی بھر جَو دے کر عارضی نکاح کر لیتے تھے خلیفۂ ثانی نے مُتعہ کو منسوخ کر دیا لیکن اکابر صحابہ کی ایک جماعت اسے جائز سمجھتی رہی۔

مُسلمان

فارسی والوں نے لفظ مُسلم کو بگاڑ کر مسلمان بنا لیا۔

معرض

معرض کا اصل مطلب ہے وہ خوشنما لباس جو لونڈیوں کو فروخت کے لئے کھڑا کرتے وقت پہنایا جاتا تھا۔

معقول

تعقّل سے ہے جس کا معنیٰ ہے اُونٹ کا گھٹنا رسی سے باندھنا۔ معقول جو رسّی سے بندھا ہو یعنی شائستگی کا پابند ہو۔ عقل وہ رسّی جو سرکش جذبات کو قابو میں رکھتی ہے۔

مغرب

غَرَبَ کا معنیٰ ہے "وہ دُور چلا گیا" سُورج ڈوبتے وقت دُور کسی جگہ کو چلا جاتا ہے۔ اِس لئے ڈوبنے کی سمت کو مغرب کہتے ہیں۔

مُغل مصوّری: ہندوستان میں آنے سے پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کو اپنے عم زاد

سلطان حسین بایقرا کے دربار میں اُستاد کمال الدین بہزاد کے شاہ کار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ تزک بابری میں اُس نے بہزاد کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ بابر ہندوستان آیا تو اپنے ساتھ کئی تصویریں بھی لایا۔ ہمایوں ایران سے لوٹا تو اس کے جلو میں کئی ایرانی مُصوّر تھے۔ میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبد الصمد شیرازی (بہزاد کا شاگرد) اور فرخ بیگ جیسے باکمال مُصوّر جلال الدین اکبر کے دربار کی زینت تھے۔ اِن مُصوّروں نے دربار کے ہندو مُصوّروں کی تربیت کی اور انہیں ایرانی خطاطی اور رنگ آمیزی کے رُموز بتائے۔ مرورِ زمانہ سے ایرانی اور ہندی اسالیب کے اِمتزاج سے مُغل مُصوّری تشکیل پذیر ہوئی۔ ہندوؤں میں مادھو، مکند، رام داس، بساون اور دسونت دربار سے وابستہ تھے۔ بساون اور دسونت نے خواجہ عبد الصمد شیرازی سے کسبِ فیض کیا تھا۔ مغل مُصوّری کی سب سے نمایاں خصوصیت شبیہ نگاری ہے۔ سلاطین اور روساء کی جو تصویریں ہم تک پہنچی ہیں اُن سے مُصوّروں کی نفسیاتی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کے چہروں میں شخصیت اور کردار کی انفرادی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جہانگیر سے پہلے یک رُخی تصویریں بنائی جاتی تھیں اُس کے زمانے میں سہ رُخی بننے لگیں جہانگیر خود بھی مُصوّری کے دقائق سے واقف تھا اور ماہرانہ رائے رکھتا تھا۔ نادر الزمان اور منصور نقاش اُس کے محبوب مُصوّر تھے۔ منصور نقاش کی بنائی ہوئی پرندوں اور جانوروں کی تصویریں نہایت دلآویز ہیں محمد نادر سمرقندی اور میر ہاشم کو شاہجہان کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان کی تصویروں کے چہرے اُستادانہ نگارش کے حسین نمونے ہیں مُغل مُصوّروں کو بین السطور کا کامل شعور تھا۔ اُن کے وسیع آسمان میں آوارہ بادل اِدھر اُدھر تیر رہے ہیں جن کے رنگ لحہ بہ لحہ بدلتے ہوئے لگتے ہیں۔ شفق کے مناظر میں سُنہرے، ارغوانی، سرمئی اور اُودے رنگوں کو بڑی نفاست سے استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے دھوپ اور چھاؤں کے اسلوب کو ایک نئے فنی تجربے کے طور پر پیش کیا تھا۔ ایرانی مُصوّری اس سے عاری تھی بعد میں راجپوت مُصوّری پر مغل مُصوّری کے گہرے اثرات پڑے۔

مُغیلان

اُم غیلان ہے یعنی بھوتوں کی ماں۔ کیکر کے درخت کو کہتے تھے۔ عربوں کا خیال تھا کہ اِس پر بھوت بسیرا کرتے ہیں۔ جس شخص کو باری کا بخار آتا تھا وہ کیکر کے درخت کے گرد سات بار دھاگا لپیٹتا تھا اور پھر اُس سے ہم کنار ہوتا تھا۔

مکران

یہاں پُرانے زمانے سے مچھلی کا شکار کرتے رہے ہیں۔ اِس کا اصل نام ماہی گیراں تھا جو بدل کر مکران ہو گیا۔

مُکلاوا

سندھی زبان میں موکل کا معنیٰ ہے اجازت۔ مُکلاوا یعنی دلہن کی رخصتی اِسی سے ہے۔

مغربی موسیقی

یُونانی موسیقی کے اِبتدائی اصُول فیثا غورس اور اُس کے پیروؤں نے بابلی اور مصری موسیقی کی روشنی میں مرتب کئے تھے۔ مصری موسیقی کی طرح یُونانی موسیقی میں بھی چھ سُور تھے۔ اطالیہ کے ایک راہب گائیڈو آرٹینو نے ۱۳ویں صدی میں ساتویں سُور کا اِضافہ کیا۔ یُونانی فلاسفر موسیقی کو اخلاق و کردار کی تربیت کے لئے اہم سمجھتے تھے۔ افلاطون نے کہا کہ موسیقی سے رُوح توافق سے اور عدل سے آشنا ہوتی ہے۔ جس شخص کے اِحساسات میں توافق ہو وہ نااِنصافی کا اِرتکاب نہیں کر سکتا۔ اُس کے خیال میں موسیقی نہ صرف اِحساس و کردار کی تہذیب کا باعث ہوتی ہے بلکہ صحت جسمانی کو بھی بحال رکھتی ہے۔

یُونانیوں کے مقبول ساز الغوزہ، بربط اور قانون تھے۔ ۱۸ویں صدی میں ایک اطالوی سٹریڈی ویریس نے وائلن کو جدید صورت بخشی۔ گائیڈو آرٹینو نے سب سے پہلے موسیقی کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے اِشارات وضع کئے۔ وینس کے ایک باشندے نے سپینیٹ کا ساز بنایا۔ ۱۷۲۰ء کے لگ بھگ باشولومو کرسٹوفوری نے اِس میں ایک نیا پُرزہ بڑھا دیا جس سے اِس کی آواز بلند اور پست کی جا سکتی تھی۔ اطالوی زبان میں پست یا مدھم کو پیانو اور بلند آواز کو فورتے کہتے ہیں چنانچہ اِس ساز کا نام پیانو فورتے رکھا گیا جس کا مخفف پیانو کہلایا۔ ۱۸ویں صدی کے وسط میں موسیقی کا شوق سارے یورپ میں عام ہو گیا۔ باخ نے ہلکے پھُلکے گیتوں کے ساتھ گمبھیر راگ بھی ایجاد کئے جو کلیسا کے مجمعوں کے لئے نہایت موزوں تھے۔ باخ ہی سے جدید موسیقی کا آغاز بھی ہوا۔ اِس کے بعد موتسارٹ نے موسیقی کو چار چاند لگائے اور اِسے حُسن اور دلآویزی بخشی۔ موتسارٹ کے راگوں میں اس قدر لطافت اور نزاکت ہے کہ اِن پر سُروں میں بُنی ہوئی جالیوں کا گمان ہوتا ہے۔ وین بیٹ ہوون (لغوی معنی ہے چقندر کے باغ والا۔ اِسے فان لکھنا درست نہیں ہے کیوں کہ یہ نژاداً ولندیزی تھا اور اپنے نام کے ساتھ وین لکھتا

تھا) نے جدید آرکسٹرا کی بُنیاد رکھی۔ اواخرِ عمر میں وہ بہرا ہو گیا تھا لیکن اِس عالم میں بھی اُس نے عظیم سمفنیاں لکھیں جن کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ واگنر، شوبرٹ، براہمز، مینڈل سوہن، ہینڈل بھی باکمال موسیقار تھے۔ پولینڈ کے موسیقار شوپن نے پیانو کے لیئے نہایت دلکش موسیقی لکھی۔ روس کے موسیقاروں گلنکا اور رِمسکی نے لوک گیتوں کا رَس کلاسیکی موسیقی میں سمو دیا۔ آج کل حبشیوں کے گانوں اور ناچوں سے مُستعار لی ہوئی موسیقی کا رواج یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے۔

ملامتی

صُوفیہ وُجودیّہ کا ایک بے قید فرقہ جسے قلندریہ بھی کہا جاتا ہے۔ ملامتیہ جان بوجھ کر ایسی زندگی گذارتے ہیں جو عام دُنیا داروں کو ناگوار گذرے۔ اُن کے خیال میں اُن کی بے شرع زندگی پر جو لعنت ملامت اُنہیں کی جاتی ہے اِس سے اُن کے ضبطِ نفس کو تقویّت اور نفس کُشی کی ترغیب ہوتی ہے۔ ملامتیہ کی ترکیب قرآن کی ایک آیت سے لی گئی ہے: ولایخافون فی اللہ لومۃ لائم (اور وہ ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے) ملامتیہ کہتے ہیں کہ گُناہ گار کو اپنی عاجزی اور فروتنی کا احساس ہوتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا ہے جس سے خدا کی رحمت جوش مارتی ہے اور وہ بخشا جاتا ہے۔ ملامتی اپنے خیال میں لوگوں کی نظروں میں رُسوا ہو کر اپنی حق پرستی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ملامتیہ کے مسلک میں بلا لحاظ رنگ، نسل، مذہب، مشرب سب انسانوں سے پیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں شاہ حسین اور بُلھے شاہ مشہور ملامتی ہو گذرے ہیں۔

مَلِک

لفظ مَلک کنعانیوں کے ایک دیوتا مولک سے یادگار ہے اور بادشاہ کے مفہوم میں آتا ہے۔ دوزخ کا نگہبان مالک بھی اِسی سے ہے۔

مِلّت

اِرامی زبان میں لفظ مِلّہ کا معنیٰ ہے لفظ، عربی میں مذہب و قوم کے مفہوم میں آیا ہے۔

مُکعبیت

جدید مُصوّری کا ایک اسلوب ہے جس میں تصویریں اِس طرح الکھٹی کی جاتی ہیں کہ وہ ہندسی

اشکال کا ایک گڈمڈ مجموعہ دکھائی دیتی ہیں۔ پکاسو اور سیزان نے بھی اِس میں تجربے کئے ہیں۔

مُفلس

مُفلس بہت ہی غریب آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس فلس (تانبے کا پیسہ) تک نہ ہو۔

مَنڈل

مقدس دائرہ، پُوجا کی جگہ جو ہندوؤں اور تبتیوں کے یہاں لیوتی کی علامت ہے۔ عامل اِس دائرے میں کھڑے ہوکر جنوں کی حاضرات کرتے ہیں اور اُن کی ضرر رسانی سے محفوظ رہتے ہیں۔ جادو کی رسوم میں بھی اِس دائرے کو اہم سمجھا جاتا ہے۔

مُنی

جین فرقے کے سادھو کو مُنی کہتے ہیں

موجودیّت پسندی

کانٹ نے وُجود اور موجود میں فرق کرتے ہوئے ایک مثال دی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ فرض کرو میری جیب میں دس ڈالر موجود ہیں۔ اِن دس ڈالروں کا وجود کہیں اور بھی ہو سکتا ہے، کسی بینک میں، کسی دکان میں، کسی اور شخص کی جیب میں لیکن اُن کا وُجود میرے لئے بے معنی ہے البتہ میری اپنی جیب میں دس ڈالروں کی موجودگی میرے لئے بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ میں اِن سے کھانا کھا سکتا یا کوئی کپڑا یا جُوتا خرید سکتا ہوں اِس طرح موجودگی کے ساتھ کسی فرد کے ذاتی جذبات و احساسات، اُمیدیں اور تمنّائیں وابستہ ہو جاتی ہیں جب کہ محض وجود اُسے قطعی مُتاثر نہیں کرتا۔ موجودیت کے پہلے شارح کیرک گرد نے جو ایک مذہبی آدمی تھا موجودگی کی مذہبی ترجمانی کی اور کہا کہ خدا کے وجود کا مجھ سے کوئی جذباتی رابطہ قائم نہیں ہو سکتا لیکن میں اُسے موجود سمجھوں تو میرا جذباتی تعلق اُس سے استوار ہو جائے گا اور وہ ایک زندہ موضوع کی حیثیت سے میرے دل و دماغ کو متاثر کرے گا چنانچہ یہی موضوعیت اور فردیّت موجودیت پسندی کا سنگِ بُنیاد ہے۔ کیرک گرد کا قول ہے کہ کوئی شخص جو موجود ہے اُسے اپنی موجودگی ہی کا علم ہو سکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ موضوع اپنی موضوعیّت ہی میں کھو جائے۔ اِسی موضوعیت کے باعث موجودیّت پسند اپنی ہی ذات کو اخلاق کا معیار بنا لیتے ہیں۔ یعنی جو میرے لئے خیر ہے وہی خیر ہے اور جو میرے لئے شر ہے وہی شر ہے نتیجتہً اخلاق کے سب معروضی معیار باطل ہو جاتے

ہیں اور ہر فرد کا اپنا مخصوص معیار بن جاتا ہے۔ کیرک گرد کی پیروی میں ژین پال سارتر نے کہا ہے کہ ہر شخص اپنی اخلاق قدریں خود تخلیق کرتا ہے، اپنے لئے کردار و عمل کی راہ خود متعیّن کرتا ہے، اسے وہ اِنسان پسندی کا نام دیتا ہے۔ یہ اِنسان پسندی تو ہے اِنسان دوستی نہیں ہے کیوں کہ اِس طرح فرد معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی اقدام نہیں کر سکتا بلکہ اپنی ہی ذات کے خول میں تختہ بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ اِنسان دوستی کی قدریں اِیثار، مُروّت، اِحسان، بے نفسی اور خدمتِ خلق اُس کے لئے بے معنی ہو جاتی ہیں اور وہ خود غرضی اور خود بینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیرک گرد اِنسان کے قدر و اختیار کا قائل ہے تاکہ ہر بات میں وہ من مانی کر سکے۔ وہ اپنی ذات پر خارج سے کسی نوع کی پابندی قبول نہیں کرتا۔ اِس کے لئے کسی ضابطۂ اخلاق و کردار کی پروا نہیں کرتا کہ اِس طرح وہ مجبور ہو جائے گا اور اپنا قدر و اختیار کھو بیٹھے گا۔

موجودیّت پسند عقل و خرد کی مخالفت اِسی بنا پر کرتے ہیں کہ وہ اُن کے جذبات و احساسات کے بے محابا اظہار میں مانع ہوتی ہے۔ کیرک گرد نے عقل کو "کسبی" کہا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ صرف پُر جوش جذبات کا اخذ کیا ہوا نتیجہ ہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ یاد رہے کہ موجودیّت پسندی کے تین پہلو ہیں۔

مذہبی ۔ کیرک گرد، جبریل مارسل، کارل جاسپرز

لا اَدری ۔ ہائڈگر

ملحدانہ ۔ ژین پال سارتر

کیرک گرد کی طرح کارل جاسپرز بھی سائنس کا مخالف ہے اور کہتا ہے کہ سائنس کے اِحاطۂ کار کو محدود سمجھنے ہی سے ہم موجودی فلسفے کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ اُس کے خیال میں فلسفہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں عقل ناکام اور درماندہ رہ جاتی ہے یا بالفاظ جاسپرز غرقاب ہو جاتی ہے۔ جبریل مارسل بھی کیرک گرد کا معتقد ہے اور خرد دشمنی میں اُس کا خوشہ چیں ہے۔ ہائڈگر نے موجودیّت کو مذہبیت سے قطعِ نظر کر کے اُسے خالص فلسفیانہ اور منطقی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ کیرک گرد کو محض ایک مذہبی مُفکّر مانتا ہے۔ ہائڈگر اپنے فلسفے کو اِنسان پسندی کا نام دیتا ہے اور اِنسان کے قدر و اختیار کا قائل ہے۔ اُس نے ازلی و ابدی اخلاق قدروں سے اِنکار کیا ہے۔ ژین پال سارتر اِلحاد کا مدّعی ہے۔ وہ سرمایہ داروں کا مخالف

ہے اور اپنے سیاسی و معاشی عقائد میں کارل مارکس سے مُتفق ہے۔ جہاں تک فرد کی آزادی کا تعلق ہے وہ مارکس سے اختلاف کرتا ہے۔ مارکس کے لئے معاشرے کی فلاح فرد پر مُقدّم ہے جب کہ ژیں پال سارتر فرد کو معاشرے پر مُقدّم جانتا ہے۔ سارتر نے اپنے نظریے کا اِثبات اُس تحریکِ مقاومت سے کیا تھا جو اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے جرمن فاتحین کے خلاف چلائی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اِس زمانے میں ہم موت یا زندگی میں کسی کا اِنتخاب کرنے میں آزاد تھے اور یہی آزادیٔ عمل اُس کی موجودیّت پسندی کا اصل اصُول ہے۔ اُس نے اپنے فلسفیانہ اِفکار کا اِظہار اپنے ناولوں تمثیلوں اور افسانوں میں بھی کیا ہے جس کے اثرات جدید ادبیات اور شاعری پر بڑے گہرے ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اِنسان کی کامل آزادی کا اعلان کیا جائے۔ اُس نے ہائڈگر کے عدم کو معروض سے موضوع میں منتقل کر دیا ہے، اِسے شعُور سے وابستہ کر دیا ہے اور کہا ہے کہ عدم انسان کے شعُورِ ذات ہی سے متفرّع ہوا ہے گویا جتنے انسان ہیں اتنے ہی عدم ہیں۔ یہ موضوعیّت کی اِنتہا ہے۔ اِسی موضوعیّت کے باعث اُس نے فرد کی کامل آزادی کو اخلاق کی اساس بنا دیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر مہمل ہے۔ جس کامل آزادی پر اُس کا اخلاق مبنی ہے وہ وحُوش کو تو میسّر آسکتی ہے لیکن انسان اُس سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا۔ انسان داخلی اور خارجی پہلوؤں سے مجبور ہے۔ سارتر کا اخلاق بے راہ روی کا دوسرا نام ہے۔ اُس کی خرد دشمنی، کلبیّت اور یاسیّت بھی اُس کی موضوعیّت ہی سے متفرّع ہوئی ہے۔ سارتر کے افکار نے فلسفے سے زیادہ ادب و فن کو متاثر کیا ہے۔ نوجوان باغی ادیبوں اور شاعروں کے لئے اِن نعروں میں بڑی کشش ہے کہ زندگی بے معنی ہے، کوئی اخلاقی قانون نہیں ہے، انسان مختارِ مطلق ہے، عشق و محبت محض واہمہ ہے، عورت غلافت کا پلندہ ہے۔

سارتر کی موضوعیّت، کامل قدر و اختیار اور آزادیٔ عمل کے باعث اُس کے افکار سرمایہ دار ممالک میں بڑے مقبول ہوئے ہیں اور اُس کے فلسفے سے مارکسیّت کے خلاف اِستدلال کیا جا رہا ہے۔ سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کو اِستحصال کی آزادی کا جواز سارتر کے افکار میں مل گیا ہے۔

مُورّخ

ابوریحان البیرونی کہتا ہے کہ لفظ مورّخ فارسی کے لفظ 'ماہ روز' کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ ماہ روز کا معنی ہے مقررہ ایام کے حالات قلم بند کرنا۔

مُوسل

لوہے کے گرز کو مُوسل کہتے تھے۔ پنجابی میں اناج چھڑنے کی موہلی۔

مَولی

سُرخ، سبز اور زرد رنگ کے دھاگوں کا بَنا ہوا لچھا جو بیاہ کے موقع پر نائی دُلہا کی کلائی پر باندھتا ہے

مہاجن

لغوی معنیٰ ہے بڑا آدمی (مہا: بڑا، جن: جنا، آدمی) سُود پر روپیہ اُدھار دینے والا۔

مُہانا

مُہانا، ملّاح، جھیور، ماچھی ایک ہی ذات ہے۔ مُہانا یا ملّاح کشتی رانی کرتے ہیں؛ جھیور پانی بھرتے ہیں اور ماچھی مچھلیاں پکڑتے ہیں۔

مِہرگان

عربی میں مہرجان ہے۔ ایران میں مہر (اکتوبر) کی سولھویں تاریخ کو مہرگاں کا تہوار مناتے ہیں۔ اِس روز آفتاب بُرجِ میزان میں آتا ہے اور موسمِ خزاں کا آغاز ہوتا ہے۔ ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ اِس روز تمام رُوحیں اپنے اپنے قالبوں میں آئی تھیں۔

مِہرگیا

ایک جڑی بوٹی ہے۔ ایرانیوں کے خیال میں جس کے پاس مہرگیا (پیار کی گھاس) ہو وہ جسے چاہے اپنے دامِ اُلفت میں گرفتار کر لیتا ہے۔ پنجابی کی "گِدڑ سنگھی" بھی یہی اثر رکھتی ہے۔

مِہرو

پنجاب میں بھینس کی نسل کو مِہرو کہتے ہیں۔

مِہمان

مِہ کا معنیٰ ہے بڑا، مان: ساز و سامان، عزت و وقار۔ مہمان یعنی بڑا معزز۔

مجاور: لغوی معنیٰ ہے قریب رہنے والا۔ اِصطلاح میں کسی ولی کی قبر کا متولی مراد ہے۔

میتھُن

سنسکرت کا لفظ ہے اِس کا معنیٰ ہے جنسی ملاپ۔ ہندو سنگ تراشی اور مصوّری کا مشہور اسلوب جس میں جنسی ملاپ کے مختلف آسن دکھائے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مندروں کھجوراہو، کونارک وغیرہ کے درو دیوار پر اِس اسلوبِ فن کے نمونے بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔

میزان

میزان (جس سے وزن کیا جائے) کا تصوّر جس کی رُو سے مُردوں کے اعمال نیک و بد کا وزن قیامت کے دِن کیا جائے گا مصرِ قدیم کی کتاب مُردگاں میں بھی موجود ہے۔ اِس میں دیوتا اوزیریس لوگوں کے اعمال تولتا ہے، مجوسیوں کے ہاں فرشتہ رِشنو اور ہندوؤں میں دیوتا یم کا یہی منصب ہے۔

میزوخیت

جنسی نفسیات کی اِصطلاح ہے جس کا مطلب ہے فریقِ ثانی کے ہاتھ سے بید وغیرہ کھا کر جنسی حَظ محسوس کرنا۔ یہ اِصطلاح ایک ناول نگار ساخر میزوخ کے نام سے لی گئی ہے جو اپنی بیوی سے بید کھا کر جنسی حَظ محسوس کیا کرتا تھا۔

مینا بازار

مغلوں کے عہدِ حکومت میں بیگمات یہ بازار سجاتی تھیں جس میں صرف بادشاہ اور شہزادے ہی بار پا سکتے تھے۔ اِس میں ہنسی مذاق میں اشیاء کے نرخوں پر تکرار کی جاتی تھی۔ اِس بازار میں بیگمات اپنے بیٹوں کے لئے لڑکیاں منتخب کیا کرتی تھیں۔

میر ہجڑی

میر ہجڑی ہیجڑوں کے سلسلے کا بانی تھا وہ زنانہ مزاج نوجوانوں کو ورغلا کر انہیں ہیجڑے بنا لیتا تھا اور اُن سے گانے بجانے کی کمائی وصول کیا کرتا تھا۔

ناتھ پنتھ

ناتھ یوگیوں کا مت جو پنجاب سے شروع ہو کر بنگال تک پھیل گیا۔ ناتھ یوگی اکثر و بیشتر محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اِنسانی مساوات اور اخوّت کا پرچار کیا، برہمنوں کی سیادت کو ردّ کر دیا اور اُمرا کی مخالفت کی۔ یہ ایک اصلاحی اِنقلابی تحریک تھی جو ذات پات کی تفریق کو مٹانے کے لئے چلائی گئی تھی۔ ناتھوں کی شاعری میں اِنسان دوستی کی تلقین کی گئی ہے۔ اُن کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے اُسے پنجابی شاعری کے ابتدائی نمونے سمجھا جا سکتا ہے۔ اُن کا ایک بلند پایہ شاعر چرپٹ تھا۔ گورو گورکھ ناتھ کے بارہ چیلے تھے۔ ان سے بارہ پنتھ یوگیوں کے جاری ہوئے۔ ۱۲ واں پنتھ مست ناتھیہ تھا۔ جعفریہ یوگیوں کا پنتھ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔

ناچ

ناچ ملاعبت کی ایک صورت تھی جس سے نر اپنی مادہ کو رجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مور کی مثال معلوم عوام ہے۔ آج بھی آسٹریلائی اور افریقی حبشی عورت کو لبھانے کے لئے ناچتے ہیں۔ آسٹریا کا والز اور ہسپانیہ کا فلین وانگو جنہیں کلاسیکی ناچ کہا جاتا ہے، جنسی ملاعبت ہی کی صورتیں ہیں۔ اِن کے شروع میں ناچنے والوں کی حرکات سبکپا ہوتی ہیں گویا یہ آغازِ محبت کا مرحلہ ہے۔ پھر جذبۂ عشق کی وارفتگی کے اظہار کے لئے ناچ میں تیز خرامی آجاتی ہے اور آخری مرحلے میں نقطۂ عروج کو دیوانہ وار تیزی سے ناچ ناچ کر دکھاتے ہیں۔ باقوامِ عالم کے ناچ لوک ناچوں ہی سے لئے گئے ہیں۔ ہندوستان کا بھارت نیٹم تامل نادو کی عورتوں کا ناچ ہے اور کتھا کلی کیرالا کے لوک ناچ سے ماخوذ ہے۔ یورپ اور امریکہ میں سامبا، ٹانگو، ٹوسٹ وغیرہ جو آج کل مقبول ہیں حبشیوں کے ناچوں سے لئے گئے ہیں۔ اِسی طرح بیلی ڈانس (رقصِ شکم) جس میں کمر اور کولہوں کو تیزی سے مٹکایا جاتا ہے اور جو عربوں کے ہاں رائج ہے قدیم زمانے میں افریقیوں کا لوک ناچ تھا جسے مصریوں نے اپنا لیا تھا۔

ناڈھو شاہ

ناڈھو شاہ گجرات میں ایک جلالی فقیر تھا جسے ہمایوں نے مرگھٹ کا چوکیدار مقرر کر دیا۔ لوگ مُردے جلانے کے لئے لاتے تو وہ انہیں بہت تنگ کرتا تھا اور غرور سے پیش آتا تھا چنانچہ پنجابی زبان میں اکڑ خاں کو ناڈھو شاہ کہنے لگے۔

ناگ پُوجا

ناگ کا لغوی معنی ہے "جو رینگ جائے" قدیم زمانے میں ناگ کو لِنگ کی علامت سمجھتے تھے اور بار آوری کے مسالک میں اِس کی پُوجا کی جاتی تھی۔ ناگ دیوتا ہندوؤں نے دراوڑی دیو مالا سے لیا تھا۔ ہندو دیو مالا میں ناگا زمین دوز مملکت بھوگ وتی میں رہتے ہیں شیش ناگ اور بعض روایات میں کرکوٹی اُن کا بادشاہ ہے۔ اِن کا اُوپر کا دھڑ اِنسان کا اور نچلا ناگ کا ہوتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق دُنیا کو شیش ناگ نے اپنے پھَن پر اُٹھا رکھا ہے۔ ساون کے مہینے میں جب ناگ کے ڈسنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے ناگ پنچمی کے نام پر اُس کا تہوار مناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ناگ کے مُنہ میں منکا — ایرانی اِسے مُہرہ مار کہتے ہیں — ہوتا ہے جو ناگ کے ڈسنے کا واحد علاج ہے۔ برصغیر میں ہر کہیں ناگ کی پُوجا کی جاتی ہے۔ صرف کشمیر میں سات سو معبدوں میں ناگ کے بُت رکھے ہوئے ہیں۔ شیش ناگ کی بہن کو منسا دیوی کے نام سے بنگال میں پُوجتے ہیں۔

ناقوس

سُوراخوں والا لکڑی کا گھڑیال جو مشرقی کلیسا والے عبادت گذاروں کو بُلانے کے لئے بجاتے ہیں۔
اِسے ایک موگری سے بجایا جاتا ہے جسے ربیل کہتے ہیں۔

نامزد بازی

ایران، افغانستان اور بلوچستان کے بعض علاقوں میں یہ رواج تھا کہ نوجوان اپنی منگیتر سے جنسی تعلق قائم کر لیتے تھے۔ اِسے نامزدی بازی کہتے تھے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ بیاہ ہونے پر دُلہن کے ساتھ دُلہا اپنا پہلوٹھی کا بچہ بھی ساتھ لے جاتا تھا۔

نانبائی

یہ لفظ نان (روٹی) اور آبا (شوربا) سے مُرکب ہے یعنی روٹی شوربا بیچنے والا۔

نثار: ایک سکہ جو قیمت میں چوّنی کے برابر تھا۔ جسے جہانگیر پر نچھاور کرنے کے لئے ڈھالا گیا تھا اس لئے نثار کہلایا۔

نظرِ بد

ایک عالمگیر توہم ہے خیال یہ ہے کہ رشک، لالچ اور حسد سے دیکھنے والے کی نظرِ بد لگ جاتی ہے۔ کبڑے، لنگڑے، کانے، بہرے، بدشکل، بے اولاد، بھینگے کی نظرِ بد سخت ضرر رساں ہوتی ہے کیوں کہ نقصِ اعضاء کے باعث وہ صحت مندوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں نظرِ بد سے بچانے کے لئے لمسن اور سُرخ مرچ سر کے گرد وار کر آگ میں پھینکتے ہیں۔ فیروزہ کو نظرِ بد کا موثر علاج سمجھا جاتا ہے۔ ایران میں بچوں اور گھوڑوں کے گلے میں فیروزے کی مالا آویزاں کرتے ہیں عورتیں اپنے چہرے پر فیروزی رنگ کے خال گدواتی ہیں۔ نظرِ بد کے اثر کو چشم زخم اور نظرِ بد رکھنے والی آنکھ کو چشم شور، چشم تنگ اور چشم زدہ کہتے ہیں۔ عورت کو پردے میں رکھنے کا ایک مقصد اُسے نظرِ بد سے بچانا بھی تھا۔ عرب میں خوبصورت مرد بھی اپنے چہرے پر لثام (نقاب) ڈالتے تھے۔ دلہا دلہن کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے سہرا باندھتے ہیں یا نقاب اوڑھاتے ہیں۔

نرگسیت

یہ ترکیب یونانِ قدیم کے ایک دیومالائی کردار نرسی سس (لغوی معنی ہیں نرگس کا پھول) کے نام پر وضع کی گئی ہے۔

نرسی سس ایک جوان رعنا تھا جس پر جنگل کی ایک پری ایکو فریفتہ ہو گئی لیکن وہ اُسے خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اپنے ہی حُسن و جمال کے زعم میں مست رہتا تھا۔ ایک دن جنگل سے گذرتے ہوئے وہ ایک چشمے پر پانی پینے گیا اور پانی میں اپنا عکس دیکھ کر اپنے آپ پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ کئی روز چشمے کے کنارے لیٹا اپنے ہی حُسن کے نظارے میں کھویا رہا۔ دیوتاؤں نے تنگ آکر اُسے نرگس کا پھول بنا دیا۔ جنسی نفسیات کی اصطلاح میں جو شخص اپنے ہی حُسن و جمال سے عشق کرنے لگے اُسے نرگسیت کا مریض سمجھا جاتا ہے۔ اَنانیت اور نرگسیت میں فرق کرنا ضروری ہے۔ نرگسیت میں جنسی عنصر لازماً موجود ہوتا ہے جب کہ انانیت اپنی اہمیت کے مُبالغہ آمیز احساس کو کہتے ہیں۔ نرگسیت کے مریض ذہنی لحاظ سے نابالغ ہوتے ہیں۔

نسناس

ایک بد روح جو ویرانوں میں رہتی ہے۔ اصل میں نصف الناس (آدھا آدمی) تھا۔

نعش

نعش کا اصل معنیٰ ہے "وہ تابوت جو اوپر کی طرف سے کھُلا ہو۔"

نفس ۔ عربی میں نفس کا معنیٰ رُوح اور سانس کے علاوہ خون کا بھی ہے اسی سے نفاس ہے یعنی وہ

خون جو بچے کی پیدائش پر زچہ کے جاری ہوتا ہے۔

نفسیاتی صحت مندی

نفسیاتی پہلو سے صحت مند رہنے کے تین اصول ہیں (۱)۔ اپنے آپ کو پہچانو (۲)۔ اپنے آپ کو جیسا کیسا پاؤ قبول کر لو (۳)۔ اُس کے مطابق زندگی گذارو۔ اِن میں پہلا مرحلہ سب سے مشکل ہے لیکن آدمی اپنا تجزیۂ نفس کر کے اپنے آپ کو جان سکتا ہے۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی دن یا رات کو سکون اور دلجمعی سے تنہائی میں بیٹھ کر اپنے خیالات جیسے کیسے کہ وہ ذہن میں وارد ہوتے ہیں قلم بند کرتا رہے۔ ایک ماہ کے بعد اُس کی ذات اِن تحریروں میں پوری طرح منکشف ہو جائے گی۔ اُسے اپنی خامیوں اور خوبیوں کا وقوف ہو جائے گا اور وہ اپنے طرزِ عمل اور اُس کے محرکات کو سمجھ سکے گا۔ اِس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو جیسا کیسا کہ وہ ہے قبول کرے گا۔ یہ بات اتنی آسان نہیں ہے آدمی کے لئے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو قبول کر لینا خاصا کٹھن ہے لیکن حقیقت پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے بارے میں حقائق کا خواہ وہ کتنے ہی تلخ ہوں سامنا کریں پہلے دو مراحل سے گذرنے کے بعد اپنے بارے میں جو انکشاف ہوئے ہیں اُن کے مطابق زندگی گذارنا آسان ہو جائے گا اور اِس طرح آدمی نفسیاتی صحت مندی سے بہرہ یاب ہو جائے گا اور اُن اُلجھنوں سے نجات پائے گا جو لاشعور میں دبی ہوئی ہر دم اُسے پریشان رکھتی ہیں، اُس پر بیٹھے بٹھائے افسردگی کے دَورے نہیں پڑیں گے اور ذہنی آسودگی اور سکون میسّر آ جائیں گے۔

نوائے باربد

باربد شاہ خسرو پرویز والئ ایران کا درباری گویّا تھا۔ اُس کا نظامِ موسیقی جو سات خسروانیات (شاہی طرزیں)۔ مسعودی نے مروج الذّہب میں انہیں الطّرق الملوکیہ لکھا ہے۔ تیس لحن اور تین سو ساٹھ راگنیوں پر مشتمل تھا، نوائے باربد کہلاتا ہے۔

نوبت

سلاطین کے محلوں کے صدر دروازے کے پاس دن رات میں سات وقت نوبت بجا کرتی تھی۔ نوبت میں نو چیزیں ہوتی تھیں۔ دو آدمی سیپا (شہنائی) بجاتے تھے جنہیں سیپانچیے کہتے تھے۔ دو نقارچی تھے (ایک مرسل دوسرا پہلو دار)۔ ایک سم تول یا جھانجھ بجاتا تھا۔ ایک قرنا نچیہ (قرنا بجانے والا) ہوتا تھا۔ ایک دماماً یعنی ڈھونسہ بجانے والا تھا۔ ایک باربدار

جو نقارے سینگ تا تھا اور اِن سب کی خدمت پر مامور تھا۔ ایک جمعدار ان سب پر ہوتا تھا۔ (سرمایۂ عشرت، صادق علی خاں)

نوروز

ماہ فروردین کا پہلا دن (۲۱ مارچ) جس روز آفتاب برجِ حمل کے نقطۂ اوّل میں داخل ہوتا ہے اور فصلِ بہار کی آمد ہوتی ہے۔ ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ اسی روز انسان اور دُنیا کو پیدا کیا گیا تھا۔ یہ تہوار بارہ دن جاری رہتا ہے۔ اِن ایام میں ہر طرف جشن اور سیر و تفریح کا سماں ہوتا ہے۔ لوگ عزیزوں، دوستوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں، چمنستانوں میں نکل جاتے ہیں اور خوشی مناتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع "سات سین" سے کی جاتی ہے: سیب، سمق، سنجد، سبزہ (پھل)، سرکہ، سمنو (مٹھائی)، سیر (لہسن)۔ نو روز پر شہنشاہ اکبر بارہ چیزوں میں تُلتا تھا: سونا، چاندی، ابریشم، خوشبویات، لوہا، تانبہ، جست، توتیا، گھی، دودھ، چاول اور ست بجا (سات اناج)۔ یہ سب فقیروں کو بانٹ دیتے تھے۔

نو اشراقیت

اِسے نو فلاطونیت بھی کہا جاتا ہے۔ فلاطینوس نے افلاطون کے اشراقی افکار کو نئے سرے سے مرتب کیا اس لئے اُس کے نظریے کا نام نو اشراقیت یا نو فلاطونیت رکھا گیا۔ فلاطینوس سکندریہ کا رہنے والا تھا۔ اُس کے نظریے کا حاصل یہ ہے کہ کائنات میں ذاتِ احد کے ماسوا کسی اور شے کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ کائنات اِس طرح بنی کہ پہلے ذاتِ احد سے عقل نکلی، پھر عقل سے نفس اور نفس سے مادے کا صدور ہوا۔ وہ تمثیلاً کہتا ہے کہ کائنات ذاتِ احد سے یوں نکلی جیسے سورج سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ جہاں آفتابِ حقیقی کی شعاعیں نہیں پہنچ سکیں وہ تاریکی مادہ بن گئی۔ روحِ انسانی مادے کی قید میں اسیر ہے۔ ریاضت، تجرّد اور مراقبے سے اِس قید سے نجات پا کر وہ اپنے اصل مبدیا ذاتِ احد میں واصل ہو جاتی ہے۔ اِسے فصل و جذب اور تنزّل (نیچے آنا) و صعود (اوپر جانا) کا عمل بھی کہتے ہیں۔ فلاطینوس کے افکار کو نو جلدوں میں مرتب کیا گیا۔ انہیں اینیڈز کہا جاتا ہے۔ اُس کے افکار شام کے عیسائیوں کے واسطے سے مسلمانوں کے افکار میں نفوذ کر گئے۔ دورِ عباسیہ میں فلسفے کی جو کتابیں شامی اور یونانی سے عربی میں منتقل کی گئیں اُن پر نو اشراقی حواشی کے پردے پڑے ہوئے تھے چنانچہ مسلمان فلاسفہ اور صوفیہ نو اشراقیت سے بہت متاثر ہوئے۔

نوشاہیہ

صوفیہ کا ایک فرقہ۔ اِن کے پیر حضرت نوشہ گنج بخش قادری ہر وقت دُلہا (نوشہ) جیسا لباس پہنے رہتے تھے

اس لئے اس سلسلے کو نوشاہیہ کہا گیا۔ یہ لوگ مجلس میں اچھا لباس پہن کر، ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو چکنا کر کے اور عطر پھلیل لگا کر شامل ہوتے ہیں۔ عورتیں بھی سج دھج کر آتی ہیں۔ انہیں دکھانے کے لئے عجیب طریقے سے حال کھیلتے ہیں یعنی اوّل تو سر مار کر دستار پھینک دیتے ہیں بعد ازاں الا اللہ کا نعرہ مار کر لوٹ پوٹ ہو کر بیہوش ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک آدمی اپنے ہاتھ اس کی کمر میں حائل کر کے اسے حال کھلاتا ہے کہ سر کو تا بکمر جھکا کر جھلاتا ہے۔ پھر اس مرید کے پاؤں میں رسی باندھ کر کسی درخت سے لٹکا دیتے ہیں، پھر وہ سر نیچے پاؤں اوپر کر کے لٹکا ہوا حال کھیلتا ہے اور نعرے مارتا ہے۔ (مولوی نور احمد چشتی، تحقیقات چشتیہ)

نیبو نچوڑ

ایک سرائے میں ایک مفت خورا ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا دستور تھا کہ کوئی مسافر دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھتا تو ایک نیبو لے کر اس کے سر پر جا پہنچتا اور کہتا حضرت سالن میں نیبو نچوڑ کر دیکھئے کیا لطف آتا ہے۔ وہ بے چارہ مروّت میں آکر اسے بھی کھانے میں شریک کر لیتا۔ اس سے طفیل خوار کو نیبو نچوڑ کہنے لگے۔ طفیلی یا طفیلیہ کی ترکیب کوفہ کے ایک شاعر طفیل کے نام سے یادگار ہے جو اسی طرح بہانے بنا کر ہر دعوت میں جا پہنچتا تھا۔

نیچر

لفظ نیچر کا معنیٰ ہے "جو جنم دیتی ہے"۔

نیگرو

حبشی کو نیگرو کہتے ہیں۔ نیگرو ہسپانوی زبان کا لفظ ہے جو لاطینی کے نائگر کی بدلی ہوئی صورت ہے جس کا معنیٰ ہے 'کالا'۔ ملک نائیجریا یعنی کالوں کا ملک۔

نوکر

منگولی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا اصل معنیٰ ہے ساتھی یا وہ سپاہی جو کسی خاص فوج سے وابستہ نہ ہو۔

نارد

ہندوؤں کی دیومالا میں نارد دیوتاؤں کا ایلچی ہے جس کا ذکر بہادرانہ کارناموں میں آتا ہے۔

و

وار

پنجابی شاعری کی مشہور صنف ہے جو وار (چوٹ، ضرب) یا وَیر (دشمنی) سے لی گئی ہے۔ وار میں بہادروں کے جَس (سنسکرت یش یعنی فتح) کے گیت گائے جاتے ہیں۔ جب کوئی سورما لڑائی میں شجاعت کا مظاہرہ کرتا تھا میراسی یا ڈھاڈی شعروں میں اُس کے کارنامے بیان کرتے تھے۔ وار کو پوڑیوں میں لکھتے تھے۔ وار کے مصرعے پوڑی کہلاتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں: داخلی اور خارجی۔ خارجی کا تعلق میدانِ جنگ سے ہے جب کہ داخلی میں آدمی کے لالچ، غصہ، حسد، خودی اور نفسانی خواہش کے خلاف کشمکش کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ چنڈی دی وار، ہاشم شاہ دی وار، تُنڈے اسرج دی وار، ہری سنگھ نلوہ دی وار مشہور و معروف ہیں۔

وِہار

گجراتی زبان میں وِہوَر (لین دین) کو کہتے ہیں۔ وہار، بیوپار، وپار، بوہرہ (تاجر) اسی سے ہے۔ عبداللہ داعی نے گجرات اور مالابار کے ہزاروں ہندوؤں کو مسلمان کیا تھا۔ بوہرے انہی کی اولاد سے ہیں۔

وِجدان

وِجدان کا لغوی معنیٰ ہے 'پالینا'۔ صوفیہ نفس انسانی کو دو شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک طرف عقل ہے جو مادی دُنیا کے عقدوں کو سُلجھانے کے کام آتی ہے، دوسری طرف وِجدان ہے جو ایک باطنی حاسہ ہے جس سے وجد و حال اور کشف و اِشراق کا تعلق ہے۔ برگساں نے کہا کہ جب جبلّت خود آگاہ ہو جائے تو وہ وِجدان بن جاتی ہے لیکن اُس کے ناقد کہتے ہیں کہ جبلّت کا خود آگاہ ہونا ہی اِس بات کی دلیل ہے کہ اِس میں عقل شمول ہے لہٰذا عقل و جبلّت سے الگ وِجدان کا کوئی وجود نہیں ہے اور وِجدان کسی صورت

میں عقل سے برتر نہیں ہے۔

وحدت الوجود

وحدت الوجود کا اساسی تصور یہ ہے کہ کائنات میں ایک ہی اصل اصول کارفرما ہے، کثرت جو ہمیں بظاہر دکھائی دیتی ہے ہماری اپنی نظر کا فریب ہے۔ وجود حقیقی ایک ہے اس کے سوا جو کچھ بھی ہے اُس کا وجود اعتباری ہے۔ فلسفے میں یہ نظریہ سب سے پہلے یونان قدیم کے ایک فلسفی پارمی نائڈیس نے پیش کیا تھا۔ اُس کے بعد زینو رواقی اور فلاطینوس نو اشراقی نے اِس کا احیاء کیا۔ ہندوؤں میں شنکر اچاریہ نے ویدانت کی صورت میں اُپنشدوں کے منتشر وجودی افکار کو مرتب کیا اُس نے کہا کہ برہمن ہی کائنات ہے، وہی حقیقی ہے، اِس کے ماسوا سب کچھ مایا (فریبِ نگاہ) ہے۔ اِس نظریے کو احدیت یا ادویت واد (دو نہ ہونا) بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اِس کے مشہور شارح ہیں۔ انہوں نے وحدت الوجود کے اثبات میں یہ دلیل دی ہے کہ صفات ذات کی عین ہیں، کائنات صفات کی تجلی ہے لہٰذا کائنات بھی عین ذات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وجودِ مطلق سے علیحدہ جو شئے بھی ہے وہ معدوم ہے یعنی اُس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔ اُن کا اجتہاد یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے مسلمان متکلمین کی طرح فلاطینوس کا نظریۂ فیض و جذب قبول نہیں کیا بلکہ اُس کی بجائے اعیانِ ثابتہ سے تکوینِ کائنات کی تشریح کی۔ اعیانِ ثابتہ وہ معلومات ہیں جو خدا کے ذہن میں پہلے سے موجود ہیں اور اُن کے فیضان سے اِس جہان کی اشیا کے رُوپ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ابن عربی کی وحدت الوجود کی ترجمانی کا حق عبدالکریم الجیلی، عراقی، ابن الفارض، رُومی، عطّار، جامی وغیرہ نے ادا کیا ہے۔ اکثر مسلمان صوفیہ وجودیہ ہیں تصوّف اصلاً وحدت الوجود ہی کا دوسرا نام ہے۔

وَرتن بھانجی

پنجابی دیہات کا معاشرہ قدیم زمانے سے وَرتن بھانجی کے اصول پر قائم رہا ہے۔ وَرتن بھانجی کی ترکیب کا مطلب ہے تحفوں کا تبادلہ کرنا۔ شادی بیاہ یا موت فوت کے موقع پر عزیز، رشتے دار اور دوست ایک دوسرے کی عملی امداد کرتے ہیں۔ لڑکی کی شادی پر تمام رشتے دار اور متعلقین اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اُس کے لئے بیور (دو کپڑوں کا جوڑا) تریور (تین کپڑوں کا جوڑا) اور چھوٹا موٹا زیور لاتے ہیں کیوں کہ

وہ اپنی لڑکیوں کے بیاہ پر دُلہن کے والدین سے اِسی قسم کے تحفے لے چکے ہوتے ہیں۔ اِن تحائف کو بھاجی کہتے ہیں۔ اِس کی تہہ میں باہمی تعاون کا اصول کارفرما ہے دیہاتی عام طور سے غریب ہوتے ہیں اِس لئے بیاہ کے موقع پر بری یا جہیز کا سامان ایک ہی دفعہ نہیں بنا سکتے۔ چنانچہ جن لوگوں کو انہوں نے بیاہ پر جوڑے دیئے ہوتے ہیں وہ اُن کے لئے ایسے ہی یا اِن سے بڑھیا جوڑے لاتے ہیں جس سے بغیر کسی خاص تردد کے بری یا جہیز تیار ہو جاتا ہے۔ بہنیں اور پھوپھیاں جوڑے لاتی ہیں تو دُلہا کے گھر والے انہیں ان سے بڑھ چڑھ کر قیمتی جوڑے اور زیور دیتے ہیں کیوں کہ اُن کے حقوق میکے پر ہمیشہ برقرار رہتے ہیں اسی طرح مٹھائی بانٹنے یا کھانا پکانے کی بھاجی ہوتی ہے متعلقین میل یا بارات کا ایک وقت کا کھانا پکاتے ہیں۔ موت پر بھی رشتہ دار باری باری کھانا دیتے ہیں کیوں کہ جس گھر میں موت ہوئی ہو وہاں عزاداروں کا جمگھٹ ہوتا ہے اور گھر والے ماتم میں مصروف ہوتے ہیں موت کے پہلے دن کے کھانے کو جو عموماً دال روٹی پر مشتمل ہوتا ہے 'کوڑا وٹہ' کہتے ہیں۔ اِسی امدادِ باہمی یا وَرتن بھاجی کے باعث غریب اور نچلے متوسط گھرانوں کا بھرم رہ جاتا ہے اور کوئی خاص اہتمام کئے بغیر اُن کی خوشی یا غم کی تقریبات تکمیل کو پہنچ جاتی ہیں۔

وسمہ

نیل کی قِسم کا ایک پودا ہے جس سے خضاب تیار کرتے ہیں۔

وطن

لفظ وطن کا لغوی معنیٰ ہے " جائے پیدائش "۔

وفات

لفظ وفات کا لغوی معنیٰ ہے " قرض ادا کرنا "۔ اِصطلاح میں: موت۔

وَل

وَل کا معنیٰ ہے لپیٹ جانا، ڈھانپ لینا، گھیر لینا۔ ویلن اِسی سے ہے، ویل (ریل) جو مُنڈیر کو ڈھانپ لے۔ ولا واں دینا یعنی لپیٹ دینا۔ لاطینی میں فرج کو ولوا کہتے ہیں کیوں کہ وہ ڈھکی ہوتی ہے۔ جرمن میں بھی لفظ ویلا ہے۔

وَلوَلہ

عربی میں اِس کا معنیٰ ہے "چیخ چیخ کر گانا"۔

ویدانت

ویدانت کا لغوی معنیٰ ہے "وید کا آخر" یعنی اُپنشد جو ویدوں کے بعد لکھے گئے تھے۔ اُپ نشد کا معنیٰ ہے "قریب بیٹھنا" یا گرو سے باطنی تعلیم حاصل کرنا۔ اُپنشدوں سے پہلے برہمنوں میں بھی حقیقت مطلق کا ذکر تت ایکم (وہ ایک) کے الفاظ میں آیا ہے۔ چھاندوگیہ اُپنشد میں پہلی بار کثرت اور دوئی کو فریبِ نظر کہا گیا ہے۔ اُپنشد تعداد میں ایک سو سے متجاوز ہیں۔

ویدانت کا قدیم ترین تصوّر بادرائن (۲۰۰ ق م) کے برہم سُوتر یا ویدانت سُوتر میں ملتا ہے جس میں اُپنشدوں کے منتشر خیالات کو منطقی صورت میں پیش کیا گیا گوداپد نے اِس کی شرح لکھی اور گودند کو اس کے رُموز سمجھائے۔ شنکر اچاریہ اِسی گودند کا شاگرد تھا۔ شنکر کے نظریّے کو ویدانت کہا جاتا ہے۔ اُس کے خیال میں برہمن ہی حقیقی ہے، عالمِ مادی فریبِ نگاہ ہے۔ وہ اوِدیا یا اُجنانا (جہالت) کو مایا کہتا ہے۔ اُس کے خیال میں عقل اور حِسیّات حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ جو شخص اِس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ برہمن اور آتما (شخصی رُوح) اصلاً ایک ہیں تو وہ سنسار چکّر سے نجات پا لیتا ہے۔ اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ تت توَم اَسی (وہ تُو ہے)۔ مایا اور مُکتی کے یہ تصورات بُدھ مَت سے ماخوذ ہیں۔ ویدانت سُوتر میں پُرش اور پرکرتی الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی وجودِ مطلق (برہمن) سے نکلے ہیں۔ برہمن عین کائنات ہے۔ ویدانت کا دوسرا مشہور شارح رامانج شنکر کے برعکس شخصی خُدا کا قائل ہے۔

وگتی

ہزارے بعض اوقات گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے رہتے ہیں اور فی البدیہہ ہجو کہتے ہیں۔ پنجابی دیہات میں یہ رسم ہزارہ سے آئی۔ اِسے وگتی کہتے ہیں۔ جھنگ اور ملتان میں اِس کا رواج ہے۔

ہ

ہاروت ماروت

آرمینیہ کی دیومالا میں ہوروت موروت آیا ہے۔ ہمارے یہاں روایت یہ ہے کہ یہ دونوں فرشتے بابل کی حسین رقاصہ زہرہ کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے تھے کہ خود اُس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے۔ اِسی گناہ کی پاداش میں انہیں چاہِ بابل میں سر کے بل لٹکا دیا گیا۔

ہانگ کانگ

اس کا لفظی معنیٰ ہے "خوشبودار ندی"۔

ہڑپائی تمدن

حال ہی میں یونیسکو کی ایک جماعت نے پنجاب کے علاقے پوٹھوہار میں کئی مقامات پر کھدائی کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا ہے پنجاب میں حیوان نما انسان آج سے اسّی لاکھ سے ایک کروڑ تیس لاکھ سال قبل مسیح کے درمیان رہتا تھا۔ یہ نتیجہ ہڈیوں کے اسّی نمونوں کی روشنی میں نکالا گیا ہے جن کے آثار پوٹھوار سے ملے ہیں۔ اس حیوان نما انسان کو پنجابیسکس کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ پوٹھوار میں افریقہ اور جاوا سے پہلے پنجابیسکس موجود تھا۔ ہڑپائی تمدن کی کڑیاں براہِ راست انسانی ارتقاء کے اِس عمل سے وابستہ ہیں۔ یہ تمدن کوہ شوالک سے لے کر دریائے تاپتی اور نربدا تک اور کوئٹہ سے لے کر بیکانیر (راجستھان) اور کاٹھیاوار تک کم و بیش گیارہ سو مربع میل کے رقبے پر محیط تھا۔ اِس کے بڑے شہر دو تھے ہڑپہ (ضلع ساہیوال، پنجاب) اور موئن جودڑو (ضلع لاڑکانہ، سندھ)۔ ان کے علاوہ چنہو دڑو (ضلع نواب شاہ)، روپڑ (مشرقی پنجاب) رنگ پور، ہالار (کاٹھیاوار)، کالی بنگن (راجستھان)، شاہی ٹمپ (وادی کیچ مکران) کے شہر بھی اسی تمدن کے گہوارے تھے۔ اِس تمدن کے عروج کا دور ۲۳۰۰ـــ۱۷۵۰ ق م کا تسلیم کیا گیا ہے۔ اِس کا رابطہ صدیوں تک عراق کی سرزمین سے برقرار رہا اَب

یہ حقیقت مُسلّم ہو چکی ہے کہ ہڑپائی تمدّن مصر اور سُمیریا کے ساتھ دُنیا کا تیسرا قدیم ترین تمدّن ہے۔ بحیرۂ رُوم کی نسل سے تعلق رکھنے والے قبائل درۂ بولان کے راستے ۲۹۰۰ ق م میں وادیٔ سندھ میں وارد ہوئے اور اُن کے مُلکی باشندوں کے ساتھ اختلاط سے دراوڑی نسل صورت پذیر ہوئی جس کے تمدّن کو ہڑپائی کا نام دیا گیا۔ ہڑپہ اور موئن جوڈرو کے شہروں کی کھدائی سے اِس عظیم تمدّن کا انکشاف ہوا ہے۔ دراوڑ وسیع علاقوں میں کھیتی باڑی کرتے تھے اور چاول، گندم، کپاس، جَو، سَن، تیل نکالنے والے بیج، جوار، باجرہ اور مٹر اُگاتے تھے۔ تاریخ عالم میں پہلی بار چاول اُگانے کی شہادت ہڑپّہ ہی سے ملی ہے۔ اِسی طرح کپاس کی کاشت اور سُوتی کپڑا بُننے میں بھی دراوڑوں کو اولیت دی گئی ہے۔ دراوڑ گائے بیل، بھینس، بھیڑ بکریاں اور مُرغیاں پالتے تھے۔ اُن کی مُعیشت میں بھینس کو وہی اہمیت حاصل تھی جو آج بھی پنجاب کے دیہات میں اُسے میسّر ہے۔

دراوڑ نہایت سلیقے سے منصوبہ بندی کر کے اپنے شہر تعمیر کرتے تھے اور آویوں میں پکائی ہوئی پختہ اینٹیں چُنائی میں استعمال کرتے تھے۔ اُن کے پانی کے نکاس کا عُمدہ اِنتظام تھا جس سے ایک اعلیٰ ترقی یافتہ بلدیاتی نظام کا ثبوت ملتا ہے۔ غلّہ ذخیرہ کرنے کے لئے اُن کے یہاں بڑے بڑے مودی خانے موجود تھے جن سے اُن کی خوشحالی کی شہادت ملتی ہے۔ اُن کی اجناس اور سُوتی کپڑے سے لدی ہوئی کشتیاں عراق کے شہروں کو جاتی تھیں۔ کپڑا بُننے کے علاوہ اُن کی بڑی صنعتیں ظروف سازی اور مُہر کنی کی تھیں۔ وہ چاک پر برتن بناتے تھے اور اُن پر نارنجی رنگ کے پھول بُوٹے بنا کر پُختہ کر لیتے تھے۔ عام طور سے برتنوں پر پیپل کے پتّے اور مور کے نقوش بنائے جاتے تھے۔ وہ لوہے سے نا آشنا تھے اور اپنے اوزار، ہتھیار اور زیور کانسی کے بناتے تھے، کانسی کے خوبصورت مُجسّمے بھی ڈھالتے تھے۔ اِن میں بھینس، مینڈھے اور ناچنے والی لڑکی کے مجسّمے نہایت خوبصورت ہیں۔ عورتوں کے زیوروں میں سونے چاندی، کانسی، تانبہ، عقیق، ہاتھی دانت کے بنے ہوئے کنگن، مالا، نتھ، گلو بند وغیرہ مِلے ہیں۔ سُرخ پتھر سے تراشے ہوئے خوبصورت مُجسّمے دستیاب ہوئے ہیں۔ اُن کی مُہروں پر جو علامتیں کھدی ہوئی ہیں وہ اُن کے رسم الخط سے تعلق رکھتی ہیں جنہیں ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا۔ ہڑپّہ اور موئن جو ڈرو میں تول کے باٹ ملے ہیں جو ہر کہیں ایک ہی وزن کے ہیں۔

ہڑپائی معاشرہ مادری اُصول پر مبنی تھا یعنی اُس میں عورت کو مرد پر برتری حاصل تھی اور بار آوری

کاشت چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ اس مت میں لنگ اور مہامیا کی پوجا کی جاتی تھی تاکہ زمین کی زرخیزی کو تحریک ہو۔ مہروں پر تین چہروں والے ایک دیوتا کی شبیہہ ملی ہے جو یوگیوں کے خاص آسن سمادھی میں ایڑیاں ملا کر اور بازو پھیلا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے سر پر ترشول (سہ شاخہ عصا) کا نشان ہے۔ یہ دیوتا شیو کی اصل ہے جو بعد میں ہندو یوگیوں کا دیوتا بن گیا تھا۔ بعد کے کرشن اور کالی دیوی دراوڑوں ہی سے لئے گئے ہیں۔ ناچنے والیوں کے مجسّموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ہاں ناچنے گانے کے فنون ترقی یافتہ صورت میں موجود تھے۔ یہ ناچنے والیاں بعد کی دیوداسیوں کی پیش رَو تھیں۔

۲۱۰۰ ق م میں ہڑپائی تمدّن عروج پر تھا۔ اس کے بعد پے درپے سیلابوں اور آریائی حملوں نے اُسے زوال پذیر کر دیا۔ آریائی ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ وادئ سندھ میں داخل ہوئے اور دراوڑوں پر غالب آ گئے۔ انہوں نے ہزاروں دراوڑی عورتیں گھروں میں ڈال لیں جس نے اُن کے طرزِ معاشرت، عادات و اطوار، مذہبی رسوم اور زبان کو متاثر کیا۔ نووارد آریا اجڈ چرواہے تھے جو تہذیب و تمدّن کے برکات سے ناآشنا تھے، انہوں نے دوسرے کوہستانی اور صحرائی فاتحین کی طرح اپنے مفتوحین کے تمدّن کو اپنا لیا چنانچہ یوگا، ویدانت، فنِ تعمیر، سنگ تراشی، بھگتی شاعری، جاتک کہانیاں، ترمورتی، سمادھی، نٹ راج وغیرہ کے فنی اسالیب دراوڑوں ہی سے لئے گئے تھے۔ عورت کی مرد سے اظہارِ محبت میں پہل کی روایت دراوڑوں کے مادری نظامِ معاشرہ سے یادگار ہے بھگتی شاعروں کے کلام اور برصغیر کے لوک گیتوں میں یہ روایت صدیوں سے پنپ رہی ہے۔ آج کل ہندوؤں میں لنگ اور یونی کی پوجا ذوق و شوق سے کی جاتی ہے اور سانپ کو لنگ کی علامت سمجھ کر پوجا جاتا ہے۔ یہ روایت دراوڑی مذہب کی باقیات میں سے ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت رام اور کرشن کی پوجا کرتی ہے جیسا کہ پنڈت رادھا کرشنن نے کہا ہے کرشن (لغوی معنیٰ ہے کالا) سفید فام آریاؤں کا دیوتا نہیں ہو سکتا تھا۔ کالی دیوی کے ساتھ اسے بھی ہندوؤں نے دراوڑوں سے لے کر اپنی دیومالا میں شامل کر لیا۔

مندرجہ بالا حقائق سے مفہوم ہوتا ہے کہ برصغیر کی موجودہ تہذیب و تمدّن پر دراوڑی تمدّن کی گہری چھاپ موجود ہے۔ کالنس کے اس قدیم و عظیم تمدّن کی روایات ہمارے یہاں کمہار کے چاک، پڑ ادے، ظروف سازی، کاشت کاری کے طریقوں، بیل گاڑی، بھینس پالنے، گندم، گنّا، کپاس، چاول، تیلوں کے بیج اُگانے، پارچہ بافی اور لباس

کی تراش خراش سے لے کر برِ صغیر کے موسمی تہواروں ـــ بیساکھی، ہولی، بسنت پنچمی، ناگ پنچمی وغیرہ ـــ لوک جیون، لوک گیتوں، رسوم معاشرہ، گانے اور ناچ، جاتک کہانیوں، زبانوں اور بولیوں، بھوت پریت کے تصوّرات، جادو کے ٹونوں ٹوٹکوں، بھگتی شاعری، سنسار چکر، یوگا، درختوں کی پوجا، فنِ تعمیر، سنگ تراشی کے اسالیب، تنترمت، شکتی پوجا، ناگ پوجا، لنگ پوجا، شیو بھگتوں، کرشن بھگتوں اور شاکتوں کے مذہبی شعائر میں باقی و برقرار ہیں۔

ہسٹیریا

ہمارے طبیب اسے بجا طور پر اختناق الرحم کہتے ہیں۔ یہ ترکیب یونانی لفظ ہسٹور (رحم) سے مشتق ہے۔ بقراط (ہپوقریطیس) کا نظریہ یہ تھا کہ جو عورت بھرپور جنسی تشفّی سے محروم رہتی ہے وہ ہسٹیریا میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس خیال کو آج کل کے ڈاکٹر اور علمائے نفسیات جنسی بڑی اہمیت دے رہے ہیں۔

ہمّت

عربی میں ہمہمۃ شیر کی آواز کو کہتے ہیں۔ ہمت اور ہمام (اولوالعزم بادشاہ) کے الفاظ اسی سے ہیں۔

ہُن

(۱) سونے کا ایک سکہ جو گول ہوتا تھا۔ اسے پگوڈا بھی کہتے تھے (۲) ہن وسط ایشیا کا ایک وحشی قبیلہ تھا جس کا ایک نام ہتپالی تھا۔ انہوں نے پنجاب میں سکالا (سیالکوٹ) کو اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ یورپ میں وہ دور دور تک بڑھتے گئے اور پے درپے حملوں سے روم کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ ان کا سردار اٹیلا (آتیلا) نہایت خونخوار تھا۔ ہنگری کے ملک کا نام ہنوں ہی سے یادگار ہے۔

ہندسہ

جیومیٹری کے معنوں میں لفظ ہندسہ فارسی کے لفظ اندازہ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

ہم جنسیت

مرد کی مرد اور عورت کی عورت سے جنسی پیار کرنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کا آغاز مصر قدیم سے ہوا تھا۔ عزا کے معبد میں ہیجڑے پجاری رہتے تھے جن سے زائرین تمتّع کرتے تھے کنعان میں سدوم اور عمورہ کے شہروں میں قحبہ خانے موجود تھے جن کی سرپرستی امرا کرتے تھے۔ لفظ سدومی اسی زمانے سے یادگار ہے۔ یونانی ریاست

کورنتھ اور بابل میں دیوی عشتار کے معبد میں بیٹوں پجاری رہتے تھے جنہیں کدیش کہتے تھے۔ کنعانیوں اور یونانیوں نے امرد پرستی کو دور دراز کے ممالک میں پھیلا دیا۔ یونان میں امرد پرستی باقاعدہ ایک تعلیمی اور معاشرتی ادارہ بن گئی۔ یونانیوں اور جاپانیو کا خیال تھا کہ امرد پرست شجاع اور دلیر ہوتے ہیں۔ تھیبس کی ریاست کے دستہ مقدس میں صرف عشاق کو بھرتی کیا جاتا تھا۔ میدان جنگ میں یہ لوگ ایک دوسرے پر پروانہ وار اپنی جانیں نثار کر دیتے تھے۔ عورتوں کی ہم جنسی محبت کی سب سے بڑی ترجمان جزیرہ لزباس کی شاعرہ سیفو تھی جو اپنی شاگرد لڑکیوں سے والہانہ پیار کرتی تھی اور ان سے پرجوش نظموں میں محبت کا اظہار کرتی تھی۔ اسی رعایت سے عورتوں کی ہم جنسی محبت کو لزبانی عشق کہا جاتا ہے۔ ایران میں امرد پرستی وبائی صورت اختیار کر گئی۔ فارسی کے شاعر امردوں سے بے محابا عشق کا اظہار کرتے تھے۔ فارسی غزل کا روایتی محبوب امرد ہی ہے۔ یورپ میں جرمن اور بلغاریہ والے امرد پرستی کے لئے بدنام ہیں۔ فریڈرک اعظم شاہ پرشیا ایک بدنام سدومی تھا شیکسپیر نے امردوں کے حسن و جمال کے گیت اپنے سانیٹوں میں گائے ہیں آسکر وائلڈ کو سدومیت کے الزام میں قید کی سزا ہوئی تھی۔ آج بھی یورپ اور امریکہ میں سدومیوں کی باقاعدہ تنظیمیں موجود ہیں، ان کے اپنے علٰحدہ کلب ہیں جہاں اغیار کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ قحبہ خانوں میں ہم جنسی رجحان رکھنے والوں کی تسکین کا سامان وافر موجود ہے۔ کارل ہرش فیلڈ نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ بعض لوگ جبلّی طور پر ہم جنس ہوتے ہیں اس لئے اُن کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرنا ضروری ہے چنانچہ اطالیہ، فرانس اور برطانیہ میں ہم جنسی معاشقے کو قانوناً روا کر دیا گیا ہے۔

ہولی

روایت ہے کہ ہولیکا ایک راکھشنی تھی جسے شیو نے قتل کر دیا تھا۔ ہولی کا تہوار اسی واقعے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار پر خوب خوب کھل کھیلتے ہیں، ایک دوسرے پر گلال پھینکتے ہیں اور فحش گیت گاتے ہیں۔

ہوم

آریا کھلے میدان میں آگ جلا کر وید کے منتر پڑھتے تھے اور آگ میں گھی وغیرہ ڈالتے جاتے تھے۔ اسی رسم کو ہوم کہتے ہیں۔

ہیکل

ہیکل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے "بڑا گھر"۔ یہودیوں کے یہاں معبد کے معنوں میں استعمال کرنے لگے۔ مثلاً ہیکل سلیمانی۔

ی

یانگ ین

چینی فلسفے میں جس کی ترویج ۱۰۰۰ ق م میں ہوئی کائنات کو دو قوتوں پر مشتمل سمجھا جاتا تھا (۱)۔ یانگ (۲)۔ ین۔ یانگ روشن، مثبت، سفید، گرم، متحرک، سخت اور مذکر ہے۔ ین منفی، مونث، سیاہ، نرم، خنک اور جامد ہے۔ ان دونوں کو ایک دائرے میں دکھاتے تھے جس میں سفیدی اور سیاہی ایک دوسرے میں نفوذ کئے ہوئے تھی۔ اِس فلسفے کی رُو سے دُنیا کی ہر شئے اِن کے ملاپ سے صُورت پذیر ہوتی ہے۔ تاؤ یا آفاقی قوت نے اِن متضاد قوتوں میں اِتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی ہے۔

یغما

تاتاریوں اور ترکوں میں دستور تھا کہ کسی خاص تقریب پر لمبا چوڑا دسترخوان بچھاتے تھے اور اُس پر طرح طرح کے میوے، پھل اور کھانے چُن دیتے تھے۔ پھر ایک ہی دفعہ سب لوگ دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے اور جو چیز جس کے ہاتھ آتی وہ اُسے لے بھاگتا تھا۔ اِسے خوانِ یغما کہتے تھے۔

یَم

ہندو دیومالا کا دیوتا جو موت کے بعد آدمی کی نیکیاں اور بدیاں تولتا ہے۔ وِوَسوت (سورج) اور سرنیا کا بیٹا ہے، بھینسے پر سواری کرتا ہے، رنگ سبز، پوشاک سُرخ، ایک ہاتھ میں بھالا، دوسرے میں پھانسی کی رسّی، یَم پور میں رہتا ہے۔ اِس کے ملازموں کو یَم دوت کہتے ہیں۔ یمی کا توام بھائی ہے۔ ایک روایت کے مطابق یَم اور یمی ہی سے انسان کی نسل چلی تھی۔ یَم کے پاس دو چار چشم کُتے ہیں جو اُس کے مسکن کی حفاظت کرتے ہیں۔ یَم کے دوسرے نام ہیں: دھرم راج، پتری پتی (باپوں کا باپ)، کال (زمانہ)، ڈنڈ دھر (ڈنڈے والا)، انتک (عمر کا خاتمہ کرنے والا) اوستا میں اسے جمیہ کہا گیا ہے۔ فارسی کا جم یا جمشید۔

یوگا

ہندوستان میں جسمانی اور ذہنی تربیت کا طریقہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یوگا سے انسان عام ذہنی سطح سے بلند تر ہو کر ماوراء الذہن حقائق کو پا لیتا ہے۔ اس کی تین قسمیں مشہور ہیں (۱) راجہ یوگا (۲) ہتھا یوگا (۳) بھگتی یوگا، جو بالترتیب قوتِ ارادی، ہمت اور محبت پر زور دیتے ہیں۔ آج کل بہت سے مکّار امریکہ اور یورپ میں یوگا کا چکّر چلا کر لاکھوں روپے بٹور رہے ہیں۔

یہواہ

یہودیوں کا خداوند خدا۔ لفظ یہواہ کا معنیٰ ہے "وہ ہے جو ہے" عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکل بھاگے تو یہواہ راتوں کو شعلے کی صورت میں اور دن کو دھویں کا ستون بن کر ان کی راہنمائی کرتا تھا۔ کوہِ سینا پر یہواہ نے جناب موسیٰ کو الواحِ شریعت دی تھیں۔

یوروپا

فنیقیہ کے بادشاہ فونقس کی بیٹی کا نام یوروپا تھا جسے زیوس دیوتا نے اغوا کر لیا۔ یورپ کا نام اسی شہزادی کے نام پر رکھا گیا تھا۔